زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات
چلمن نشین
مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات

زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات

راوی...... مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

تحریر...... حسام بٹ

اسٹاکسٹ:۔

مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ

اردو بازار، لاہور۔۲۔ فون:7668958

E.mail: al_quraish@hotmail.com

فہرست

مجرم ذہن

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے اپنی فائلز پر ہاتھ مارتے ہوئے تیز احتجاج لہجے میں کہا۔ ''وکیل استغاثہ نے میرے موکل کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں، میں ان پر سخت معترض ہوں۔''

وکیل استغاثہ نے میری اس مداخلت پر برا سا منہ بنایا۔ جج نے اپنی ناک پر رکھے چشمے کے اوپر سے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میرے موکل کے لئے ''خطرناک مجرم'' ایسے الفاظ کسی بھی طور پر جائز نہیں ہیں۔ اس پر عائد کردہ جرم جب تک ثابت نہیں ہو جاتا، وہ ملزم ہے نہ کہ مجرم! خطرناک مجرم ہونا تو بعد کی بات ہے۔''

''اعتراض درست ہے۔'' جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! اپنے بیان میں سے خطرناک مجرم کے الفاظ حذف کر کے آپ اپنے دلائل کا سلسلہ جاری رکھیں۔''

جج کی ہدایات کو نظر انداز کرنا وکیل استغاثہ کے بس میں نہیں تھا لہٰذا وہ مجھے گھور کر رہ گیا۔ پھر اس نے ملزم کی ضمانت کرانے کے سلسلے میں ایک نئے زاویے سے زور مارنا شروع کیا۔

''جناب عالی! ملزم کو موقع واردات سے گرفتار کیا گیا ہے۔ واقعات و شواہد اسے قاتل قرار دینے میں معاون ہیں۔ اس کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔ میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں، ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے کیس کی سماعت کو آگے بڑھایا جائے۔''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اس کیس کو عدالت میں لگ بھگ چار ماہ کا عرصہ بیت چکا ہے اور ابھی تک کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔ آج سے میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ مجھ سے قبل جو وکیل صفائی اس کیس کو لڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، ان کی چھٹی کر دی گئی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ مذکورہ وکیل ایک بھاری رقم وصول کر کے مخالف پارٹی سے جا ملا تھا اس لئے گزشتہ چار ماہ میں سوائے تاریخیں لینے کے اور کوئی عدالتی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ لہٰذا......''

میں بات ادھوری چھوڑ کر ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! میرا موکل ایک غریب آدمی ہے۔ گزشتہ چار ماہ سے وہ رزق روزگار کا نہیں رہا۔ اس کی نیک نامی کو جو بٹا لگا ہے اور لگ رہا ہے وہ الگ ہے۔ میں معزز عدالت سے

گزارش کرتا ہوں، میرے موکل کی ضمانت منظور کی جائے۔ وقت آنے پر میں ثابت کر دوں گا یہ بے چارہ بے گناہ ہے۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت قتل کے کیس میں الجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔"

قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ناممکن سی بات سمجھی جاتی ہے۔ میں نے آج ہی اس کیس میں ہاتھ ڈالا تھا لہٰذا کیس فائل مطالعہ کرنے کا بھی مجھے موقع نہیں مل سکا تھا۔ جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے استغاثہ کی رپورٹ کے صفحات بھی الٹ پلٹ کر دیکھے پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بیگ صاحب! گزشتہ چار ماہ سے اگر کوئی قابل ذکر عدالتی کارروائی نہیں ہوئی تو اس میں استغاثہ سے زیادہ ڈیفنس قصور وار ہے۔ تین مرتبہ اس کیس کی تاریخ آگے بڑھائی گئی ہے اور ہر بار ڈیفنس کی طرف سے کوئی تاخیری سبب سامنے آیا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"جناب عالی! میں اس زاویے پر روشنی ڈال چکا ہوں۔ جب راہ نما، راہ زن بن جائیں اور اپنے، اغیار سے دوستی گانٹھ لیں تو نتائج کچھ اسی قسم کے برآمد ہوتے ہیں۔ وکیل صفائی کا ذکر میں تھوڑی دیر پہلے کر چکا ہوں۔"

جج نے تفہیمی انداز میں گردن ہلائی اور دوٹوک لہجے میں کہا۔"وکیل صاحب! آپ کے موکل کے خلاف جو استغاثہ دائر کیا گیا ہے، اس میں خاصی جان ہے۔ میں اس کے پوائنٹس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ عدالت ملزم کی ضمانت منظور نہیں کر سکتی البتہ......"

جج نے جملہ ادھورا چھوڑ کر باری باری مجھے اور وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر میری طرف روئے سخن کرتے ہوئے بولا۔"میں اس کیس کی فاسٹ پروسیڈنگ کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تاریخیں دوں گا۔ آپ بھی کیس فائل کا اچھی طرح مطالعہ کر لیں اور اس کیس کو آگے بڑھانے میں معزز عدالت سے بھرپور تعاون کریں۔"

جج کا فیصلہ میرے لئے ناقابل قبول نہیں تھا۔ میں اپنے موکل کی ضمانت کی زیادہ توقع نہیں کر رہا تھا۔ اگر یہ کیس چند روز قبل میرے ہاتھ لگ جاتا تو صورت حالات مختلف ہوتی۔ میں اپنے موکل کی ضمانت کے لئے کوئی راہ نکال ہی لیتا۔ یہ بات میں نے اپنے کلائنٹ پر واضح کر دی تھی۔ بہرحال وہ بوڑھی عورت اسی میں خوش تھی کہ میں اس کے بیٹے کا کیس لینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ مذکورہ کیس آج صبح ساڑھے آٹھ بجے میرے سپرد کیا گیا اور دس بجے عدالتی کارروائی کا آغاز ہو گیا تھا۔

دونوں وکلا کی رضامندی ملتے ہی جج نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔"دی کورٹ از ایڈجارنڈ!"

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کیس کا پس منظر آپ پر واضح کرتا چلوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی اُلجھن کا شکار نہ ہو۔ اس میں سے بیش تر باتیں مجھے کیس فائل کے مطالعے سے معلوم ہوئیں اور دیگر بہت سی باتیں اور اہم نکات میں نے اپنی محنت اور تگ و دو سے حاصل کئے ہیں۔ میرے موکل کی کہانی دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی عبرتناک بھی ہے اور بہت سے لوگوں کے لئے اس میں مفید سبق بھی پوشیدہ ہے، اگر انسان غور و فکر کرے تو ورنہ......!

❂❂❂

میرا موکل خلیل ایک عمر رسیدہ بیوہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اس معاشرے کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی گزر بسر ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی کہ بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت نے ان کا دروازہ دیکھ لیا۔ اس میں خلیل کی بدقسمتی سے زیادہ اس کی حماقت کا ہاتھ تھا۔ وہ ایک انجانی مصیبت کو دعوت دے بیٹھا تھا اور اس مصیبت کا نام تھا...... قاضی قیوم!

قاضی قیوم ایک بے پناہ شاطر اور موقع شناس شخص کا نام تھا۔ ممتاز منزل کے قریب ایک عمارت میں اس نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔ درحقیقت وہ ایک فلیٹ تھا جسے دفتر کی شکل دے دی گئی تھی۔ حسن اسکوائر سے نیپا چورنگی تک روڈ کی ایک جانب واقع بیش تر عمارتوں میں مختلف نوعیت کے دفاتر کھلے ہوئے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ علاقہ کمرشل بھی ہے اور رہائشی بھی۔ اس قسم کے تضادی علاقوں میں جرم بہ آسانی پنپ جاتا ہے۔

قاضی قیوم نے "قاضی ٹریڈنگ کمپنی" کے نام سے ایک چھوٹی سی فرم قائم کر رکھی تھی۔ اس فرم کے تحت سرانجام پانے والے کاموں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ بہ یک وقت امپورٹر بھی تھا اور ایکسپورٹر بھی، مینوفیکچرر بھی تھا اور سپلائر بھی۔ کسی وقت وہ ریکروٹنگ ایجنٹ بن جاتا۔ الغرض اپنے پاس آنے والے کسی بھی شخص کو وہ مایوس ہو کر واپس جانے کا موقع نہ دیتا۔ درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں تھا، محض ایک فراڈ تھا...... اور بلا کا چرب زبان اداکار۔ وہ اپنی پرفارمنس سے چٹکی بجاتے میں سامنے والے کو متاثر کر لیتا۔ گویا اپنے جال میں پھانس لیتا۔ قاضی قیوم نے دیگر دھندوں کے ساتھ ہی آف دی ریکارڈ انویسٹ منٹ کا کام بھی شروع کر رکھا تھا اور بھاری شرح منافع کا خواب دکھا کر وہ لوگوں سے بڑی بڑی رقوم اینٹھ لیتا۔

وہ بہت سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر شکار کرتا۔ اس کا نشانہ بننے والوں میں زیادہ تعداد عمر رسیدہ افراد کی ہوتی جن میں بیوائیں، ریٹائرڈ افراد اور ایسے لوگ جنہیں کاروبار کا کوئی تجربہ نہ ہو۔ ایسے لوگ اپنی جمع پونجی کو کسی بینک میں رکھوانے یا سیونگ سرٹیفکیٹ میں لگانے کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ کسی قسم کی دردسری مول لئے بغیر انہیں ایک معقول رقم بہ طور منافع ہر ماہ ملتی رہے۔ قاضی انسانی نفسیات کا بھی ماہر تھا۔ ہر انسان کی یہ کوشش ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے۔ اس وقت نیشنل سیونگ سینٹرز اور دیگر بینک ایک سے ڈیڑھ فی صد تک ماہانہ منافع دیتے تھے، یعنی ایک

لاکھ کی رقم پر ایک ہزار سے پندرہ سو تک۔ میں نے یہ اندازہ بتایا ہے، اس میں تھوڑی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

قاضی اپنے یہاں انویسٹ منٹ پر جو شرح منافع دے رہا تھا، اس میں اور بینک میں واقعتاً زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ دس فی صد تک منافع دے رہا تھا، یعنی ایک لاکھ روپے پر ماہانہ منافع دس ہزار روپے۔ دولت میں بڑی کشش ہوتی ہے اور گھر آتی دولت کسی کو بری نہیں لگتی لہٰذا وہ لوگ جن کے پاس کچھ رقم موجود تھی اور وہ بزنس کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، وہ زیادہ منافع کے لالچ میں قاضی قیوم کے چنگل میں جا پھنستے۔ وہ ایک دو ماہ تک انہیں باقاعدگی سے منافع دیتا پھر ٹائیں ٹائیں فش!

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے، میرے موکل خلیل کی والدہ ایک بیوہ تھی۔ شوہر کی وفات پر محکمے کی طرف سے اسے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ انیسہ بیگم کا شوہر عقیل احمد کسی سرکاری محکمے میں ایک اچھی پوسٹ پر تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پاپوش نگر میں اسی گز کا ایک مکان بنا لیا تھا۔ اس کا انتقال ریٹائرمنٹ سے چند روز پہلے ہوا لہٰذا اس کی پنشن میں کوئی اڑچن نہ آئی۔ ایک مروجہ عمل سے گزرنے کے بعد انیسہ بیگم کو مبلغ اٹھارہ سو روپے ماہانہ پنشن ملنے لگی۔ اس موقع پر انیسہ بیگم نے عقل مندی کا ایک فیصلہ کیا۔ عقیل احمد نے اپنی زندگی میں جو مکان بنوایا تھا اس پر ہاؤس بلڈنگ کا کچھ قرضہ واجب الادا تھا۔ انیسہ نے یک مشت وہ رقم ادا کر کے مکان پر ”کامل قبضہ“ حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ قریبی لوگوں کے چھوٹے موٹے قرضے تھے۔ سب کو دے دلا کر فارغ کرنے کے بعد اس کے پاس تقریباً تین لاکھ روپے بچ گئے۔

اس موقع پر لوگ اسے مختلف راہیں سجھانے لگے۔ کسی نے کہا پرائز بونڈ خرید لو۔ کسی کا مشورہ تھا بینک میں رکھوا دو۔ کوئی سیونگ سرٹیفکیٹس کے حق میں تھا اور کسی کا خیال تھا، کسی چلتے ہوئے بزنس میں رقم لگا دی جائے۔ اس رقم کے ایک امیدوار انیسہ کے بھائی اور خلیل کے ماموں جمیل اختر بھی تھے۔

جمیل اختر نے کورنگی میں ایک چھوٹی سی فیکٹری لگا رکھی تھی جہاں لیدر جیکٹس تیار کی جاتی تھیں۔ جمیل کا خیال تھا کہ اگر بہن تین لاکھ کی رقم کچھ عرصے کے لئے اسے دے دے تو وہ بہ آسانی اپنے کاروبار کو وسعت دے سکتا ہے۔ سرمائے کی کمی کے سبب وہ ایک تنگ دائرے میں چل رہا تھا۔ جمیل اس رقم پر معقول منافع دینے کو بھی تیار تھا۔ لیکن انیسہ پیسے کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ اس نے دیگر افراد کی طرح بھائی کو بھی بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا اور تین لاکھ کی اس رقم کی محفوظ سرمایہ کاری کے بارے میں غور و خوض کرنے لگی۔

انیسہ بیگم کو فوری طور پر کسی منافع کا لالچ یا ضرورت نہیں تھی۔ پنشن کے ذیل میں اٹھارہ سو کی رقم ہر ماہ اسے مل جاتی تھی۔ اس کے علاوہ خلیل کو اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ وہ بزنس روڈ پر واقع ایک

چھوٹے سے پرنٹنگ پریس میں کام کرتا تھا اور لگ بھگ دو ہزار روپے ماہوار کما لیتا تھا۔ دونوں ماں بیٹے کے اچھے گزارے کے لئے اڑتیس سو روپے بہت کافی تھے۔ کراچی جیسے شہر میں اگر انسان کے پاس ذاتی رہائش ہو تو اس کے پچاس فی صد اخراجات کم ہو جاتے ہیں!

خلیل نے انٹرمیڈیٹ کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھ دیا تھا اور پرنٹنگ لائن کے ایک خاص شعبے ”پلیٹ میکنگ“ میں اسے اچھی خاصی مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنی مہارت اور محنت پر بھروسا رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اسے کچھ رقم مل جائے تو وہ کوئی دُکان کرائے پر لے کر اپنا کاروبار بھی شروع کر سکتا ہے۔ رقم کے سلسلے میں جب اس نے اپنی ماں سے بات کی تو انیسہ بیگم نے کہا۔

”خلیل! تم ابھی چھوٹے اور ناتجربہ کار ہو۔ میں اتنی بڑی رقم تمہارے ہاتھ میں نہیں دے سکتی۔“

خلیل نے کہا۔ ”میں ساری رقم تھوڑی مانگ رہا ہوں۔ میرا کام تو صرف پچاس ہزار ہی سے چل جائے گا۔ اس رقم میں بھی میں بہت اچھی دکان بنا کر دوڑنے لگوں گا۔“

”تم جانتے ہو خلیل!“ انیسہ بیگم نے یاددہانی کے انداز میں کہا۔ ”تم نے اس موضوع پر کئی مرتبہ اپنے باپ سے بات کی تھی اور انہوں نے ہر بار انکار کر دیا۔“

”میں ان کے انکار کی وجہ جانتا ہوں۔“ خلیل نے کہا۔ ”ایک تو ان کے ہاتھ میں یک مشت اتنی رقم تھی نہیں دوسرے وہ مجھے نادان بچہ سمجھتے تھے۔ لیکن اب حالات مختلف ہیں۔ آپ کے ساتھ رقم کی عدم دستیابی والا کوئی مسئلہ نہیں...... اور میں کوئی بچہ بھی نہیں رہا۔ اس وقت میں پورے پچیس سال کا ہوں۔“

انیسہ بیگم نے ایسی نظر سے خلیل کو دیکھا جیسے کوئی ماں اپنے ننھے منے بچے کو پیار سے دیکھتی ہے پھر دھیرے سے بولی۔ ”میرے لئے تم اب بھی بچے ہو۔ خیر میں اس سلسلے میں سوچوں گی۔“

اولاد چاہے پچاس سال کی کیوں نہ ہو جائے وہ والدین کی نگاہ میں بچہ ہی رہتی ہے۔ انیسہ بیگم کا آخری جملہ امید افزا تھا اس لئے خلیل نے کہا۔

”امی! ملازمت اور ذاتی کاروبار کا فرق آپ بھی خوب سمجھتی ہیں۔ میں اس پرنٹنگ پریس پر بارہ گھنٹے کام کرتا ہوں پھر کہیں جا کر دو ہزار ملتے ہیں۔ جب میرے ہاتھ میں ایک ہنر ہے تو میں کیوں نہ قسمت آزما کر دیکھوں؟“

انیسہ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”انسان اسی خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ قسمت کو آزماتا ہے جبکہ حقیقت اس کے بالعکس ہے۔ ہمیشہ قسمت انسان کو آزماتی ہے کیونکہ قسمت ایک مستقل کی حیثیت رکھتی ہے اور انسان ہر لمحے تغیر پذیر۔ بہرحال یہ سمجھ کا الٹ پھیر ہے!“ وہ ایک ساعت کو خاموش ہوئی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری اس بات سے بھی اتفاق نہیں کرتی کہ ملازمت میں زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔

میرے خیال میں تو ذاتی کاروبار میں زیادہ محنت، زیادہ فکر اور زیادہ دردسر ہے۔“

”اور زیادہ منافع بھی تو ہے۔“ خلیل نے تیز لہجے میں کہا۔

”بے شک ہے۔ میں نے اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ مجھے پچاس ہزار دینے کو تیار ہیں؟“

”میں نے کہا نا اس سلسلے میں سوچوں گی۔“

”صاف کیوں نہیں کہتیں کہ رقم دینا ہی نہیں چاہتیں۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

انیسہ بیگم نے ناراض نظر سے بیٹے کو دیکھا اور شکایت بھرے لہجے میں بولی۔ ”تم میری نیت پر شک کر رہے ہو خلیل؟“

”ایسی بات نہیں ہے امی!“ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

”پھر کیسی بات ہے؟“ وہ خفگی سے بولی پھر قدرے معتدل انداز میں کہا۔ ”دیکھو بیٹا! تمہارا باپ جو کچھ چھوڑ کر گیا ہے وہ سب تمہارا ہی ہے۔ میں کتنے دن کی ہوں!“

انیسہ بیگم نے آخری جملہ بڑے جذباتی انداز میں ادا کیا تھا اور اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ خلیل نے قدرے ندامت آمیز انداز میں ماں کو دیکھا تو وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”میں یہ مکان اور دولت اپنے ساتھ لے کر تو نہیں جاؤں گی نا۔ تم چند دن صبر کر لو۔ مجھے سوچنے دو۔ میں تمہاری خواہش پوری کرنے کی کوشش کروں گی۔“

ماں کی حالت کے پیش نظر خلیل نے خاموشی اختیار کر لی۔

خلیل روزانہ ایک مخصوص وقت پر گھر سے نکلتا اور سیدھا پرنٹنگ پریس پہنچ جاتا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ گھر سے روزگار کے ٹھکانے تک اسے سیدھی ایک بس مل جاتی۔ ٹو۔ کے اس کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی ورنہ کراچی میں بسنے والے اکثر افراد کو دو بسیں بدل کر اپنی ملازمت تک پہنچنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی آمد و شد کے لئے ٹو۔ کے پر پوری طرح اعتماد کر رہا تھا۔

ٹو۔ کے ہی کے توسط سے اس کی ملاقات شکیل سے بھی ہوگئی۔ شکیل ایک مناسب القد اور دبلا پتلا شخص تھا۔ عمر تیس کے قریب ہوگی۔ وہ پٹرول پمپ کے اسٹاپ سے بیٹھتا اور ریگل پر اتر جاتا۔ وہ صدر کی الیکٹرونک مارکیٹ میں کسی ٹی وی کی دکان پر سیلز مین تھا۔ اکثر و بیشتر مذکورہ بس میں اُس سے سلام دعا ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ ان دونوں میں اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ ایک روز شکیل نے خلیل کو بتایا۔

”بس دوست! ایک سال کی بات ہے۔ اس کے بعد اس ملازمت سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ جائے گی۔“

”کیا تم سعودیہ جانے والے ہو؟“ خلیل نے پوچھا۔

اُس زمانے میں مڈل ایسٹ خصوصاً سعودی عرب کی طرف جانے کا رجحان بہت عام تھا۔

مزدور پیشہ اکثر افراد قسمت آزمائی کے لئے ادھر کا رخ کرتے جن میں سے کچھ کامیاب بھی ہو جاتے ورنہ ایک بڑی تعداد اپنا ہزاروں کا نقصان کر کے واپس آ جاتی۔ متاثرین میں دونوں طرح کے افراد ہوتے تھے۔ اپنے کسی مسلمان پاکستانی ریکروٹنگ ایجنٹ بھائی سے دھوکا کھائے ہوئے یا پھر کسی مسلمان عرب شیخ کے دست ستم سے نجات پا کر واپس آئے ہوئے۔ ان حالات میں وہ لوگ واقعی خوش قسمت تھے جو وہاں پہنچ کر سیٹ ہو گئے تھے۔

شکیل نے خلیل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ”دوست! میں تو پاکستان کو ہی سعودیہ بنا دوں گا۔ ایک لاکھ میں...... صرف ایک سال میں جمع کر لوں گا۔ اس کے بعد میں اپنی دکان کھول لوں گا۔ پھر دوسروں کی سیلز مینی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں جانتا ہوں تعلقات کی بنیاد پر بہت سا مال ادائیگی کئے بغیر بھی مل جاتا ہے...... اور تمہارے اس بھائی کے بہت دور تک تعلقات ہیں۔“ اس نے اپنا سینہ ٹھونکا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اصل مسئلہ مارکیٹ میں موقع کی دکان حاصل کرنے کا ہے۔ ایک لاکھ روپے میرے ہاتھ میں آ جائیں تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔“

خلیل کو اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ وہ خود بھی کم و بیش اسی قسم کی صورتِ حال سے گزر رہا تھا۔ اگر اس کو کہیں سے پچاس ہزار روپے مل جاتے تو وہ اپنی چھوٹی موٹی دکان کھول سکتا تھا۔ پرنٹنگ پریس نہیں بھی لگاتا تو پلیٹ میکنگ ہی کا کام اسے مارکیٹ سے اتنا زیادہ مل جاتا کہ سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی۔

”یار! یہ تو بتاؤ، تم ایک لاکھ روپیہ کس طرح جمع کر رہے ہو؟“ خلیل نے پوچھا۔

وہ رازداری سے بولا۔ ”میں خود تھوڑا ہی جمع کر رہا ہوں۔ ابا کو پھنسایا ہے میں نے ایک چکر میں!“

”کس چکر میں؟“ خلیل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

شکیل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے مشورے پر ابا نے ایک انویسٹ منٹ کمپنی میں دو لاکھ روپے لگائے ہیں۔ یہ کمپنی بہت بھاری منافع دے رہی ہے۔ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے!“

اتنا کہہ کر شکیل خاموش ہوا اور فخریہ انداز میں خلیل کو دیکھنے لگا۔ جب خلیل نے کچھ بول کر نہیں دیا تو وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میں نے جس کمپنی کا ذکر کیا ہے، وہ دس فیصد منافع دے رہی ہے یعنی ایک لاکھ کی رقم پر دس ہزار روپے اور دو لاکھ پر بیس ہزار روپے۔“

”یہ منافع ماہانہ ہے یا سالانہ؟“ خلیل نے استفسار کیا۔

”ارے بھائی ماہانہ!“ وہ قدرے جوش میں بولا۔

”یقین نہیں آ رہا!“ بے ساختہ خلیل کی زبان سے نکلا۔ انداز بڑبڑانے والا تھا۔

شکیل نے وضاحتی لہجے میں کہا۔ "پہلے مجھے بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن تجربہ کسی یقین کا محتاج نہیں ہوتا۔ ایک ماہ بعد جب میں نے دو لاکھ پر بیس ہزار روپے منافع اٹھایا تو یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ پھر اتنی ہی رقم مجھے مل جائے گی۔"

"اس طرح تو تم پانچ ماہ ہی میں ایک لاکھ روپے جمع کرلو گے!"

"بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن میں نے جو چکر چلا رکھا ہے اس کی رو سے مجھے مذکورہ رقم اکٹھا کرنے میں دس ماہ لگیں گے۔" اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔

خلیل الجھ کر رہ گیا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ابا کو پانچ فی صد ماہانہ منافع کا بتایا ہوا ہے۔" شکیل اپنی اسکیم کے خفیہ گوشے وا کرتے ہوئے بولا۔ "یعنی دو لاکھ کی رقم پر ماہانہ دس ہزار روپے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ مجھے جو بیس ہزار کا منافع ملتا ہے اس میں سے دس ہزار میں ابا کو تھما دیتا ہوں اور باقی دس ہزار میں اپنے پاس جمع کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ! زیادہ سے زیادہ ایک سال میں، میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ اپنی دکان کھول سکوں۔ ویسے ایک بات ہے۔" وہ بات کرتے کرتے رکا۔ ایک لمحے کو توقف کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

"میں نے تہیہ کر رکھا ہے، جیسے ہی میں اپنا ٹارگٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، میں ابا کو حقیقت حال سے آگاہ کر دوں گا۔ اگرچہ وہ پانچ فی صد ماہانہ منافع پر بھی بہت خوش ہے۔ یہ بہت بڑی شرح منافع ہے۔"

خلیل نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ سرکاری بینک اور سیونگ سرٹیفکیٹس والے تو رہے ایک طرف، پرائیویٹ سیکٹر میں بھی دو ڈھائی فی صد ماہانہ سے زیادہ منافع نہیں مل رہا۔ تم نے جس انویسٹ منٹ کمپنی کا ذکر کیا ہے، وہ واقعی بہت حیرت انگیز ہے۔ کیا نام بتایا ہے تم نے اس کمپنی کا؟"

"نام ابھی میں نے کہاں بتایا ہے۔" شکیل نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا پھر بولا۔ "تمہاری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں تمہیں اس کمپنی کا نام بتا ہی دینا چاہئے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "قاضی انویسٹرز" کی بات کر رہا ہوں۔"

آئندہ دس منٹ میں وہ خلیل کو قاضی قیوم کی انویسٹ منٹ کمپنی کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر چکا تھا۔ "قاضی انویسٹرز" کے بارے میں جان کر خلیل خاصا اطمینان محسوس کرنے لگا۔ اس کا ذہن بڑی تیز رفتاری سے ایک بھاری انویسٹ منٹ سے متعلق سوچنے لگا۔ اس کی والدہ کے پاس تین لاکھ کی رقم موجود تھی۔ اگر وہ دو ماہ کی انویسٹ منٹ پر بھی تیار ہو جاتی تو ساٹھ ہزار کا منافع حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ماں سے کوئی غلط بیانی نہیں کرے گا۔ شرح منافع کی رقم میں کوئی گڑبڑ کئے بغیر اسے تین لاکھ کی محدود مدت انویسٹ منٹ کے لئے

راضی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے کرید کرید کر شکیل سے تمام باتیں معلوم کر لیں، آخر میں کہا۔ یہ کانٹا کافی دیر سے اس کے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

"یار! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی؟"

"کون سی بات دوست؟" شکیل نے استفساریہ نظر سے اسے دیکھا۔

خلیل نے کہا۔ "جب تمہارے باپ کے پاس دو لاکھ روپے موجود تھے تو اس نے کاروبار شروع کرنے کے لئے تمہیں ایک لاکھ کیوں نہیں دے دیئے؟"

"دوست! بات دراصل یہ ہے کہ ابا مجھ پر بھروسا نہیں کرتا۔" شکیل نے بتایا۔ "گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہا تھا اس لئے میں نے یہ چال چلی ہے۔ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے، نقصان کسی کا نہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔" شکیل سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "رقم کے معاملے میں والدین اپنی اولاد پر کم ہی اعتماد کرتے ہیں۔ میری ماں بھی مجھے بچہ ہی سمجھتی ہے۔ اس کے پاس تین لاکھ رکھے ہیں لیکن پچاس ہزار مجھے دینے کو تیار نہیں۔ اگر میرے ہاتھ میں پچاس ہزار کی رقم آجائے تو میں بھی اپنا کام شروع کر سکتا ہوں۔"

"مجھ سے سبق سیکھو دوست!" شکیل نے کہا۔ "وہی کرو جو میں نے کیا ہے۔ تمہارا مسئلہ تو صرف دو ماہ میں حل ہو جائے گا۔ اگر قاضی صاحب کے پاس جانے کا ارادہ ہو تو مجھے بتانا۔ میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایک دو دن بعد تمہیں بتاؤں گا۔" خلیل نے ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "پہلے میں اپنی ماں سے بات کر لوں۔"

اس روز خلیل کا کام میں دل نہیں لگا۔ رہ رہ کر "قاضی انویسٹرز" اس کے ذہن میں گھوم جاتا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کوئی کمپنی اتنا زیادہ منافع بھی دیتی ہوگی۔ اگر شکیل کا کہا ہوا سب کچھ سچ تھا تو پھر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا عظیم ترین حماقت ہوتی۔ اس نے تہیہ کر لیا چاہے جیسے بھی ہو، وہ اپنی ماں کو قاضی انویسٹرز میں رقم لگانے پر آمادہ کر لے گا۔

جب انسان کا ذہن کسی خاص نقطے پر مسلسل سوچنا شروع کرتا ہے تو کئی نکتے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ایک مسئلے کے متعدد حل روشن ہو جاتے ہیں۔ غور و فکر کی اسی لئے تاکید کی گئی ہے کہ اس کے نتیجے میں اُلجھن، سلجھن میں بدل جاتی ہے اور سوال جواب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

جب خلیل گھر پہنچا تو ماں کو گھیرنے کے مختلف طریقے وضع کر چکا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اپنے مقصد میں صد فی صد کامیاب رہے گا!

انیسہ بیگم تین لاکھ روپے دبائے بیٹھی تھی۔ اگر وہ خلیل کے ایما پر اس رقم کو قاضی انویسٹرز کے ہاں لگا دیتی تو ماہانہ تیس ہزار روپے منافع ملنا شروع ہو جاتا یعنی صرف دو ماہ میں ساٹھ ہزار

روپے۔ خلیل کی ضرورت پچاس ہزار سے پوری ہو جاتی۔ گویا اگر وہ ماں کو کم از کم دو ماہ کی انویسٹ منٹ کے لئے بھی تیار کر لیتا تو اس کا کام بن جاتا۔

اسی رات سونے سے قبل اس نے اپنی ماں سے بات کی۔ اس واقعے کو ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا جب خلیل نے انیسہ بیگم سے پچاس ہزار مانگے تھے اور اس نے سوچنے کا اڑنگا لگا کر وقتی طور پر بات کو ٹال دیا تھا۔

''میرے ذہن میں ایک بہت اچھا آئیڈیا آیا ہے۔'' اس نے ماں سے کہا۔ ''آپ کا ایک مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا اور میرا بھی کام نکل آئے گا۔''

''تمہیں میرے کون سے مسئلے کی فکر لگی ہوئی ہے؟'' انیسہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔

''انویسٹ منٹ!'' وہ ماں کے چہرے پر نظر ٹکاتے ہوئے بولا۔

انیسہ نے گہری نگاہ سے اسے گھورا اور بولی۔ ''تم ان تین لاکھ کو بھولو گے نہیں؟''

''امی!'' وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں، آپ سے دشمنی نہیں کر سکتا۔ آپ خواہ مخواہ میری نیت پر شک نہ کریں۔''

''خیر تم ان باتوں کو چھوڑو۔'' انیسہ بیگم جلدی سے بولی۔ ''اپنے ذہن میں آنے والے آئیڈیا کے بارے میں بتاؤ۔''

ماں کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے خلیل کا حوصلہ بڑھا۔ وہ انیسہ کو تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ''مجھے ایک صاحب کا پتہ چلا ہے۔ وہ لوگوں سے بڑی بڑی رقوم لے کر اپنے مختلف کاروبار میں لگاتے ہیں اور بہت ہی ہینڈسم منافع دیتے ہیں۔''

''بچے! انگلش کے الفاظ بول کر تم مجھے متاثر کرنے کی کوشش نہ کرو۔'' انیسہ بیگم نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ وہ صاحب کون ہیں، ان کا حدود اربعہ اور جغرافیہ کیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کس شرح سے منافع دیتے ہیں؟''

خلیل نے ماں کو قاضی قیوم اور اس کی انویسٹ منٹ کمپنی ''قاضی انویسٹرز'' کے بارے میں تفصیلاً بتایا پھر کہا۔ ''وہ دس فی صد ماہانہ منافع دیتے ہیں۔''

''ناممکن!'' انیسہ بیگم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

پچھلے کچھ عرصے سے وہ مختلف قسم کی سرمایہ کاری کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر چکی تھی۔ وہ جانتی تھی، سیونگ سینٹرز یا دوسرے بینک کتنا منافع دے رہے ہیں۔ اسی تناظر میں دس فی صد ماہانہ منافع کے ذکر نے اسے جھٹکا پہنچایا تھا۔

''امی! میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا!'' خلیل نے ناراضی سے کہا۔

''دیکھو بیٹا! میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھ رکھی ہے اور اس دنیا میں دس فی صد منافع والی بات قصے کہانی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ تم جانتے ہو تمہاری بتائی ہوئی شرح منافع کے مطابق

ہمیں تین لاکھ پر ماہانہ تیس ہزار روپے منافع ملے گا۔ یعنی تین ماہ میں نوے ہزار اور صرف دس ماہ میں پورے تین لاکھ...... گویا دس ماہ کی مدت کے بعد ہماری رقم دگنی ہو جائے گی، تین لاکھ انویسٹ منٹ اور تین لاکھ منافع کل ملا کر چھ لاکھ!'' اس نے آنکھیں پھیلائیں، چند لمحات کے لئے متوقف ہوئی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شاید تمہیں معلوم نہیں، سیونگ سینٹرز اور دیگر بینکوں میں کہیں پانچ سال کے بعد جا کر رقم دگنا ہوتی ہے!''

''یہ بات مجھے معلوم ہے۔'' خلیل نے رسانیت سے کہا۔ ''سرکاری اور پرائیویٹ بزنس میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس لئے دونوں کی شرح منافع میں بھی زمین آسمان کا تفاوت پایا جاتا ہے اور پھر......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور پھر یہ بات میں ایک تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میرے ایک دوست نے قاضی انویسٹرز میں دو لاکھ لگائے ہیں اور ماہانہ بیس ہزار روپے منافع اٹھا رہا ہے۔''

''خلیل! میرا ذہن اتنی بڑی شرح منافع کو قبول نہیں کر رہا!''

''امی! میں آپ کو یقین دلانے کے لئے صرف یہی کر سکتا ہوں کہ اپنے ساتھ قاضی قیوم کے پاس لے چلوں۔'' خلیل نے بے چارگی سے کہا۔

انیسہ بیگم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اتنا بھاری منافع دینے والا ممکن ہے کوئی فراڈ شخص ہو۔ زمانہ بہت خراب ہے بیٹا!''

''امی! آپ تو خواہ مخواہ وہم میں پڑ جاتی ہیں۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''آپ کو ہر شے میں کیڑے نظر آنے لگتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے کتنے ہی لوگوں نے آپ کو مختلف مشورے دیئے ہیں لیکن آپ نے کسی کی نہیں مانی۔ سرکاری بینک اور سیونگ سینٹرز والوں پر بھی آپ کو بھروسا نہیں۔ حتیٰ کہ اپنے سگے بھائی پر بھی اعتماد نہیں۔ اگر رقم گھر میں رکھی رکھی چوری ہو گئی تو آپ کیا کریں گی؟''

انیسہ نے بیٹے کی بات سنی تو اس کے چہرے پر تفکر ابھر آیا۔ چوری والی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ ابھی چند روز پہلے ان کے گھر کے قریب چاندنی چوک میں ایک ڈکیتی ہوئی تھی۔ ڈاکو نقدی اور زیورات کے علاوہ گھر کا سارا قیمتی سامان بھی اٹھا لے گئے تھے۔ بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ انیسہ بیگم کے گھر میں ایک تگڑی رقم موجود ہے۔ اس خیال نے انیسہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا تاہم اس نے بیٹے کے سامنے خود کو کمزور ظاہر کرنا گوارا نہ کیا اور خاصے ترش انداز میں بولی۔

''تمہیں اپنے ماموں کی حمایت لینے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے بھائی کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ جمیل اختر کے پاس ایک مرتبہ رقم پھنس گئی تو نکالنا مشکل ہو جائے گی۔ وہ اس رقم کو کاروبا

میں تو بعد میں لگائے گا، اس کی بیوی پہلے ہی آدھی رقم شاپنگ میں اُڑا دے گی۔ بہت ہی فضول خرچ عورت ہے وہ!''

خلیل نے پینترا بدلا اور ایک نئے زاویے سے ماں کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے تجویز دینے والے انداز میں کہا۔ ''آپ اتنا تو کر سکتی ہیں، دو ماہ کے لئے یہ رقم مجھے ادھار دے دیں۔ میں ساٹھ ہزار کا منافع حاصل کرنے کے بعد اصل رقم آپ کو واپس کر دوں گا بلکہ دس ہزار زیادہ ہی دوں گا۔ میرا کام تو پچاس ہزار میں چل نکلے گا۔ میری اتنی ہی ضرورت ہے۔''

فائدے کی بات سب کو اچھی لگتی ہے۔ انیسہ بیگم بھی گہری سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ تاہم بیٹے سے اس نے کہا۔ ''اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔''

اگلے روز سے خلیل نے ماں کو مائل اور قائل کرنے کے لئے ایک نیا وتیرا اپنا لیا۔ وہ ہر رات اسے شہر کے مختلف علاقوں میں ہونے والی چوری اور ڈکیتی کی وارداتوں کی خبریں سنانے لگا۔ نظریۂ ضرورت کے تحت وہ بعض فرضی قصے بھی گھڑ لیتا۔ بالآخر ایک ہفتے بعد انیسہ بیگم اسے دو ماہ کے لئے رقم دینے پر تیار ہو گئی۔

اس مرحلے پر انیسہ کے ذہن میں یہ تھا کہ اگر دو ماہ تک باقاعدہ منافع ملتا رہا اور کسی قسم کی کوئی گڑبڑ سامنے نہ آئی تو وہ طویل مدت کے لئے بھی سرمایہ کاری کر ڈالے گی۔

خلیل نے اپنے دوست شکیل سے ذکر کیا۔ شکیل اس کے لئے وقت نکالنے پر تیار ہو گیا۔ پھر ایک روز وہ دونوں قاضی انویسٹرز کے روحِ رواں قاضی قیوم کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ قاضی قیوم جس میز کے پیچھے بیٹھا تھا وہ اس کے جسمانی تناسب سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ یہ چیونٹی اور ہاتھی کا میل تھا۔ کنگ سائز گلاس ٹاپ ٹیبل کے پیچھے قاضی کسی بچے کی مانند نظر آتا تھا۔ دھان پان اور نرم ہڈی والا ہونے کے ساتھ ہی وہ قامت کے شعبے میں بھی مار کھا جاتا تھا۔ اس کا قد بہ مشکل پانچ فٹ رہا ہو گا۔

قاضی نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد شکیل نے خلیل کا تعارف کرایا اور اس کے ارادے سے قاضی کو آگاہ کیا۔

قاضی زیرِ مونچھ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یار ہم تو بیٹھے ہی اس لئے ہیں۔ اس میں مہربانی والی کون سی بات ہے۔'' پھر وہ براہِ راست خلیل سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''تم کتنی رقم لگانا چاہتے ہو؟''

''تین لاکھ ہیں اس کے پاس۔'' خلیل کے کچھ بولنے سے پہلے ہی شکیل نے بتایا۔

''یار شکیل! مجھے خلیل سے بات کرنے دو۔'' قاضی نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اس کی تسلی زیادہ ضروری ہے۔ تم تو مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں اپنے کلائنٹ کو پوری طرح مطمئن کرتا ہوں۔''

قاضی کا اسٹائل خلیل کو بہت پسند آیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا قاضی قیوم کوئی خرانٹ اور غصہ ور شخص ہو گا جس سے بات کرنا مشکل ہو جائے گی لیکن یہاں معاملہ اس کے بالعکس نکل آیا تھا۔ وہ قاضی کے دفتر میں خود کو خاصا ایزی محسوس کرنے لگا۔

آئندہ دس منٹ میں خلیل نے اپنے اطمینان کے لئے مختلف سوالات کے ذریعے ان باتوں کی تصدیق کر لی جو شرح منافع کے حوالے سے اس کے علم میں آئی تھیں۔ اس ابتدائی گفتگو کے بعد قاضی خالصتاً کاروباری امور کی طرف آ گیا۔ اس وقت وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم کتنی مدت کے لئے تین لاکھ میرے کاروبار میں لگانا چاہتے ہو؟'' اس نے خلیل سے پوچھا۔

خلیل نے جواب دیا۔ ''دو ماہ کے لئے۔''

''اوہ!'' قاضی نے تشویش آمیز نظر سے خلیل کو دیکھا اور نفی میں سر ہلانے لگا۔

''کیا ہو گیا جناب؟'' خلیل نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ تمہیں کم از کم چھ ماہ کے لئے انویسٹ منٹ کرنا ہو گی۔'' قاضی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''شاید تمہیں معلوم نہ ہو، کاروبار میں رقم ڈالنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن نکالنا اتنا ہی دشوار۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے پانی چینی ڈال کر ہلاؤ تو فوراً شربت بن جاتا ہے لیکن شربت کے اندر سے چینی کو علیحدہ کرنا ہو تو باقاعدہ کیمسٹری کے اصولوں کو اپنانا پڑتا ہے جس میں ایک خاص وقت لگتا ہے۔''

قاضی اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اسے تکنے لگے۔ خلیل کی نگاہ میں تذبذب کی آمیزش بھی تھی۔ قاضی ایک موقع شناس اور کائیاں شخص تھا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''البتہ میں نے اپنے بزنس کی ایک مخصوص رولنگ بنا رکھی ہے۔ میں جس وقت چاہوں رقم نکال سکتا ہوں تاہم اس صورت میں مجھے چند چیزوں کو متاثر کرنا پڑتا ہے جس سے میرا تھوڑا نقصان بھی ہوتا ہے...... اور یہ نقصان میں سرمایہ کار سے پورا کرتا ہوں، یعنی اپنے کلائنٹ سے۔''

قاضی بڑی مہارت اور چرب زبانی سے خلیل کو اپنے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ابھی ابھی بزنس کا جو فلسفہ بیان کیا تھا اس میں اچھا خاصا تضاد موجود تھا۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی نے اس نکتے پر غور نہیں کیا۔ یہ قاضی کی کامیابی کی دلیل تھی۔

خلیل نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ''کلائنٹ سے نقصان پورا کرنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی!''

''بھئی سیدھی اور سچی بات ہے۔'' قاضی بے تکلفی سے بولا۔ ''میں نے یہ دھندا اپنے فائدے کے لئے شروع کر رکھا ہے۔ میں بہت سے فائدے اٹھاتا ہوں تو اس میں سے اپنے کلائنٹ کو بھی

دیتا ہوں۔ اس میں مہربانی یا احسان والی کوئی بات نہیں۔" وہ تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"نقصان کی صورت میں، میں شرح منافع میں کمی کر دیتا ہوں۔ میرے پاس مختلف "ڈیلز" ہیں اور ان کی وضاحت میں کلائنٹ سے رقم پکڑنے سے پہلے ہی کر دیتا ہوں۔ بعد میں کوئی ٹنٹا، کوئی گڑبڑ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں ہر ممکن بدمزگی سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ میرا اصول ہے اس لئے میں تم پر بھی ہر بات واضح کر رہا ہوں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رکا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔"میں نے ابھی ڈیلز کا ذکر کیا ہے۔ دیکھو بھائی! تم چاہو تو کم از کم ایک ماہ کے لئے بھی رقم انویسٹ کر سکتے ہو لیکن اس صورت میں شرح منافع بہت کم ہو جائے گی۔"

پھر قاضی قیوم نے انہیں بتایا کہ ایک ماہ کی انویسٹ منٹ پر منافع دو فی صد ماہانہ ہوگا، تین ماہ کی مدت پر پانچ فی صد اور چھ ماہ کی سرمایہ کاری پر شرح منافع دس فی صد ہوگی۔ یہ تفصیل سننے کے بعد خلیل نے کہا۔

"دو ماہ کی انویسٹ منٹ پر پانچ فیصد منافع کا مطلب تو یہ ہوا کہ میرے متوقع منافع میں سو فی صد کمی واقع ہو جائے گی۔ میرے پاس دو ماہ بعد جو ساٹھ ہزار آ رہے تھے، انہیں حاصل کرنے کے لئے مجھے چار ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔"

"تم نے شاید میری بات کو غور سے نہیں سنا۔" قاضی قیوم نے رسانیت سے کہا۔"پانچ فی صد منافع میں نے تین ماہ کی انویسٹ منٹ پر بتایا ہے۔ دو ماہ کی انویسٹ منٹ پر دو فی صد منافع ہی ملے گا۔ ایک سے تین ماہ تک کی انویسٹ منٹ پر یہی شرح منافع ہوگی۔"

"یہ تو سراسر گھاٹے کا سودا ہوگا!" خلیل نے تیز لہجے میں کہا۔

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں، کم از کم چھ ماہ کے لئے رقم لگاؤ۔" قاضی نے مشورتاً کہا۔

خلیل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بالآخر وہ اس فیصلے پر پہنچا کہ قاضی کی بات مان لے۔ دو ماہ بعد وہ اپنی ماں سے کوئی بہانہ کر لے گا۔ ویسے بھی جب وہ دو ماہ بعد دس ہزار کی رقم ماں کی ہتھیلی پر رکھے گا تو وہ مزید چار ماہ کی انویسٹ منٹ پر تیار ہو جائے گی کیونکہ باقی چار ماہ میں ہر مہینے اسے تیس ہزار روپے کا منافع ملتا۔ پہلے دو ماہ میں ملنے والے منافع میں سے پچاس ہزار اسے اپنے پاس رکھنا تھے تاکہ ایک دکان کھول کر کاروبار شروع کر سکے۔

اس بھروسے کے ساتھ کہ وہ اپنی ماں کو راضی کر لے گا، اس نے چھ ماہ کی مدت کے لئے تین لاکھ کی رقم دس فی صد ماہانہ منافع پر "قاضی انویسٹرز" میں لگا دی۔ یہاں سے کہانی نے ایک نیا موڑ لیا۔

ایک ماہ گزرنے کے بعد وہ شکیل کے ساتھ اپنی منافع کی رقم لینے قاضی صاحب کے پاس پہنچا

اور خوشی خوشی واپس لوٹا۔ حسب وعدہ قاضی قیوم نے تیس ہزار روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے۔ شکیل نے چند روز قبل دوسرے ماہ کا منافع حاصل کر لیا تھا۔ گھر آ کر خلیل نے ماں کو رقم کے بارے میں بتایا اور کہا۔"یہ تیس ہزار میں اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ آئندہ ماہ بیس ہزار رکھ کر دس ہزار آپ کو دے دوں گا۔"

"پہلے تم مجھے منافع کی رقم دکھاؤ۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" انیسہ بیگم نے بے یقینی سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ منافع میں ملنے والی رقم کو دیکھ کر تسلی کرنا چاہتی تھی۔

خلیل نے شکستہ دل سے کہا۔"امی! آپ کو کبھی مجھ پر اعتبار نہیں آئے گا۔" پھر تیس ہزار روپے ماں کو تھماتے ہوئے مزید کہا۔"میں ان روپوں کو کھا تو نہیں جاتا۔"

"یہ بات نہیں ہے بیٹا!" انیسہ نے رقم گننے کے بعد مطمئن انداز میں کہا اور روپوں کا وہ چھوٹا سا بنڈل خلیل کی طرف بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔"دراصل دس فی صد ماہانہ والی بات چونکہ خواب خیال سی لگتی ہے اس لئے میں اطمینان کرنا چاہتی تھی۔ تم یہ رقم اپنے پاس رکھو۔"

خلیل نے رقم جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔"میں کل ہی ایڈوانس دے کر ایک دکان حاصل کر لیتا ہوں۔ اگلے ماہ جو رقم ملے گی اس سے میں ضروری ساز و سامان اور چھوٹی موٹی مشینری خرید کر کام کا آغاز کر دوں گا۔"

"اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا!" انیسہ بیگم نے دعائیہ انداز میں کہا۔

ماں کو جذباتی دیکھ کر خلیل نے بات کو آگے بڑھایا۔"امی! ہمیں دو ماہ بعد اس انویسٹ منٹ کو ختم کرنے کی حماقت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ منافع کی بہت بھاری شرح ہے۔ دس ماہ بعد ہم اپنے تین لاکھ پر تین لاکھ منافع حاصل کر چکے ہوں گے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔"میں یہ دو ماہ دیکھ لوں پھر طویل المدت سرمایہ کاری کے بارے میں فیصلہ کروں گی۔"

ماں کے انداز سے خلیل کو محسوس ہو گیا کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔ دس ماہ تک نہ بھی سہی وہ چھ ماہ کی انویسٹ منٹ کے لئے ماں کو تیار کر لے گا۔

آئندہ ماہ بھی وقت مقررہ پر منافع کی رقم مل گئی۔ چند روز قبل شکیل نے اسے ٹو۔ کے میں بیٹھتے ہوئے بتایا تھا۔ وہ بھی منافع حاصل کر چکا ہے۔ شکیل نے خلیل سے لگ بھگ چالیس روز پہلے سرمایہ کاری کی تھی۔ وہ خلیل سے ایک ماہ دس دن سینئر تھا۔

دوسرے ماہ کا منافع ملنے پر اس نے پرنٹنگ پریس کی نوکری چھوڑ دی اور اپنی دکان میں پلیٹ میکنگ کا کام شروع کر دیا۔ اس کی دکان چونکہ برنس روڈ ہی کے علاقے میں واقع تھی اس لئے آمد و شد کے لئے وہ ابھی ٹو۔ کے ہی میں سفر کرتا تھا۔ دوسرے ماہ کا منافع حاصل کرنے کے بعد اس نے ماں کو چھ ماہ کی انویسٹ منٹ پر راضی کر لیا تھا۔

تیسرے ماہ کا منافع ملنے میں ہفتہ بھر باقی تھا کہ شکیل اسے خاصا پریشان نظر آیا۔ اس نے شکیل کی پریشانی کا سبب جاننا چاہا تو وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یار! بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟'' خلیل نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ''گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟''

''یار! گھر کو چھوڑو۔ میں قاضی قیوم کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

خلیل بھی مرد مذکور سے وابستہ تھا اس لئے چونک کر پوچھا۔ ''قاضی قیوم کو کیا ہوگیا ہے؟''

''یار! وہ تین چار روز سے ہاتھ نہیں آرہا۔'' شکیل نے بتایا۔ ''میں منافع کی رقم کے لئے کئی چکر اس کے دفتر کے لگا چکا ہوں لیکن اس سے ملاقات نہیں ہوسکی۔''

خلیل کا ماتھا بھی ٹھنکا تاہم اس نے امکانی انداز میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے قاضی صاحب دفتر نہ آرہے ہوں۔ تمہیں ان کے گھر کا اتا پتا معلوم ہے؟''

''میں اس کی رہائش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' شکیل نے بے بسی سے کہا۔ ''پہلے میں بھی کنول کو سچا سمجھ رہا تھا لیکن آج میں نے نیچے روڈ پر قاضی کی گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔'' کنول قاضی قیوم کی سیکرٹری تھی، شکیل نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بتایا۔

''کنول مجھ سے روزانہ یہی بہانہ کررہی تھی کہ قاضی دفتر میں موجود نہیں لیکن میرا خیال غلط ہے وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ مجھے مقررہ وقت پر منافع کی رقم مل جایا کرتی تھی۔ اس مرتبہ چار دن اوپر ہوگئے۔ اگر کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی تو میرا باپ بہت اودھم مچائے گا۔''

ایک ہفتے بعد خلیل کو بھی منافع کی رقم حاصل کرنے قاضی قیوم کے پاس جانا تھا۔ یہ صورت حال اس کے لئے بھی خاصی گمبھیر تھی تاہم اس نے شکیل کی تسلی کے لئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو دوست! میں کل تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

کہنے کو تو خلیل نے یہ تسلی بھرا جملہ کہہ دیا لیکن اندر سے وہ شکیل سے بھی زیادہ فکرمند ہوگیا۔ اس کے تو پورے تین لاکھ قاضی قیوم کے پاس پھنسے ہوئے تھے۔ اگر کوئی اُونچ نیچ ہوجاتی تو اس کا کباڑا ہوجانا لازمی تھا۔

آئندہ روز وہ دونوں قاضی ٹریڈنگ کمپنی کے دفتر پہنچ گئے۔ قاضی قیوم نے اسی نام سے کمپنی بنا رکھی تھی۔ ''قاضی انویسٹرز'' ایک ذیلی شاخ تھی جسے قاضی بہ ذات خود ڈیل کرتا تھا۔ اس ڈیلنگ میں اس کے عملے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ وہ عملہ قاضی ٹریڈنگ کمپنی کے معاملات کو دیکھتا تھا۔

استقبالیہ پر موجود خاتون کا نام کنول تھا جو بیک وقت ریسپشنسٹ اور سیکرٹری کے فرائض انجام دیتی تھی۔ کنول کی عمر پینتیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک گوری چٹی، موٹی تازی اور نہایت

پُرکشش عورت تھی۔ مٹاپے نے ایک تناسب کے ساتھ اسے بے حد لپیلنگ بنا دیا تھا۔ وہ آنکھیں گھما کر بڑے ناز و ادا سے بات کرتی تو سامنے والا اس کی پٹی پر یقین کرنے کو بہ خوشی راضی ہو جاتا۔

بلڈنگ میں داخل ہونے سے پہلے شکیل نے خلیل کو قاضی کی گاڑی دکھا دی تھی۔ وہ نیلے رنگ کی ایک فیاٹ کار تھی جو دوسری گاڑیوں کے درمیان بڑے شریفانہ انداز میں پارک کی گئی تھی۔ فیاٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ قاضی قیوم اوپر اپنے دفتر میں موجود تھا۔

ریسپشنسٹ کنول نے باری باری تنقیدی نظر سے ان دونوں کو دیکھا پھر شکیل کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''قاضی صاحب تو موجود نہیں ہیں۔''

''مگر ان کی نیلی فیاٹ تو نیچے موجود ہے!'' شکیل نے طنزیہ انداز میں کہا۔

کنول بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''اس کا مطلب ہے شکیل صاحب! آپ کو میری بات کا اعتبار نہیں ہے!''

''بات اعتبار کی نہیں مس کنول!'' شکیل نے کھردرے لہجے میں کہا۔ اس پینتیس سالہ خوب رو عورت کو سبھی ''مس'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ''میں حقائق بیان کررہا ہوں۔ کل بھی آپ نے یہی کہا تھا، قاضی صاحب دفتر میں موجود نہیں لیکن ان کی گاڑی نیچے موجود تھی۔ میں تین چار دن سے اس دفتر کے چکر کاٹ رہا ہوں۔ پہلے آپ ان کی مصروفیت کا بہانہ کرتی رہیں اور اب سرے سے انہیں غیر موجود کردیا۔ آخر آپ ایسا کیوں کررہی ہیں؟ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ پلیز! آپ ان سے میری ملاقات کروادیں۔''

اتفاق سے اس وقت ان دونوں کے سوا اور کوئی وہاں موجود نہیں تھا ورنہ وزیٹرز لابی میں بیٹھے ہوئے لوگ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوجاتے اور کوئی نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ کنول نے شکیل کے تیور دیکھے تو صورت حال کو سنبھالتے ہوئے معتدل انداز میں بولی۔

''دیکھیں، مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں مانتی ہوں قاضی صاحب کی فیاٹ نیچے کھڑی ہے لیکن وہ کوئی اور مسئلہ ہے۔ آپ لوگ میری بات کا یقین کریں۔''

خلیل نے استفسار کیا۔ ''اگر قاضی صاحب دفتر میں موجود نہیں ہیں تو پھر کہاں ہیں؟''

''انہیں بہت خطرناک قسم کا فلو ہوگیا ہے۔'' کنول نے بتایا۔ ''ڈاکٹر نے تین چار دن مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ اس وقت اپنے گھر پر ہوں گے!'' شکیل نے روکھے انداز میں کہا۔

ریسپشنسٹ نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

خلیل نے کہا۔ ''آپ ہمیں ان کے گھر کا ایڈریس بتادیں۔ ہم ان سے گھر پر مل لیں گے۔''

''سوری سر!'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''قاضی صاحب نے گھر کا ایڈریس...... میرا مطلب

ہے، میں قاضی صاحب کے گھر کا ایڈریس نہیں جانتی۔"

وہ واضح طور پر جھوٹ بول رہی تھی۔ پہلے وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ قاضی صاحب نے اپنے گھر کا ایڈریس بتانے سے منع کر رکھا ہے لیکن پھر اس نے بات کو گھما دیا اور اس ایڈریس سے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ کنول کی یہ چال بازی ان دونوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

خلیل نے کہا۔ "ٹھیک ہے آپ کو اگر قاضی صاحب کے گھر کا پتا معلوم نہیں تو ہم خود معلوم کر لیتے ہیں۔" پھر اس نے شکیل کا ہاتھ تھامتے ہوئے اضافہ کیا۔ "آؤ ہم قاضی صاحب کے کمرے میں جا کر دیکھتے ہیں۔"

انہوں نے پلٹ کر قدم بڑھائے ہی تھے کہ کنول بے طرح چلا اٹھی۔ "یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ پلیز! رک جائیں۔ ورنہ قاضی صاحب مجھے نوکری سے...... میرا مطلب ہے، قاضی صاحب اپنے کمرے میں نہیں ہیں......"

کنول کی زبان کے پلٹنے نے اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ قاضی قیوم اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ اس کے ایما پر کنول ان دونوں سے غلط بیانی کر رہی تھی۔ قاضی نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا ورنہ وہ نوکری سے نکالے جانے کی ادھوری بات نہ کرتی۔

قاضی ٹریڈنگ کمپنی میں ریسیپشن اور وزیٹرز لابی ایک ہی کمرے میں واقع تھے جو ایک مختصر ہال سے مشابہ تھے۔ اس کے بعد قاضی کا کمرا تھا۔ قاضی کے کمرے کے پیچھے ایک چھوٹا سا کمرا تھا جسے وہ ریٹائرنگ روم کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ مذکورہ کمرا اٹیچڈ باتھ کی سہولت کا حامل تھا۔

خلیل نے قاضی کا کمرا جھانکنے سے پہلے پلٹ کر ایک نظر کنول پر ڈالی۔ وہ افراتفری کے عالم میں انٹرکام پر اپنے باس کو اس واقعے کی اطلاع دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس دوران میں شکیل نے کمرے کا دروازہ کھول لیا اور وہ دونوں کسی بات کی پروا کئے بغیر کمرے میں داخل ہو گئے۔ خلیل نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اب ان کی مرضی کے بغیر کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔

کمرے میں انٹرکام کی گھنٹی بج رہی تھی تاہم وہ کمرا قاضی کے وجود سے خالی تھا۔ انٹرکام کی گھنٹی اس بات کی دلیل تھی کہ قاضی وہیں کہیں موجود تھا۔ اگر وہ اپنے دفتری کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا تو پر یقیناً وہ آرام کے کمرے میں ہوگا۔ انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسی لمحے قاضی ریٹائرنگ روم سے برآمد ہوا۔

اس کے انداز میں اچھی خاصی گھبراہٹ تھی۔ اپنے سامنے شکیل اور خلیل کو دیکھ کر وہ چونکا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ "تت...... تم دونوں......؟"

"ہم آپ کی عیادت کے لئے آئے ہیں۔" خلیل نے ترش لہجے میں کہا۔

شکیل بولا۔ "ہمیں پتا چلا تھا آپ کو بڑا خطرناک قسم کا فلو ہو گیا ہے۔"

"بیٹھو...... بیٹھو......" قاضی نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ پھر خود بھی اپنی کرسی کی جانب بڑھ گیا۔

جب وہ تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تو قاضی نے انٹرکام کا ریسیور کان سے لگا لیا۔ کنول کی بات سننے کے بعد اس نے صرف اتنا کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے!" پھر اس نے ریسیور کو کریڈل کر دیا۔

"قاضی صاحب! کہاں غائب ہیں آپ؟" شکیل نے کہا۔ "میں چار دن سے آپ کے دفتر کے چکر کاٹ رہا ہوں۔"

"بس یار کیا بتاؤں۔" وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ اس وقت تک وہ خود کو پوری طرح سنبھال چکا تھا۔ "کاروبار میں تیزی مندی تو آتی رہتی ہے۔ میں نے تقریباً دس لاکھ روپے کا سامان مڈل ایسٹ بھیجا تھا۔ اس کی ریکوری میں کچھ تاخیر ہو رہی ہے۔ بس اسی مسئلے میں الجھا ہوا ہوں۔"

شکیل نے کہا۔ "آپ کے مسئلے نے تو میرا ستیاناس مار دیا۔ اس ماہ مجھے منافع کی رقم بھی نہیں ملی۔"

"تم فکر نہ کرو یار۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔ "ایک دو دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ امید ہے آج چیک کیش ہو جائے گا۔ ایک آدھ دن اوپر نیچے تو ہو ہی جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ تم پرسوں آ کر اپنی منافع کی رقم لے جانا۔"

"ایک ہفتے بعد میری تاریخ بھی آ رہی ہے۔" خلیل نے یاددہانی کے انداز میں کہا۔

"مجھے یاد ہے خلیل صاحب!" قاضی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں بروقت ادائیگی ہو جائے گی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ دونوں کسی حد تک مطمئن ہو گئے۔ شکیل نے پوچھا۔ "قاضی صاحب! یہ خطرناک فلو والا کیا معاملہ ہے؟ آپ تو بھلے چنگے نظر آ رہے ہیں۔ آپ کی استقبالیہ کلرک بتا رہی تھی، آپ گھر پر آرام کر رہے ہیں لیکن آپ تو......"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "کنول نے آپ لوگوں سے جو کچھ بھی کہا وہ میرے ہی ایما پر کہا تھا۔ ویسے یہ سچ ہے میں پچھلے دو تین دن دفتر نہیں آیا۔ اسی پے منٹ کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ آج ادھر کا رخ کیا ہے۔ وہ زکام والی بات فرضی تھی۔"

خلیل نے استفسار کرنے والے انداز میں کہا۔ "مگر آپ کی نیلی فیاٹ تو کئی دن سے نیچے دیکھی جا رہی ہے؟" کئی دن والی بات اس نے اپنی طرف سے کہی تھی ورنہ شکیل صرف گزشتہ روز کا چشم دید گواہ تھا۔

قاضی قیوم نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ "میرے پاس اور بھی کئی گاڑیاں ہیں۔ ایک آدھ ادھر کھڑی رہ گئی تو کون سی قیامت آ گئی!"

وہ لاجواب ہوکر رہ گئے۔ قاضی ایک موقع شناس اور چرب زبان شخص تھا۔ اس قسم کے فراڈ لوگ آخری وقت تک اپنے شکار کو پھندے کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ ان کے دام میں آنے والا ہر لمحہ انہیں قابل اعتماد اور مخلص سمجھتا رہتا ہے۔ یہ بھرپور اداکاری ہی ایسے لوگوں کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔

قاضی نے ان دونوں کو تسلی دلاسا دے کر اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔ خلیل کو شکیل کے دل کا حال معلوم نہیں تھا تاہم وہ الجھ کر رہ گیا تھا کہ کہیں قاضی اسے کوئی گہری چوٹ نہ دے دے۔ وہ اس سلسلے میں ماں سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی کہ وہ بندھ کر رہ گیا تھا۔ اس کی منافع کی تاریخ میں چونکہ ایک ہفتہ باقی تھا اس لئے وہ خیریت کی دعا کے ساتھ متوقع منافع کا انتظار کرنے لگا۔

تین روز بعد اس کی ملاقات شکیل سے ہوئی تو اس نے قاضی کے بارے میں پوچھا۔ شکیل کی صورت دیکھ کر اُسے موسم کی خرابی کا اندازہ تو ہو گیا تھا۔ شکیل کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ نے اس اندیشے کی تصدیق بھی کر دی۔

''یار! قاضی ایک مرتبہ پھر غائب ہو گیا ہے۔''

''تم اس کے دفتر گئے تھے؟''

''پچھلے دو دن سے برابر جا رہا ہوں،'' شکیل نے بتایا۔ ''اس کی موٹی سیکرٹری کہتی ہے وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی!''

شکیل نے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

''قاضی کے دفتر میں دو تین ملاقاتی ہمیشہ میں نے بیٹھے دیکھے ہیں،'' شکیل الجھن بھرے لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے تو پھر وہ لوگ کس کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں؟''

''دوست! یہ قاضی قیوم مجھے تو کوئی فراڈیا لگتا ہے۔'' خلیل کے دل کی بات بے اختیار اس کی زبان سے پھسل گئی۔ ''اس دن بھی وہ دفتر میں موجود تھا جب موٹی کنول نے ہمیں فلو کا بہانہ کر کے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یقین ہے وہ تم سے ملنے سے کترا رہا ہے۔''

''اگر وہ ملنے سے کترا رہا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے وہ مجھے منافع کی رقم نہیں دینا چاہتا۔''

شکیل نے سوچ سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''یعنی اس کی نیت میں فتور آ چکا ہے۔ میرے دو لاکھ روپے اس کے پاس ہیں۔ میں تو ایک ایک پائی وصول کر کے چھوڑوں گا۔ ابھی تک میں نے ابا کو مختلف حیلوں بہانوں سے بہلا رکھا ہے۔ وہ پوچھ بھی رہا تھا اس ماہ منافع کی رقم کیا ہوئی؟''

شکیل کی باتوں سے حد درجہ پریشانی جھلکتی تھی۔ وہ صورت حالات ہی ایسی تھی کہ ان دونوں کو پریشان ہونا چاہئے تھا۔ خلیل نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''تم نے تو دو لاکھ پھنسا کر تین ماہ تک برابر منافع بھی حاصل کر لیا ہے مگر میں نے تین لاکھ

انویسٹ کر رکھے ہیں اور مجھے صرف دو ماہ منافع ملا ہے۔ میں تم سے زیادہ نازک پوزیشن میں ہوں۔ تین روز بعد مجھے منافع ملنے والا ہے۔ اگر قاضی نے میرے ساتھ بھی یہی رویہ اپنایا تو میں تباہ ہو کر رہ جاؤں گا۔''

شکیل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یار اس وقت ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں، ہمیں کسی بھی طرح کوشش کر کے قاضی سے اپنی رقوم نکلوا لینا چاہئے۔''

''تم نے جس سوراخ دار کشتی کا ذکر کیا ہے، مجھے اس میں سوار کرنے والے تم ہی ہو شکیل!''

خلیل کے لہجے میں شکایت جھلکتی تھی۔ ''میں تو کسی قاضی واضی کو نہیں جانتا تھا۔ اگر میری رقم ڈوبی تو میں تمہیں ہی پکڑوں گا۔''

شکیل نے تیکھی نظر سے خلیل کو دیکھا اور اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یار! تم تو مجھے ایسے دھمکا رہے ہو جیسے میں قاضی کا آلہ کار ہوں اور باقاعدہ اس سے کمیشن لیتا ہوں۔ میں نے تمہیں انویسٹ منٹ کا مشورہ ضرور دیا تھا، اس کام کے لئے زور نہیں دیا تھا۔ تم نے اپنی مرضی اور خواہش سے تین لاکھ ''قاضی انویسٹرز'' میں لگائے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کے لئے سانس لینے کی خاطر رُکا، پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تم ہر ماہ تیس ہزار کی رقم حاصل کر کے بڑے مزے سے گھر چلے جاتے ہو۔ میں اس منافع میں تمہارا حصہ دار نہیں ہوں جو نقصان کی صورت میں ذمے دار بن جاؤں۔''

خلیل کو احساس ہو گیا کہ اس نے ایک غلط بات کہہ دی تھی۔ وہ تلافی کے طور پر قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''دوست زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو الزام دینے کے بجائے قاضی کو قابو کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔''

''اب تم نے کی ہے معقول بات!'' شکیل کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔

خلیل نے کہا۔ ''میرے منافع کی تاریخ تو تین روز بعد آئے گی۔ ہم آج ہی قاضی کے دفتر چلتے ہیں...... اور اس سے دوٹوک بات کرتے ہیں۔''

باہمی صلاح مشورے کے بعد وہ دونوں ایک مرتبہ پھر قاضی کے دفتر پہنچ گئے۔ ان کی بدقسمتی کہ اس روز بھی قاضی سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ کنول نے انہیں بتایا کہ قاضی پندرہ منٹ پہلے دفتر سے نکلا تھا۔ اس وقت وزیٹرز لابی میں دو افراد پریشان حال بیٹھے تھے۔

''وہ تو شہر سے باہر گیا ہوا تھا؟'' شکیل نے کنول کی طرف دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔

''وہ رات ہی کو واپس آئے ہیں۔'' کنول نے بتایا۔

''ہمیں تم پر ذرا اعتبار نہیں۔'' خلیل نے کہا۔ ''ہم اندر اس کے کمرے میں جا کر دیکھیں گے۔ تم پہلے بھی ہمیں چکر دینے کی کوشش کر چکی ہو۔''

''میں نے قاضی صاحب کے حکم پر......

''آخر معاملہ کیا ہے؟'' کنول کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہاں موجود دو افراد میں سے ایک بول اٹھا۔ اس کا روئے سخن کنول کی جانب تھا۔ ''ہمیں تو تم نے یہ کہا ہے کہ قاضی صاحب آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ گھر سے ان کا فون آیا تھا...... لیکن انہیں تم بتا رہی ہو۔ قاضی پندرہ منٹ پہلے یہاں سے گئے ہیں۔ یہ کیا چکر بازی ہے؟''

خلیل نے بولنے والے شخص سے کہا۔ ''اگر یہ چکر بازی ہے تو بہت ہی گہری چکر بازی ہے۔ ہم دونوں نے قاضی قیوم کے پاس اپنی رقوم انویسٹ کر رکھی ہیں۔ دو تین ماہ باقاعدگی سے منافع ملا لیکن اب قاضی منہ چھپاتا پھر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ اس دفتر ہی میں ہوگا۔ ہم پہلے بھی اسے اس کمرے سے برآمد کر چکے ہیں۔'' بات ختم کرتے ہی خلیل نے قاضی کے کمرے کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

خلیل کی وضاحت نے وہاں محوِ انتظار افراد کے منہ کھول دیئے۔ وہ اپنا اپنا رونا رونے لگے۔ ان میں سے ایک کا نام اشفاق حسین تھا اور دوسرے کا مروت شاہ۔ اشفاق حسین نے قاضی کے پاس پانچ لاکھ روپے انویسٹ کر رکھے تھے اور اسے صرف دو ماہ تک منافع ملا تھا۔ اب وہ بیس پچیس دن سے قاضی کے دفتر کے چکر کاٹ رہا تھا۔ مروت شاہ قاضی کے پاس اپنے چار لاکھ پھنسائے بیٹھا تھا۔ قاضی نے اسے صرف تین ماہ منافع دیا تھا۔

ان چاروں کی کہانی ایک ہی پلاٹ کے گرد گھومتی تھی۔ نامعلوم اور کتنے بے چارے اسی کہانی کے کردار بنے ہوں گے۔ اس ''طاقت'' کے سامنے کنول اور اسٹاف کے دیگر افراد کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کر سکے اور ان چاروں نے قاضی کے دونوں کمرے جھانک لئے۔ قاضی واقعی اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھا۔ خدا جانے! وہ پندرہ منٹ پہلے وہاں سے نکلا تھا یا پھر تیس منٹ بعد آنے والا تھا!

شکیل اور خلیل وہاں سے واپس آ گئے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بہت پریشان تھے۔ اشفاق حسین اور مروت شاہ کی کہانی سامنے آنے کے بعد انہیں اپنی رقوم ڈوبتی ہوئی دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ قاضی سے رقم نکلوانے کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنی اپنی راہ ہو لئے۔

خلیل کے منافع کی تاریخ میں ابھی تین روز باقی تھے لہٰذا اسے سوچنے کا زیادہ موقع ملا۔ اچھی طرح سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ قاضی کو دفتر میں گھیرنا ممکن نہیں۔ وہ اگر اس کے گھر جا کر ملے تو بات بن سکتی ہے۔ اسے قاضی کے گھر کا ایڈریس معلوم نہیں تھا لیکن وہ کہتے ہیں نا ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے...... خلیل نے اپنے تئیں کوشش کر کے قاضی کا گھر کھوج نکالا۔ وہ شکیل کو یہ خوش خبری سنانے ہی والا تھا کہ ایک افسوس ناک واقعہ پیش آ گیا۔ اچانک اسے معلوم ہوا پولیس نے شکیل کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس پر بلوے اور توڑ پھوڑ کا الزام تھا...... اور یہ ساری ہنگامہ آرائی ''قاضی ٹریڈنگ کمپنی'' کے دفتر میں پیش آئی تھی۔

تفصیلات کے مطابق شکیل نے مروت شاہ اور اشفاق نامی دو افراد کے ساتھ مل کر کمپنی کے دفتر میں خاصی توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا، قاضی قیوم ان کی بڑی بڑی رقوم ڈکارے بیٹھا ہے مگر قاضی نے ان کے الزام کو بے بنیاد اور جھوٹا قرار دیتے ہوئے انہیں پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ پولیس کو تو ایسے کیسز کی تلاش رہتی ہے۔ واقعات کے مطابق مروت شاہ اور اشفاق حسین تو پولیس کی مٹھی گرم کر کے دوسرے روز ہی چھوٹ گئے تھے تاہم شکیل ابھی تک اس سرکاری محکمے کے چنگل میں تھا۔ شکیل سے مل کر خلیل نے اظہار افسوس کیا اور واپس آ گیا۔

خلیل نے اس واقعے پر بہت دور تک سوچا اور بالآخر ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے اگلے روز قاضی کے گھر جا کر صاف صاف بات کرنے کا ارادہ باندھ لیا۔ اگر قاضی کسی بھی طور پر اس کے قابو میں نہ آتا اور اس کی رقم سے بھی انکاری ہو جاتا تو پھر وہ اشفاق حسین، مروت شاہ اور شکیل کو اپنے ساتھ ملا کر قاضی کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں تھا۔

خلیل کی معلومات کے مطابق قاضی قیوم کی رہائش نرسری کے علاقے میں تھی۔ وہ چھ سو گز کے ایک خوبصورت بنگلے میں رہتا تھا۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے ایک طرح دار حسینہ سے شادی کی تھی۔ قاضی کی بیوی کا نام نوشابہ تھا جو نوشی کے نام سے عموماً پکاری جاتی۔ اس خوبرو عورت کی عمر لگ بھگ ستائیس سال تھی۔ قاضی اپنی بیوی نوشی کے ساتھ اس بنگلے میں رہتا تھا۔ گھر میں اور افراد موجود نہیں تھے۔ ملازمین کو گھر کے افراد میں شمار نہیں کیا جا سکتا!

خلیل اکیس مارچ کی شام کو قاضی کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اتفاق سے اسی روز اس کے منافع ملنے کی تاریخ بھی تھی۔ شکیل اور اشفاق و مروت وغیرہ کو اٹھارہ مارچ کی دوپہر قاضی کے دفتر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اگر آج قاضی سے کوئی بات نہ بن پاتی تو پھر وہ متذکرہ بالا افراد سے مل کر کوئی جامع منصوبہ بناتا۔

قاضی اسے دیکھ کر پہلے حیران ہوا۔ اس کی حیرانی پلک جھپکتے میں پریشانی میں بدلی تاہم اگلے ہی لمحے اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پا لیا اور ایک شرمندہ سی ہنسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا۔

''ایک منٹ خلیل صاحب! میں ڈرائنگ روم کھلواتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی قاضی بنگلے کے اندر غائب ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد خلیل، ڈرائنگ روم میں قاضی قیوم کے روبہ رو بیٹھا تھا۔

''قاضی صاحب!'' رسمی علیک سلیک کے بعد خلیل نے کہا۔ ''آپ تو ہاتھ ہی نہیں آ رہے۔ دفتر کے چکر لگا لگا کر پریشان ہو گیا ہوں...... اور ویسے بھی ادھر جاتے ہوئے ڈرنے لگا ہوں۔ کہیں ان تینوں کی طرح آپ مجھے بھی کسی الزام میں بند نہ کروا دیں!''

”ایسی کوئی بات نہیں یار!“ قاضی بے تکلفی سے بولا۔ ”پہلے تم بتاؤ، ٹھنڈا چلے گا یا گرم۔ اس کے بعد میں تمہیں ان تینوں کی بدمعاشی کی تفصیل سناتا ہوں۔“

”ٹھنڈا گرم تو رہنے دیں جناب۔“ خلیل اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”اور ان تینوں کی بدمعاشی کا قصہ بھی ڈالیں جہنم میں۔ میں تو اپنے منافع کے لئے آپ کے در پر حاضر ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کے دولت خانے کا پتا چلایا ہے۔ آج اکیس تاریخ ہے اور آپ اسی تاریخ کو مجھے منافع دیا کرتے ہیں۔“

قاضی نے دوستانہ انداز میں سنجیدگی سے خلیل کو دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یار! میں بزنس مین ہوں، کوئی گھسیارا نہیں۔ مجھے ایک ایک تاریخ اور ہر تاریخ کا ایک ایک پل بہ خوبی یاد رہتا ہے۔ تمہارے منافع کی بات بعد میں ہوگی پہلے تم اپنے دوست شکیل کی زیادتی کی تفصیل سن لو۔ میری جگہ جو بھی ہوتا، ان تینوں کے ساتھ یہی سلوک کرتا۔“

خلیل کے پاس قاضی کی بات سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ آئندہ پندرہ بیس منٹ میں قاضی نے اسے شکیل، اشفاق اور مروت کی غنڈا گردی کے بارے میں بڑھ چڑھ کر بتایا۔ اس کے مطابق اشفاق اور مروت کو شکیل نے بھڑکایا تھا۔ وہ جیسے ان کا سرغنہ بن گیا تھا۔ ”میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ گالم گلوچ پر اتر آئے۔“ قاضی نے بات کے اختتام پر کہا۔ ”میں نے ان کی گالیاں سن کر بھی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے میری شرافت کو کمزوری جانا اور میرے دفتر میں توڑ پھوڑ کرنے لگے۔ مجبوراً مجھے پولیس کو کال کرنا پڑا۔“

خلیل پوری توجہ سے قاضی کی کہانی سن رہا تھا۔ اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ قاضی کی بات میں جھوٹ اور سچ کا کیا تناسب تھا۔ اسے اپنے تین لاکھ کی فکر تھی جو ڈوبتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی طرح یہ رقم قاضی کے پاس سے نکل آتی تو وہ گراں قدر منافع پر لعنت بھیجنے کو تیار تھا۔ اسے خاموش پا کر قاضی نے مزید کہا۔

”دیکھو خلیل! تم عاقل و بالغ شخص ہو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے، بزنس میں دیر سویر چلتی رہتی ہے۔ میں نے انہیں صرف دو دن صبر کرنے کو کہا تھا۔ اگر وہ میری بات مان لیتے تو کچھ بھی نہ بگڑتا۔ کل میرا چیک کلیئر ہو گیا ہے میں انہیں آج پیمنٹ کر دیتا لیکن ان کی جلدی بازی اور بے اعتباری نے انہیں حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔“

خلیل نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے قاضی کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا۔ ”جناب! آپ نے ان لوگوں کے ساتھ جو بھی سلوک کیا وہ آپ کا اور ان کا معاملہ ہے، میں تو اس وقت صرف اپنے سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

قاضی نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ ”شام کے سات بج رہے ہیں۔ اس وقت تو میں تمہارا مسئلہ حل نہیں کر سکتا۔ گھر میں، میں نقدی رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ آج کل ویسے بھی

چوری ڈکیتی عام ہو گئی ہے۔ اگر آج تم دفتر میں مجھ سے مل لیتے تو معاملہ نمٹ جاتا، خیر!“

قاضی نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک طویل سانس لی اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم کل صبح گیارہ بجے میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ بینک لے جاؤں گا اور منافع کی رقم مبلغ تیس ہزار تمہارے حوالے کر دوں گا۔ مجھے بینک سے ایک بڑا اماؤنٹ ڈرا کروانا ہے۔“

خلیل کو قدرے اطمینان ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ”میں کل گیارہ بجے آپ کے دفتر آؤں یا گھر پر؟“

”تم یہیں آ جانا۔ دفتر کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔“ قاضی نے کہا۔

ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔“ خلیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

قاضی اسے رخصت کرنے گیٹ تک آیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے پتا چلا ہے، مروت اور اشفاق نے پولیس والوں کی مٹھی کو گرما کر اپنی جان چھڑا لی ہے لیکن شکیل بے چارہ ابھی تک پھنسا ہوا ہے۔ میں انشاء اللہ کل اس کی رہائی کا بندوبست کروں گا۔“ ایک لمحے کے توقف سے وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یار! تمہارا یہ دوست شکیل تو سخت بے وقوف آدمی ہے۔ اگر فرصت ملے تو اسے سمجھاؤ۔ دماغ کو گرم رکھنے سے ہمیشہ مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔“

خلیل نے اثبات میں گردن ہلائی اور اس کے بنگلے سے نکل آیا۔

یہاں سے خلیل کی بدبختی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ وہ تین لاکھ کی خطیر رقم قاضی کے پاس پھنسا چکا تھا۔ وصولی کی صورت میں دو ماہ کا منافع یعنی ساٹھ ہزار کی رقم اس کے ہاتھ آئی تھی۔ تیسرے ماہ کا منافع لینے وہ قاضی کے بنگلے پر پہنچا تو خلاف توقع صورتحال سے اس کا سامنا ہو گیا، وہ قاضی کے بلانے پر آیا تھا لیکن قاضی کے بجائے اس کی ملاقات نوشابہ سے ہو گئی۔

اس کی گھنٹی کے جواب میں نوشابہ نے گیٹ کھولا تو خلیل اسے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ نوشابہ عرف نوشی نے بغور اس کا جائزہ لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”آپ غالباً خلیل صاحب ہیں!“

”جی، قاضی صاحب نے مجھے بلایا تھا۔“ خلیل نے جلدی سے کہا۔

”آپ آدھا گھنٹہ پہلے آ گئے۔“

اس وقت ساڑھے دس بجے تھے۔ قاضی نے اسے گیارہ بجے آنے کو کہا تھا۔ خلیل نے قدرے شرمساری سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں میں آدھا گھنٹا انتظار کر لیتا ہوں۔“

”انتظار میں خوامخواہ اپنا وقت برباد نہ کریں۔“ نوشابہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”قاضی صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آدھا گھنٹا پہلے کسی ضروری کام سے نکلے ہیں اور شام سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔“

”وہ کہاں چلے گئے؟“ خلیل نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا۔

نوشابہ نے بتایا۔ ''انہوں نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا البتہ یہ بات مجھے معلوم ہے کہ وہ آفس نہیں گئے۔ ویسے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ آپ کے لیے ایک میسج چھوڑ کر گئے ہیں۔''

''کیسا میسج؟'' خلیل نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

ان کے درمیان یہ مکالمہ گیٹ پر ہی ہو رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ نوشابہ گیٹ کے اندر بنگلے میں تھی، خلیل بنگلے کے باہر کھڑا تھا۔ خلیل کے سوال کے جواب میں نوشابہ نے بتایا۔

''قاضی صاحب نے جاتے ہوئے کہا تھا، آپ آج رات کو آٹھ بجے کے بعد کسی وقت آ کر اپنی رقم لے جائیں۔ وہ واپسی پر کیش اپنے ساتھ لے کر آئیں گے۔ یہ انتظام وہ خاص طور پر آپ کے لیے کریں گے ورنہ وہ گھر میں رقم رکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔''

یہ بات کل شام قاضی نے بھی اسے بتائی تھی۔ نوشابہ کی بات سن کر خلیل کو قدرے اطمینان ہو گیا۔ ویسے بھی جب کوئی حسین وجمیل خاتون تسلی دے رہی ہو تو لامحالہ مطمئن ہونے کو جی چاہتا ہے۔ حسن اپنے اندر عجیب وغریب خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ بیک وقت مسیحا بھی ہے اور قاتل بھی۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جب کسی خوب رو حسینہ نے ناقابل تسخیر قوت کے پہاڑ مرد کو موت کے منہ میں دھکیلا ہو۔ یہی عشوہ پرداز اور حسن بردار صنف نازک بعض مقامات پر مرض الموت میں مبتلا شخص کے تن ضعیف ونزار میں زندگی کی لہر دوڑاتی نظر آتی ہیں۔ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں شاید اسی لیے پری وش نرسوں کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے۔

خلیل نے بڑی فرماں برداری سے رخصت ہونے کا فیصلہ کیا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں رات کو دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ آپ قاضی صاحب کو بتا دیجئے گا، میں آیا تھا۔''

''ضرور بتا دوں گی۔'' نوشابہ زیر لب مسکرائی اور گیٹ بند کر دیا۔

خلیل کے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا وہ اپنی دکان کی طرف چلا گیا۔ ویسے اس کا دل مطمئن تھا کہ نوشابہ نے اسے گولی نہیں دی ہوگی۔ آج رات ہر صورت اسے منافع کی رقم مل جائے گی۔

اس کے اطمینان کا کانچ محل اس وقت ریزہ ریزہ ہو گیا جب دوپہر ایک بجے پولیس نے اسے اس کی دکان سے گرفتار کر لیا......نوشابہ کے قتل کے الزام میں!

✿✿✿

منظر اسی عدالت کا تھا اور اکیوزڈ باکس میں میرا موکل اور اس مقدمے کا ملزم خلیل سر جھکائے کھڑا تھا۔ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ فرد جرم اور صحت جرم سے انکار کا معاملہ گزشتہ پیشی پر نمٹ گیا تھا۔ مذکورہ پیشی پر میں نے خلیل کی ضمانت کروانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن مجھے اس سعی میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب صورت حال مختلف تھی۔ میں کیس فائل کا اچھی طرح مطالعہ کر چکا تھا

اور ادھر اُدھر سے کافی مفید معلومات اکٹھا کر لی تھیں۔ شکیل پوری طرح مجھ سے تعاون کر رہا تھا۔ وہ میرے لئے ایک عمدہ ہرکارہ ثابت ہو رہا تھا۔ چار ماہ پہلے پولیس نے اس کی جان چھوڑ دی تھی۔ پتا نہیں اس کی رہائی میں قاضی کی مہربانی شامل تھی یا پھر پولیس کی بے بسی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں چند اہم باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کیس کو عدالت میں لگے کم وبیش چار ماہ گزر گئے تھے۔ میں نے ایک ہفتہ قبل یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ ازیں قبل جو وکیل صفائی خلیل کی وکالت کر رہا تھا۔ اب اس سے جان چھڑا لی گئی تھی۔ اس اللہ کے بندے نے معاملات کو سلجھانے کے بجائے مزید الجھا دیا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا وہ ایک بھاری رقم وصول کر کے مخالف پارٹی سے جا ملا تھا۔ قاضی قیوم ایسے چمتکاروں کا ماہر تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق نوشابہ کی موت بائیس مارچ کی دوپہر دس بجے اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مقتول کی لاش ڈرائنگ روم میں پائی گئی تھی۔ گھر کے دیگر کمروں میں خاصی ابتری پائی گئی تھی۔ پہلی نظر میں وہ ڈکیتی کی واردات دکھائی دیتی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر قیمتی سامان میں سے کچھ بھی نہیں گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، بنگلے میں داخل ہونے والے یا والوں کو کسی خاص چیز کی تلاش تھی جس کے حصول کی خاطر انہوں نے بڑی بے دردی سے خانہ تلاشی لے ڈالی تھی۔ مدعی قاضی قیوم کی نشاندہی پر پولیس نے خلیل کو نوشابہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے حوالات میں پہنچا دیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہایت ہی مختصر اور سادہ تھی۔ پولیس نے جو چالان عدالت میں پیش کیا اس میں مجھے بہت سے سقم نظر آئے۔ ایک بڑی سی مثال فنگر پرنٹس کی تھی۔ پولیس رپورٹ میں کسی بھی حوالے سے فنگر پرنٹس کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔

یہ کیس پچھلے چار ماہ سے مسلسل ٹلتا چلا آ رہا تھا لہٰذا اب تک اگر کوئی چھوٹی موٹی کارروائی ہوئی بھی تھی تو وہ کوئی شکل اختیار نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اس پیشی پر جج نے نئے سرے سے ملزم کا بیان ریکارڈ کروایا۔ خلیل حلفیہ بیان دے چکا تو وکیل استغاثہ اس کے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔

اس بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ وہی بیان تھا جو اس سے پہلے اس نے پولیس کو دیا تھا۔ میں یہ ساری تفصیلات خلیل کی کہانی کے ذیل میں بیان کر چکا ہوں۔ وکیل استغاثہ چند لمحے ناقدانہ نظر سے ملزم کو گھورتا رہا پھر جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔

''مسٹر خلیل! تمہیں مقتول نوشابہ سے کیا دشمنی تھی؟''

''میں کبھی بھی اس کا دشمن نہیں رہا۔'' میرے موکل نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ''ہماری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی کھڑے کھڑے مختصر سی جو بڑی خوش گوار تھی۔ میں اس مختصر ملاقات کی تفصیل اپنے بیان میں بتا چکا ہوں۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے تمہاری دشمنی قاضی صاحب سے تھی؟''

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ خلیل نے کہا۔

”پھر تم نے قاضی کی اہلیہ نوشابہ کو کیوں قتل کیا؟“

”یہ سراسر مجھ پر الزام ہے۔“

”کیا تم وقوعہ کے روز مقتول کے بنگلے پر نہیں گئے تھے؟“

”مجھے اس بات سے قطعاً انکار نہیں۔“

”تمہیں کس چیز کی تلاش تھی جس کے حصول کی خاطر تم نے پورا گھر الٹا کر رکھ دیا۔“ وکیل استغاثہ سخت لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”اور جب مقتول نے مزاحمت کی کوشش کی تو تم نے گلا دبا کر اس کی جان لے لی۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ ملزم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”میں نے کسی کی جان نہیں لی اور نہ ہی مجھے اس بنگلے میں کسی چیز کی تلاش تھی۔ میں نے تو بنگلے کے اندر قدم بھی نہیں رکھا۔ میں قاضی قیوم سے اپنی رقم لینے وہاں گیا تھا۔ نوشابہ نے رات میں آنے کو کہا اور میں لوٹ گیا۔ نوشابہ نے مجھے بتایا تھا، قاضی سے ملاقات نہیں ہوسکتی۔ وہ کسی ضروری کام میں مصروف ہے۔“

وکیل استغاثہ نے ایک نکتہ اٹھایا۔ ”اگر قاضی قیوم تمہیں گھر پر نہیں ملا تھا تو تم اس کے دفتر چلے جاتے۔ اس افراتفری اور قتل کی کیا ضرورت تھی؟ وکیل استغاثہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن تم تو وہاں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پہنچے تھے۔ اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر واپس کیسے آتے!“

وکیل استغاثہ کے آخری جملے میں طنز کی آمیزش تھی۔ میرے موکل نے بے بسی سے سر ہلایا اور صرف اتنا کہا۔ ”آپ کے قیاس کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

وکیل استغاثہ نے دو چار مزید تلخ و ترش سوالات کئے پھر جرح کا زاویہ تبدیل کر دیا۔ وہ ملزم سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”مسٹر خلیل! وقوعہ سے چار روز قبل قاضی صاحب کے دفتر میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا۔ تم اس واقعے کو بھولے تو نہیں ہو گے۔ قاضی قیوم نے تمہارے ایک دوست سمیت تین افراد کو تھانے میں بند کروا دیا تھا؟“

”وہ واقعہ افسوس ناک ہے لہٰذا اسے فراموش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ خلیل نے سادگی سے جواب دیا۔

میرا موکل نہایت ہی سمجھ داری سے وکیل مخالف کے سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔ ابھی تک مجھے اس کی مدد کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی لہٰذا میں خاموش کھڑا وہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ خلیل میری ہدایات پر من و عن عمل کر رہا تھا۔

وکیل استغاثہ چند لمحات تک ملزم کو گھورتا رہا پھر فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”جس چیز کو فراموش نہ کیا جا سکے وہ ناقابل فراموش ہو جاتی ہے۔ ناقابل فراموش واقعات کو یاد کرنے کے بھی کچھ

آداب ہوتے ہیں لیکن تم نے جو گری ہوئی حرکت کی ہے وہ ادب آداب کے دائرے سے باہر ہے۔“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ میں نے اس مرحلے پر مداخلت ضروری سمجھی اور جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”وکیل استغاثہ جانے کس جوش میں اچھل رہے ہیں۔ انہیں اپنی لینگوئج کو تبدیل کرنا چاہئے۔ ایک پڑھے لکھے شخص کو یہ انداز زیب نہیں دیتا۔ میں سمجھ نہیں سکا وہ میرے موکل کی کون سی گری ہوئی حرکت کا ذکر کر رہے ہیں...... اور وہ بھی اتنے نازیبا انداز میں؟“

جج نے میرے اعتراض پر باری باری وکیل استغاثہ اور ملزم کو دیکھا پھر خلیل سے پوچھا۔

”مسٹر! کیا تم نے وکیل استغاثہ کی بات سمجھ لی ہے؟“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے سادگی سے بولا۔ ”نہیں جناب! میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔“

جج نے وکیل استغاثہ کو ہدایت کی کہ وہ آسان الفاظ میں اپنی بات کی وضاحت کرے۔

وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

”جناب عالی! جیسا کہ میں نے عرض کیا، اٹھارہ مارچ کی دوپہر ملزم کا ایک دوست اپنے دو حواریوں کے ساتھ قاضی قیوم کے آفس پہنچا اور وہاں خوب توڑ پھوڑ مچائی۔ اس قابل دخل اندازی پولیس والے واقعے پر قاضی نے متعلقہ تھانے فون کر کے ان تینوں افراد کو گرفتار کروا دیا۔ آئندہ روز حوالات میں صرف ملزم کا دوست رہ گیا۔ دوسرے دونوں افراد کو پولیس نے رہا کر دیا کیونکہ بلوے کا وہ واقعہ ملزم کے دوست شکیل کے ایما پر عمل میں آیا تھا۔“ وکیل استغاثہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یور آنر! میں نے تھوڑی دیر پہلے ملزم کی جس گری ہوئی حرکت کا ذکر کیا ہے وہ قتل عمد کا واقعہ ہے۔ ملزم نے اپنے دوست کا انتقام لینے کے لئے قاضی صاحب کی بیوی نوشابہ کو قتل کر دیا۔“

”آئی آبجیکٹ!“ میں نے با آواز بلند کہا۔

جج نے نہایت ہی سنجیدہ مگر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے اپنے اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! لگتا ہے وکیل استغاثہ آج کسی ذہنی خلجان میں مبتلا ہیں۔ ان کی فریکوئنسی میں خاصی گڑبڑ پائی جاتی ہے۔ انہوں نے گزشتہ چند منٹ میں بڑی لوٹیں لگائی ہیں۔ میں حیران ہوں، میرے فاضل دوست اس وقت عدالت میں کمرے میں موجود ہیں یا کسی پریشان خانے میں سر پکڑے بیٹھے ہیں۔“

”بات تو آپ بھی سر کے اوپر سے گزرنے والی کر رہے ہیں!“ وکیل استغاثہ قطع کلامی کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

میں استہزائیہ انداز میں مسکرا دیا اور کہا۔ ”ادھوری چیز ہمیشہ سر کے اوپر سے گزرا کرتی ہے۔ آپ نے اگر مجھے بات مکمل کرنے دی ہوتی تو شاید آپ اس الجھن میں نہ پھنستے!“

میری اس کامل چوٹ پر وہ دوسری جانب دیکھنے لگا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ اپنی بات کو پورا کریں۔“

”جنابِ عالی!“ میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھنے کے بعد روئے سخن جج کی جانب موڑا۔ ”تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ملزم کسی خاص اور اہم شے کی تلاش میں مقتول کے بنگلے میں گھسا۔ پولیس کی رپورٹ میں بھی اسی نکتے پر زور دیا گیا ہے۔ مقتول نے جب ملزم کی کارروائی میں روک بننے کی کوشش کی تو ملزم نے گلا گھونٹ کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا لیکن اب!“

میں نے ڈرامائی انداز میں بات کو نامکمل چھوڑا اور وکیل استغاثہ کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا پھر جج کو دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔ ”لیکن اب وکیل استغاثہ اس قتل کا محرک کچھ اور ہی بیان کر رہے ہیں......یعنی میرے موکل نے اپنے دوست شکیل کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے قاضی کی بیوی کو قتل کر دیا۔ وکیل استغاثہ کی یہ قلابازی نہایت ہی غیر منطقی اور بچگانہ ہے۔“

”وہ کیسے؟“ وکیل استغاثہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”ایسے!“ میں نے یک لفظی جملہ بولا اور خاموش ہو گیا۔

جج سمیت عدالت میں موجود تمام افراد کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جنابِ عالی! اول، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ شکیل نامی اس شخص کی میرے موکل سے دوستی نہیں۔ دوستی بہت ہی نازک اور جذباتی رشتہ ہے۔ ہاں البتہ ملزم اور شکیل میں اچھی علیک سلیک تھی۔ یہ تعلق اتنا گہرا نہیں تھا کہ میرا موکل شکیل کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے کسی کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ بیٹھتا۔ ایسا سوچنا انتہائی بچگانہ ہوگا۔“ میں نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دوم، اگر وکیل استغاثہ کی تھیوری کو ایک لمحے کے لئے سچ مان بھی لیا جائے تو پھر منطقی طور پر میرے موکل کے انتقام کا نشانہ قاضی قیوم کو بننا چاہئے تھا نہ کہ اس کی بیوی نوشابہ کو!؟“

میری بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟“

”جنابِ عالی! میں اس پیچ کی وضاحت مناسب وقت پر کروں گا۔“

وکیل استغاثہ کے گریز نما فرار کو جج نے فوراً محسوس کر لیا۔ معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ ملزم سے کوئی اور سوال کرنا چاہیں گے؟“

وکیل استغاثہ ہینڈز اپ ہو گیا۔ ”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!“

اپنی باری پر میں جرح کے لئے ملزم کے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں ملزم کو مخاطب کیا اور پوچھا۔ ”مسٹر خلیل! آپ مقتول کو کب سے جانتے تھے؟“

”میری مقتول سے صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی مختصر سی۔“ خلیل نے جواب دیا۔ ”آپ اسے جاننا نہیں کہہ سکتے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا، آپ کی مقتول سے دوستی تھی اور نہ ہی دشمنی؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”مقتول کے شوہر اور اس کیس کے مدعی قاضی قیوم سے آپ کا کیا تعلق تھا؟“

”ہمارے درمیان کاروباری تعلق تھا۔“

”اس تعلق کی مدت کیا ہو گی؟“

”کم و بیش تین ماہ۔“

”اس تعلق کی نوعیت کے بارے میں معزز عدالت کو کچھ بتائیں گے؟“

میرے اس سوال کے جواب میں خلیل نے اپنی انویسٹ منٹ پر ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”دو ماہ تک مجھے باقاعدہ منافع ملتا رہا لیکن تیسرے ماہ کے اختتام پر یہ سنگین واقعہ پیش آ گیا۔ میں قاضی کے کہنے پر منافع کی رقم لینے اس کے گھر پہنچا تو اس کی بیوی نوشابہ نے بتایا کہ میں رات میں آؤں۔ میں وہاں سے سیدھا اپنی دکان پر چلا گیا جہاں دوپہر میں پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔“

”تم منافع کی رقم حاصل کرنے قاضی کے دفتر کیوں نہیں گئے تھے؟“

”قاضی نے مجھے دفتر کا رخ کرنے سے منع کر دیا تھا۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

خلیل نے بتایا۔ ”قاضی کے مطابق دفتر کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ مجھے قاضی کی بات کا اعتبار اس لئے بھی آ گیا کہ وقوعہ سے چار روز قبل اس کے دفتر میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا تھا۔ شکیل، اشفاق اور مروت اپنے منافع کی رقم لینے قاضی کے دفتر پہنچے تھے۔ جب قاضی نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تو وہ دنگا فساد پر اتر آئے۔ ازاں بعد قاضی نے انہیں پولیس کے حوالے کر دیا۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے منافع کی رقم سے غرض تھی۔ قاضی نے مجھے یقین دلایا کہ اگر میں اس کے گھر پر آ جاؤں تو مجھے رقم مل جائے گی۔ اسی لئے میں نے اس کی بات مان لی تھی۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گویا تمہیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ شکیل، اشفاق اور مروت کی رقم انہیں ملتی ہے یا نہیں۔“

”ہر شخص کو اپنے معاملات سے مطلب رکھنا چاہئے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ان لوگوں نے مجھ سے پوچھ کر تو اپنی رقم قاضی کے پاس نہیں پھنسائی تھی۔“

میں اپنے سوالات کے ذریعے آہستہ آہستہ قاضی کا اصلی چہرہ عدالت کے سامنے لا رہا تھا اور

میں نے دیکھا کہ جج گہری دلچسپی سے جرح سن رہا تھا اور گاہے بگاہے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ملزم سے سوال کیا۔

"مسٹر خلیل! میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ انسان کو دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ ایک طرح سے تمہارا یہ کہنا بھی درست ہے کہ انہوں نے تمہارے مشورے سے اپنی رقم انویسٹ نہیں کی تھی لیکن تم نے اس سلسلے میں ضرور ایک شخص کے مشورے پر عمل کیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔" وہ رسانیت سے بولا۔ "شکیل نے مجھے قاضی قیوم اور اس کی انویسٹ منٹ کمپنی سے متعارف کرایا تھا اور اس بات کو صرف تین ماہ گزرے تھے کہ میں اس ناگہانی افتاد کا شکار ہو گیا۔ اس سے پہلے میں قاضی اور اس کے فراڈ کاروبار کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "جناب عالی! قاضی قیوم اس معاشرے کا ایک معزز کاروباری شخص ہے۔ وکیل صفائی اس کے بزنس کو فراڈ ثابت کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟"

میں نے وکیل سرکار کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میرے فاضل دوست! اب مجھے یقین ہو گیا کہ آج آپ عدالت میں موجود نہیں ہیں۔ آپ کا دھیان کسی اور محاذ پر برسر پیکار ہے۔"

میں اتنا کہہ کر رکا تو وکیل استغاثہ کھا جانے والی نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میں وکیل استغاثہ کی اس کیس میں عدم دلچسپی کا ذکر کر رہا ہوں۔ انہوں نے......"

وکیل استغاثہ نے مجھے پوری بات نہ کرنے دی اور بیچ میں بول اٹھا۔ "کیسی عدم دلچسپی؟"

اب میں نے روئے سخن وکیل مخالف کی جانب موڑ لیا۔ "میرے فاضل دوست! ذرا غور سے میری بات سنیں۔ آپ نے اعتراض اٹھایا ہے کہ میں یعنی وکیل صفائی قاضی قیوم کے بزنس کو فراڈ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جب کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ "فراڈ کاروبار" کے الفاظ میرے موکل اور اس کیس کے ملزم کی زبان سے ادا ہوئے ہیں اور دوسری بات......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ ہم اس وقت قاضی صاحب کے خفیہ بزنس کا ذکر کر رہے ہیں۔ آف دی ریکارڈ بزنس!"

وکیل استغاثہ بلبلا اٹھا۔ "مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! اس وقت معزز عدالت میں نوشابہ مرڈر کیس کی سماعت چل رہی ہے۔ لیکن وکیل صفائی قاضی قیوم کے بزنس کو زیر بحث لا کر نہ صرف معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں بلکہ اس کیس کو کسی دوسرے رخ پر ڈالنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔"

ایسا محسوس ہو رہا تھا، میں نے بے خیالی میں اس کی دکھتی ہوئی رگ کو دبا ڈالا تھا۔ وہ بڑے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میں نے اس کے جلتے ہوئے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ میرا مخاطب جج تھا۔

"یور آنر! جیسا کہ معزز عدالت کے علم میں یہ بات لائی جا چکی ہے کہ میرا موکل اپنے منافع کی رقم وصول کرنے مقتول کے بنگلے پر پہنچا تھا۔ ملزم خلیل نے قاضی کے آف دی ریکارڈ بزنس میں تین لاکھ کی خطیر رقم انویسٹ کر رکھی تھی۔ یہ وہ بزنس ہے جس کے فراڈ ہونے کا ذکر ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس انویسٹ منٹ بزنس کو چیک کئے بغیر نوشابہ مرڈر کیس پر بات نہیں ہو سکتی۔"

وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔ "جناب عالی! قاضی صاحب ایک صاف ستھرا کاروبار کرتے ہیں۔ "قاضی ٹریڈنگ کمپنی" کے نام سے ان کا بزنس کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی کمپنی رجسٹرڈ ہے اور ہر سال یہ باقاعدگی کے ساتھ حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر اپنے الفاظ میں اعتماد بھرتے ہوئے بولا۔

"پتہ نہیں، وکیل صاحب کون سے آف دی ریکارڈ بزنس کا شوشہ چھوڑ رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، آپ "قاضی انویسٹرز" کے وجود سے انکاری ہیں؟"

"یہ آپ کے ذہن کی اختراع ہو سکتی ہے۔"

"سوچ لیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ ایک بہت بڑی حقیقت سے نظر چرا رہے ہیں!"

وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔ "وکیل صاحب! آپ تو ویسے بھی کہانیاں گھڑنے کے لئے مشہور ہیں۔ یہ عدالت ہے، یہاں فکشن نہیں چلے گا۔"

جج کو مجبوراً مداخلت کرنا پڑی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! قاضی ٹریڈنگ کمپنی اور قاضی انویسٹرز کی کیا حقیقت ہے؟"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "یور آنر! قاضی ٹریڈنگ کمپنی کی وہی حیثیت ہے حقیقت ہے جو میرے فاضل دوست نے بیان فرمائی ہے۔ لیکن "قاضی انویسٹرز" قاضی قیوم کا ایک آف دی ریکارڈ بزنس ہے جو فراڈ ثابت ہو رہا ہے۔ قاضی قیوم بھاری منافع کا لالچ دے کر لوگوں سے بڑی بڑی رقوم اینٹھ لیتا ہے۔ دو تین ماہ منافع بھی دیتا ہے لیکن اس کے بعد ٹائیں ٹائیں فش۔ اس فراڈ بزنس سے متاثرہ افراد کی چار مثالیں تو ہمارے سامنے ہیں۔"

میں نے تھوڑا توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! اشفاق حسین نے پانچ لاکھ روپے انویسٹ کئے اور اسے صرف دو ماہ منافع ملا۔ مروت شاہ کے چار لاکھ قاضی کی کمپنی میں لگے ہوئے ہیں۔ تین ماہ تک منافع حاصل کرنے کے بعد وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے۔ شکیل نے دو لاکھ پھنسائے اور صرف تین ماہ منافع حاصل کر سکا۔ شکیل کی سرکردگی میں جب مروت شاہ اور اشفاق حسین قاضی کے دفتر رقم وصول کرنے گئے تو اس ظالم شخص نے انہیں پولیس کے حوالے کر دیا اور میرا موکل......"

میں نے بات نامکمل چھوڑتے ہوئے قاضی قیوم کی طرف دیکھا۔ وہ عدالت کے کمرے میں موجود تھا اور اس کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ "جناب عالی! جب میرا موکل قاضی کے بلانے پر اس کے گھر پہنچا تو وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ میرا موکل مقتول کی بات کا یقین کر کے اپنی دکان پر چلا گیا۔ پھر قاضی کی فرمائش پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جناب عالی! میرے موکل کی گرفتاری ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس سادہ طبیعت شخص کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

جج نے میری بات پوری توجہ سے سنی پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "وکیل صاحب! کیا قاضی قیوم صاحب اس وقت عدالت میں حاضر ہیں؟"

وکیل استغاثہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک جانب اشارہ کر دیا جدھر قاضی بیٹھا تھا۔

آئندہ ایک منٹ کے اندر، قاضی قیوم جج کی ہدایت پر وٹنس باکس میں کھڑا نظر آ رہا تھا۔ جج نے حلف کی روایتی کارروائی مکمل کروانے کے بعد اسے "قاضی انویسٹرز" کے بارے میں سوال کیا۔

"جناب عالی!" قاضی نے پُر احترام انداز میں جواب دیا۔ "میری صرف ایک کمپنی ہے جو "قاضی ٹریڈنگ کمپنی" کے نام سے ایک صاف ستھرا کاروبار کرتی ہے۔ "قاضی انویسٹرز" جیسی الزامی کہانیوں سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں۔ یہ سراسر جھوٹ اور فرضی قصہ ہے۔"

قاضی کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ وکیل استغاثہ نے اپنی افادیت ظاہر کرنا ضروری سمجھا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جناب عالی! بیگ صاحب اس قسم کے حربوں کے لئے بہت مشہور ہیں۔ یہ فیکٹ اور فکشن کی آمیزش سے بڑی دلچسپ کہانیاں گھڑنے کے ماہر ہیں جس کا مطلب صرف اور صرف عدالتی کارروائی کو الجھانا ہوتا ہے۔"

"شکریہ میرے فاضل دوست!" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

جج نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "بیگ صاحب! آپ کس بات کے لئے ان کا شکریہ ادا کر رہے ہیں؟"

"یور آنر! وکیل استغاثہ نے مجھے متعارف کرواتے وقت اس مرتبہ کافی رعایت سے کام لیا

ہے۔" میں نے اپنا ذومعنی انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے فکشن پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ فیکٹ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ گویا میری گھڑی ہوئی کہانیوں میں حقیقت کی نمایاں جھلک موجود ہوتی ہے۔"

جج نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ اگر اس موضوع پر مزید بات کی گئی تو عدالت کا قیمتی وقت ضائع ہونے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہو گیا اور گفتگو کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔

"بیگ صاحب! قاضی قیوم تو "قاضی انویسٹرز" نامی کسی فرم کا اقرار یا اعتراف نہیں کر رہے۔ کیا آپ اس فرم کا وجود ثابت کر سکتے ہیں؟"

"دستاویزاتی طور پر تو یہ ممکن نہیں۔" میں نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "فراڈ کا بزنس حاصل کرنے والے گرگ باراں دیدہ اور کائیاں افراد پکڑ دھکڑ لانے والا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے۔ وہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتے ہیں۔ ان کی پیش کش اتنی پُرکشش ہوتی ہے کہ شکار آنکھیں اور زبان بند کر کے ان کے سنہری جال میں پاؤں ڈال دیتا ہے، جیسا کہ قاضی صاحب نے کیا۔"

میں نے تھوڑا توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پاکستان میں کام کرنے والی سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ انویسٹ منٹ کمپنیوں میں سے کوئی بھی اتنا بھاری منافع نہیں دیتی جتنا قاضی قیوم دے رہا تھا...... یعنی دس فی صد ماہانہ۔ اٹ از ٹو مچ!" میں نے کندھے اچکائے اور کہا۔ "اس قدر بھاری منافع بہت ہی دل فریب نظر آتا ہے اور جس شخص کے پاس رقم رکھی ہو، وہ اس لالچ میں آ کر فوراً انویسٹ منٹ کے بارے میں سوچتا ہے جیسا کہ شکیل، خلیل، مروت اور اشفاق نے کیا۔ انہوں نے "قاضی انویسٹرز" کے بارے میں کسی تحقیق یا تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بغیر کسی پکے ایگری منٹ کے، اپنی بڑی بڑی رقمیں قاضی قیوم کے پاس پھنسا دیں...... اور یہ قاضی صاحب اب اپنی یادداشت میں سے یہ باب ہی گول کر چکے ہیں۔"

وکیل استغاثہ نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ "یور آنر!" وہ جج کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں پر وکیل صفائی کے ایک فرمان کو دہرانے کی اشد ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔" اس کا انداز نہایت ہی زہریلا اور طنز بھرا تھا۔ گمبھیر آواز میں اس نے کہنا شروع کیا۔

"جناب عالی! میرے فاضل دوست کے مطابق جب تک کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے، گرفت میں آیا ہوا شخص ملزم کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ مجرموں والا سلوک ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ چند لمحات کے لئے خاموش ہوا پھر اپنے زور بیان کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب نے اس کیس کے مدعی قاضی قیوم پر "قاضی انویسٹرز" کے حوالے سے فراڈ کا جو الزام لگایا ہے، وہ اسے ثابت کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ ان کے پاس "قاضی انویسٹرز"

اور اس فرضی پلیٹ فارم سے ہونے والے کاروبار کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں، لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ اس کیس کی سماعت کے دوران میں آئندہ ''قاضی انویسٹرز'' کا تذکرہ نہیں ہونا چاہئے۔''

میں وکیل استغاثہ کی بدمعاشی کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ میری کمزوری کو ایشو بنانے پر تلا ہوا تھا۔ قاضی قیوم نے انویسٹ منٹ کے فراڈ بزنس میں بڑی چال بازی سے کام دکھایا تھا۔ مثلاً کلائنٹ سے رقم وصول کرتے وقت ایک سادہ کاغذ پر صرف اتنا لکھ کر دیا تھا...... ''میں نے مبلغ...... لاکھ روپے، محترم...... سے وصول پائے۔'' اس مختصر سی تحریر کے نیچے اس نے اپنے دستخط بھی کئے تھے اور وہ دستخط بھی بوگس تھے۔ میری تحقیق کے مطابق وہ دستخط ''قاضی ٹریڈنگ کمپنی'' میں استعمال ہونے والے قاضی قیوم کے دستخط سے قطعی مختلف تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انگریزی کا حرف ''Q'' لکھنے کے بعد کسی اسپرنگ کو کھول کر چھوڑ دیا گیا ہو۔ پھر اس تحریر سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ رقم قاضی نے اپنے کلائنٹ سے کس ذیل میں وصول پائی تھی۔ یہ بھی مطلب نکالا جا سکتا تھا کہ قاضی قیوم سے وہ رقم مذکورہ شخص کو دے رکھی تھی جو اس نے واپس دے دی۔ الغرض اس تحریر کو عدالت میں پیش کر کے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وکیل استغاثہ کی بات کے اختتام پر جج سوالیہ نگاہ سے مجھے تکنے لگا تو میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میرا موکل خلیل اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں شکیل، اشفاق اور مروت کو بھی پیش کر سکتا ہوں۔ ''قاضی انویسٹرز'' کے فراڈ بزنس کے خلاف شخصی گواہی ہی سے کام چلایا جا سکتا ہے۔''

وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کی۔ ''جناب عالی! میں ایک مرتبہ پھر معزز عدالت کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ یہاں نوشابہ مرڈر کیس کی کارروائی ہو رہی ہے۔ ''قاضی انویسٹرز'' جیسی کسی فرضی فرم کا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے فاضل دوست اگر قاضی انویسٹرز نامی اس غیر موجود فرم سے کوئی نادیدہ اور غیر مرئی پرخاش رکھتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ اس کمپنی کے فراڈ بزنس کے سلسلے میں ایک علیحدہ مقدمہ دائر کریں تاکہ متاثرین کو انصاف مہیا ہو سکے!'' وہ ایک لمحے کا توقف کر کے بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال میں سمجھتا ہوں کہ وکیل صفائی کیس میں پیچیدگی پیدا کر کے اسے کسی اور ڈگر پر ڈالنا چاہتے ہیں لہٰذا انہیں اس کوشش سے باز رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔ دیٹس آل یور آنر!''

وکیل استغاثہ کی بات میں چونکہ وزن تھا اس لئے جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ ''قاضی انویسٹرز'' کے ذکر کو پسِ پشت ڈال کر نوشابہ مرڈر کیس کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔''

''او کے...... یور آنر!'' میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

پھر عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ دس روز بعد ہمیں ایک مرتبہ پھر اس عدالت میں پیش ہونا تھا۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ''قاضی انویسٹرز'' کے فراڈ بزنس کا تذکرہ براہِ راست میرے موکل کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر نوشابہ کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ میں صرف اس تذکرے سے قاضی کی شخصیت کا دوسرا رخ عدالت کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ ورنہ اپنے موکل کو کس طرح باعزت بری کروانا تھا اس کے لئے میں نے پوری طرح لائحہ عمل بنا رکھا تھا۔ بعض اوقات غیر ضروری باتوں میں سے بھی کوئی اہم نکتہ ہاتھ آ جاتا ہے۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو خلیل کی والدہ انیسہ بیگم میرے ساتھ تھی۔ عدالتی کارروائی ختم ہونے پر جیل کی مخصوص گاڑی خلیل کو اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔

انیسہ باتیں کرتے ہوئے میرے ساتھ گاڑی تک چلی آئی۔ میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اس نے کہا۔ ''وکیل صاحب! کیا عدالت کی کارروائی ایسے ہی ٹھنڈی ہوتی ہے...... میرا مطلب ہے سست!''

''اس سے زیادہ سست اور بورنگ بھی ہو سکتی ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''شاید پہلے کبھی آپ کو عدالت میں آنے کا اتفاق نہیں ہوا!''

''یہ پہلا موقع ہے وکیل صاحب!'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''خدا سے ہر وقت یہی دعا کرتی ہوں یہ آخری موقع بھی ثابت ہو۔''

میں نے رسانیت سے کہا۔ ''تھانہ کچہری واقعی اچھی جگہیں نہیں ہیں۔ آپ اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے زیادہ سے زیادہ دعا کیا کریں۔ ماں کی دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

''وہ تو میں کرتی ہی رہتی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ پھر پوچھا۔ ''کیا آپ عدالتی کارروائی سے مطمئن ہیں؟''

''پوری طرح مطمئن ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھروسا رکھیں، آپ کا بیٹا بہت جلد رہا ہو جائے گا۔''

''لیکن......'' وہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''جج نے انویسٹ منٹ کے معاملے پر ذرا توجہ نہیں دی۔ ''میرے تین لاکھ قاضی کے پاس پھنسے ہوئے ہیں۔''

''تین لاکھ نہیں، دو لاکھ چالیس ہزار کہیں۔'' میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''دو ماہ میں منافع کی صورت میں آپ نے ساٹھ ہزار وصول کر لئے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے لئے رقم اہم ہے یا بیٹا؟''

میرے سوال نے اسے جھنجوڑ دیا، گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ظاہر ہے، خلیل میرے

لئے سب سے زیادہ اہم ہے!"

"تو پھر پھنسی ہوئی رقم کو فی الحال بھول جائیں۔" میں نے دوٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "رقم والا معاملہ نہایت ہی کمزور ہے، اس پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔ اگر سر دست میں اس معاملے کے پیچھے پڑ گیا تو خلیل کی رہائی کھٹائی میں گر جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ جیسے مناسب سمجھیں، کیس کو آگے بڑھائیں۔ میں تو اپنے بیٹے کو جلد از جلد آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ رقم گئی بھاڑ میں۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا!" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئی، یہ پوچھے بغیر کہ میرا وہ وثوق خلیل کی رہائی سے متعلق تھا یا رقم کے بھاڑ میں جانے کے بارے میں!

❁❁❁

شکیل بہت ہی شاطر اور چلتا پرزہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا کردار گھڑ دوڑ کے جانور ایسا تھا جو پیٹھ پر سوار شخص کی ہدایت پر سرپٹ دوڑا چلا جاتا ہے۔ وہ میرے اشاروں پر بالکل درست سمت میں کامیاب حرکت کر رہا تھا۔ میری مطلوبہ معلومات مجھ تک پہنچانے میں وہ کسی کوتاہی یا تاخیر کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اس مشن میں مروت شاہ اور اشفاق حسین کو بھی اپنے ساتھ گانٹھ رکھا تھا۔ اس نے انہیں یقین دلایا تھا کہ ایک بار خلیل کا معاملہ نمٹ جائے تو پھر وہ سب مل کر قاضی قیوم کے خلاف فراڈ کا مقدمہ دائر کریں گے۔ اس یقین دہانی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا تاہم شکیل ایک مرتبہ ان دونوں کو مجھ سے ملوانے کے لئے دفتر بھی لے آیا تھا۔ میں نے ان سے مختصر سی ملاقات کی تھی۔ شکیل نے بعد میں مجھے بتایا کہ مروت شاہ اور اشفاق حسین اس کی بھرپور مدد کر رہے تھے۔

آئندہ پیشی پر میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔ انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت میں حاضر ہونے کا پابند ہوتا ہے۔ وہ گواہوں والے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا تو میں مذکورہ کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

"آئی۔ او صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

میں اس کے نام سے واقف تھا۔ وہ سوال میں نے محض تفریح طبع کی خاطر کیا تھا۔ وہ بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

"میرا نام وحید اللہ ہے...... انسپکٹر وحید اللہ!"

"انسپکٹر صاحب!" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "استغاثہ کے

مطابق اس واردات کی اطلاع آپ کو بائیس مارچ کے روز دوپہر ساڑھے گیارہ بجے دی گئی۔ آپ یہ سنسنی خیز اطلاع پا کر لگ بھگ بارہ بجے جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ آپ کو کس نے اطلاع دی تھی؟ کیا اطلاع دی تھی؟ کیسے اطلاع دی تھی؟"

"یہ تو ایک نہیں تین سوال ہو گئے۔" وہ قدرے ناگواری سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ "چلیں کوئی بات نہیں۔ آپ باری باری ان کا جواب دے دیں۔"

"قتل کی اس واردات کی اطلاع دینے والا مقتول کا شوہر قاضی قیوم تھا۔" آئی۔ او نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اطلاع بذریعہ فون دی گئی اور ہمیں بتایا گیا کہ خلیل نامی ایک شخص نے قاضی صاحب کی بیوی نوشابہ کو قتل کر دیا ہے۔"

"تھینک یو انسپکٹر صاحب!" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر کیا دیکھا؟"

"اس کا تفصیلی ذکر پولیس چالان میں موجود ہے۔" وہ رکھائی سے بولا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "معزز عدالت آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہے۔ اگر آپ کو اس سلسلے میں کوئی اعتراض ہو تو بتائیں؟"

جج نے تفتیشی افسر سے پوچھا۔ "اعتراض کی کوئی گنجائش نکلتی ہے؟"

"نو سر!" وہ باادب باملاحظہ ہوشیار ہوتے ہوئے جلدی سے بولا، پھر میری جانب رخ پھیر کر بتانے لگا۔

"قاضی صاحب کا پورا بنگلا الٹا پڑا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہاں کسی خاص شے کی تلاش کی گئی ہو۔ اسے ڈکیتی کی واردات بھی کہا جا سکتا تھا کیوں کہ مالک مکان یعنی قاضی قیوم کے مطابق وہاں سے کچھ بھی نہیں گیا تھا البتہ......" وہ لمحہ بھر کو سانس کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "البتہ قاضی کی بیوی نوشابہ کی لاش ڈرائنگ روم کے فرش پر موجود تھی۔"

"ہوں......" میں نے فائل پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت دس بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی...... اور اس موت کا سبب گلا گھونٹنا بتایا گیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔"

اس کے اسٹائل سے ظاہر تھا، وہ میرے سوال کی گہرائی تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ میں نے استفسار کیا۔ "انسپکٹر وحید اللہ صاحب! کیا آپ نے مقتول کی گردن پر سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارنے کی صورت میں یہ از حد ضروری تھا۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں، ہم نے فنگر پرنٹس لینے کی کوشش کی تھی۔"

"لیکن آپ کی تیار کردہ رپورٹ میں تو اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا؟"

"دراصل...... بات یہ ہے کہ......" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "ہمیں فنگر پرنٹس حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ قاتل نے واردات کے وقت دستانے پہن رکھے تھے۔"

"مگر ان دستانوں یا فنگر پرنٹس کے حصول میں ناکامیابی کا بھی کہیں اندراج نہیں کیا گیا۔ کیوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے پوچھا۔

"شاید یہ بات رپورٹ میں شامل ہونے سے رہ گئی۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "شاید نہیں یقیناً!" پھر استغاثہ کے حامی یعنی وکیل سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ استغاثہ کی خامی بلکہ ایک فاش غلطی ہے۔"

انکوائری آفیسر پہلو بدل کر رہ گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "وحید اللہ صاحب! جیسا کہ آپ نے ابھی ذکر کیا اور استغاثہ کی رپورٹ میں بھی یہ بات شامل ہے کہ جائے وقوعہ قتل اور ڈکیتی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس صورت میں پورے بنگلے میں سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی ضرورت تھی۔ آپ نے اس سلسلے میں کیا کارروائی ڈالی تھی؟"

"میں نے تمام اہم مقامات سے فنگر پرنٹس حاصل کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔" وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔ "لیکن ایک ہی نتیجہ سامنے آیا کہ وارداتی نے اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے۔ گھر کے افراد کے سوا کسی اجنبی کے فنگر پرنٹس دستیاب نہ ہو سکے۔"

"گھر کے افراد میں آپ کس کس کو شامل کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"قاضی قیوم، اس کی بیوی مقتول نوشابہ اور دو ملازمائیں یعنی ماسی رشیدہ اور اس کی بیٹی ثمینہ۔" اس نے جواب دیا۔

میری معلومات کے مطابق یہ دونوں ماں بیٹی وقوعہ کے روز جائے واردات پر موجود نہیں تھیں۔ رشیدہ بیمار تھی اور ثمینہ نے اس کی نگہداشت کے لئے چھٹی کی تھی۔ رشیدہ نامی وہ ادھیڑ عمر عورت صبح دس بجے سے تین بجے سہ پہر تک بنگلے میں کام کرتی تھی اور اس کی بارہ سالہ بیٹی ثمینہ کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ان دونوں کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا معمول کی بات تھی۔

میں نے انکوائری آفیسر پر اپنی جرح کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے سوال کیا۔ "جائے وقوعہ کے معاملات نمٹانے کے بعد آپ نے کیا، کیا؟"

"ہم نے ملزم خلیل کو اس کی دکان سے گرفتار کر لیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"آپ کو یہ بات کیسے پتہ چلی کہ ملزم اس وقت اپنی دکان پر ہوگا؟"

"یہ بات مجھے قاضی قیوم نے بتائی تھی۔"

"اور دکان کا ایڈریس؟"

"وہ بھی اسی نے!"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے تیز آواز میں کہا۔

اگلی گواہی عدیل خان نامی ایک شخص کی تھی۔ عدیل خان پان سگریٹ اور کولڈ ڈرنکس کی ایک دکان چلاتا تھا جس میں آئس کریم بھی دستیاب تھی۔ "شاداب کولڈ کارنر" کے نام سے موسوم یہ دکان اس گلی کے سرے پر واقع تھی جس میں قاضی قیوم کا بنگلہ تھا۔

استغاثہ کے گواہ عدیل خان کی عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہوگی۔ وہ مضبوط بدن کا مالک ایک گورا چٹا اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ پھر وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے کٹہرے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے گواہ سے سوال کیا۔

"عدیل صاحب! وقوعہ کے روز یعنی بائیس مارچ کو آپ اپنی دکان پر موجود تھے؟"

"جی ہاں۔ میں پورا دن اپنی دکان پر ہی ہوتا ہوں۔"

"اس روز آپ نے ملزم کو دیکھا تھا؟"

گواہ نے کٹہرے میں کھڑے میرے موکل کو ایک بھرپور نظر سے دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں میں نے اس شخص کو قاضی صاحب کے بنگلے کے پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا انداز خاصا مشکوک تھا۔"

وکیل استغاثہ نے اسی قسم کے دو چار اور سوالات کئے اور جرح ختم کر دی۔ اس کا مطلب صرف یہ واضح کرنا تھا کہ ملزم وقوعہ کے روز مشکوک انداز میں مقتول کے بنگلے کے نزدیک پایا گیا تھا۔ میں اپنی باری پر آگے بڑھا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"عدیل خان صاحب! مذکورہ گلی میں آپ کی دکان کتنے عرصے سے ہے؟"

"لگ بھگ دس سال سے۔"

"آپ قاضی صاحب کو تو اچھی طرح جانتے ہوں گے؟"

"جی ہاں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"کبھی آپ نے ان کے پاس رقم انویسٹ کرنے کی کوشش بھی کی؟"

"نہیں جناب، مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔" وہ سادگی سے بولا۔ "بلکہ میں تو یہ بھی نہیں جانتا قاضی صاحب اس قسم کا کوئی کاروبار بھی کرتے ہیں۔"

اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ فراڈ کا کاروبار کرنے والے اپنے رہائشی علاقے کو متاثر نہیں کرتے تاکہ ان کی ریپوٹیشن سلامت رہے۔ میں نے گواہ سے اگلا سوال کیا۔

"پھر آپ قاضی صاحب کے کس قسم کے کاروبار سے واقف ہیں؟"

"وہ کسی کمپنی کے مالک ہیں۔" اس نے بتایا۔

"مثلاً کون سی کمپنی؟"

"کمپنی کی تفصیل تو مجھے معلوم نہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس سے تو ظاہر ہوتا ہے، آپ قاضی قیوم کے کاروبار کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے!"

وہ کچھ نہیں بولا اور خاموش نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے جرح کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ "خان صاحب! آپ ملزم کو جانتے ہیں؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"اس کا مطلب ہے آپ نے وقوعہ کے روز سے پہلے یا بعد میں ملزم کو کہیں نہیں دیکھا؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ کی بات جزوی طور پر درست ہے وکیل صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں نے بائیس مارچ سے پہلے اس شخص کو کہیں نہیں دیکھا تھا اور اس کے بعد آج دوبارہ دیکھ رہا ہوں۔"

"آپ نے اچھی طرح پہچان لیا کہ ملزم وہی شخص ہے جو وقوعہ کے روز مقتول کے بنگلے کے پاس منڈلا رہا تھا اور وہ بھی خاصے مشکوک انداز میں؟"

"جی ہاں، یہ وہی شخص ہے۔" وہ بہ غور میرے موکل کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"آپ کی قوتِ مشاہدہ اور حافظہ قابلِ تحسین ہے۔" میں نے ذو معنی انداز میں کہا پھر جلدی سے پوچھا۔ "آپ کی دکان مقتول کے بنگلے سے کتنے فاصلے پر ہے؟"

میں ایک روز شام میں اس گلی کا چکر لگا چکا تھا اور وہاں کی تفصیلات مجھے ازبر ہو گئی تھیں۔

استغاثہ کے گواہ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"میری دکان اس بنگلے سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر واقع ہو گی۔" اس کا جواب درست تھا۔

"آپ کی دور کی نگاہ کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک ہے!"

"ابھی تجربہ کر لیتے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

جج سمیت حاضرین عدالت مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے عدالت کے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر اشارہ کیا۔ وہاں سے باہر کا منظر دکھائی دیتا تھا اور وہاں سے وٹنس باکس اس دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ میں نے استغاثہ

کے گواہ کو مخاطب کیا اور پوچھا۔

"خان صاحب! وہ برآمدے سے آگے، درخت کے نزدیک ایک صاحب کسی وکیل صاحب سے بات کر رہے ہیں۔ وکیل صاحب تو اپنے مخصوص پہناوے کے باعث پہچانے جا رہے ہیں لیکن دوسرا شخص جو کوئی بھی ہے اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی ہے۔ اس کے کالر میں ایک ٹائی بھی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا آپ اس ٹائی کا رنگ بتا سکتے ہیں؟"

وہ حد درجہ پریشان نظر آنے لگا پھر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے وہ ٹائی گرے کلر ہے...... آں، نہیں۔ ٹائی بلیک ہے...... اوں ہوں، ڈارک گرین......"

وہ اچانک خاموش ہو کر خجالت آمیز انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "خان صاحب! اس وقت آپ کے اور اس ٹائی والے شخص کے درمیان بہ مشکل ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ حائل ہو گا اور آپ اس کی ٹائی کا رنگ بتاتے ہوئے اتنے پریشان ہیں کہ ایک لمحے کے فرق سے آپ نے تین مختلف جواب دے ڈالے؟"

"وہ دراصل میں ذرا کنفیوز ہو رہا ہوں۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

میرا انداز یک لخت جارحانہ ہو گیا۔ "عدیل صاحب! کیا وقوعہ کے روز ملزم نے آپ کی دکان سے کوئی پان سگریٹ خریدا تھا؟"

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کوئی کولڈ ڈرنک یا آئس کریم؟" میں نے وار جاری رکھا۔

اس نے نفی میں جواب دیا۔

"آتے جاتے آپ کو سلام کیا ہو؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "حال احوال پوچھا ہو یا آپ کی دکان پر رک کر گپ شپ لگائی ہو؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، میں کس قسم کے سوالات پوچھ رہا ہوں۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں وکیل صاحب!"

"آپ کی دکان خوب چلتی ہے یا بیٹھے کھیاں مارتے رہتے ہیں؟"

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کراری آواز میں بولا۔ "الحمدللہ! دکان تو ماشاءاللہ ایسی چلتی ہے کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ ہر وقت گاہکوں میں گھرا رہتا ہوں۔" اس کی گھبراہٹ خاصی حد تک زائل ہو چکی تھی۔

میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ "ملزم کے خلاف گواہی دینے کے لئے آپ نے اتنی رقم وصول کی ہے؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے کہا پھر وہ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ "وکیل صفائی معزز گواہ پر رشوت کا الزام لگا کر اسے ہراساں کرنے

کی کوشش کر رہے ہیں۔انہیں ایسی حرکت سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔"

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔"میں نے تو ایک منطقی بات کی ہے،اس میں الزام کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟ اور......خدانخواستہ معزز گواہ کو ہراساں بھی نہیں کر رہا!"

"آپ نے کیا منطقی بات کی ہے؟" وکیل استغاثہ بھڑک کر بولا۔

جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"بیگ صاحب! آپ اپنی بات کی وضاحت کریں۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔"جناب عالی! حقائق بہت تلخ اور کڑوے ہوتے ہیں۔حقیقت کو تسلیم کرنا بڑے ظرف کی بات ہے ورنہ عام لوگ تو سچی بات سنتے ہی ناچ اٹھتے ہیں۔" میں نے طنزیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور اپنا بیان جاری رکھا۔

"جناب عالی! ابھی معزز عدالت کے سامنے ایک چھوٹا سا تجربہ کیا گیا ہے۔لگ بھگ ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے گواہ ٹائی کے رنگ کے بارے میں کوئی حتمی جواب نہیں دے سکا لیکن دو سو گز کی دوری سے اس کا مشاہدہ بہت کمال رہا ہے۔گواہ کی دکان اور مقتول کے بنگلے کے درمیان دو سو گز کا فاصلہ ہے اور یہ بات تھوڑی دیر پہلے گواہ ہی نے معزز عدالت کو بتائی ہے۔"

میں نے تھوڑا توقف کر کے وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! استغاثہ کا گواہ عدیل خان اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ وہ ملزم کو نہیں جانتا۔وقوعہ کے روز گواہ نے پہلی مرتبہ ملزم کو دیکھا اور وہ بھی دو سو گز کے فاصلے سے۔ملزم نے اس کی دکان سے کسی قسم کی خریداری کی اور نہ ہی کسی موضوع پر بات چیت،اس کے باوجود بھی گواہ نے بہ خوبی اندازہ لگا لیا کہ ملزم بڑے مشکوک انداز میں مقتول کے بنگلے کے نزدیک منڈلا رہا تھا جبکہ گواہ اس بات کا بھی دعوے دار ہے کہ وہ اپنی دکان میں اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ اسے سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی!" میں نے تھوڑی دیر خاموش ہو کر ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! ایک ایسا شخص جو اپنے کام دھندے میں بے حد مصروف ہو،وہ دو سو گز کے فاصلے سے کسی اجنبی کو ایک نظر دیکھ کر یہ اندازہ کیسے لگا سکتا ہے کہ اس کا منڈلانا مشکوک ہے اور وہ کسی بری نیت کے ارادے سے وہاں پہنچا ہے۔واضح رہے کہ یہ وہی شخص ہے جو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے ایک ٹائی کے رنگ میں تمیز کرنے سے قاصر ہے اور وہ بھی بہ غور دیکھنے کے بعد!"

"جناب عالی! سچ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔اگر استغاثہ گواہ عدیل خان کسی دباؤ کے تحت گواہی نہیں دے رہا تو پھر یہ سب کیا ہے؟ حالات اور واقعات آپس میں لگا کیوں نہیں کھاتے؟ گواہ کا دعویٰ حقیقت سے کوسوں دور کیوں نظر آتا ہے؟ اگر استغاثہ کا گواہ ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے ٹائی کا رنگ واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تو دو سو گز کے فاصلے سے ایک اچٹتی سی نگاہ میں

ملزم کی کیفیت کو کیسے بھانپ سکتا ہے۔ہاؤ کین اِٹ پاسیبل؟"

بات کے اختتام پر میں نے دونوں ہاتھ پھیلانے والے انداز میں بلند کئے اور معنی خیز نظر سے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کندھے اچکا دیئے۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

✪✪✪

وٹنس باکس میں کنول کھڑی تھی!

اس نے خوبصورت لباس زیب تن کر رکھا تھا جو اس کے حُسن میں اضافہ کا باعث تھا۔اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی تاہم وہ اپنی عمر سے خاصی کم دکھائی دیتی تھی۔مٹاپا عام طور پر حُسن کو متاثر کرتا ہے مگر کنول کی فربہی نے اس کے سراپا میں بے پناہ کشش بھر دی تھی۔وہ متجاوز البدن اور متناسب الاعضا کا حسین سنگم تھی۔

کنول نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اس کا مختصر سا بیان ریکارڈ کیا گیا۔اس بیان میں حتیٰ الامکان قاضی قیوم کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ایک طرح سے یہ سلیمنٹ اور کمپلیمنٹ اضافہ تھا۔

وکیل استغاثہ جرح کے لئے آگے بڑھا اور کنول والے کٹہرے کے نزدیک جا کر اس نے گواہ سے سوال کیا۔

"کنول صاحبہ! آپ "قاضی ٹریڈنگ کمپنی" میں کتنے عرصے سے کام کر رہی ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔"پانچ سال سے۔"

"آپ کے کام کی نوعیت کیا ہے؟"

"میں بہ یک وقت بہت سے کام دیکھتی ہوں۔" اس نے رسانیت سے جواب دیا۔"قاضی صاحب کی سیکرٹری،ٹیلی فون آپریٹر،ریسپشنسٹ اور گائیڈ کے طور پر مجھے ہر قسم کا کام کرنا پڑتا ہے۔میری جاب بہت ٹف ہے۔"

"ویری گڈ۔" وکیل استغاثہ نے سراہنے والے انداز میں کہا۔"پھر تو آپ دفتری اوقات میں بہت مصروف رہتی ہوں گی اور آپ کی چھٹی پر بھی خاص طور پر پابندی ہو گی۔"

"ایسا ہی ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"کنول صاحبہ!" وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔"اس کا مطلب ہے وقوعہ کے روز بھی آپ یقینی طور پر دفتر میں حاضر ہوں گی؟"

"جی ہاں!"

"اس روز کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں گواہ کنول نے بتایا۔"ہمارے دفتری اوقات صبح دس

سے شام چھ بجے تک ہیں اور قاضی صاحب عموماً ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا اسٹاف کو ان کی آمد سے پندرہ بیس منٹ پہلے ہی حاضر ہونا پڑتا ہے۔'' وہ سانس لینے کے لئے ذرا رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی۔

''بائیس مارچ کی صبح بھی قاضی صاحب وقت پر دفتر آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گھر سے ان کی وائف کا فون آ گیا پھر آناً فاناً وہ دفتر سے روانہ ہو گئے۔''

''اس ایمرجنسی فون کی نوعیت کیا تھی؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

کنول نے بتایا۔ ''قاضی صاحب نے مجھے بتایا تھا، ان کے گھر میں کوئی ڈاکو گھس آیا تھا۔ وہ جس افراتفری میں رخصت ہوئے میں ان سے تفصیل نہ جان سکی۔ ازاں بعد پتہ چلا، خلیل نامی اس شخص نے میڈم نوشابہ کو قتل کر دیا۔'' بات کے اختتام پر اس نے ملزم کی جانب انگلی اٹھا دی۔

وکیل استغاثہ نے چند اسی قسم کے سوال پوچھ کر جرح ختم کر دی تو میں اپنی باری بھگتانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کنول صاحبہ!'' میں نے خوشگوار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟''

وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ ''آبجیکشن یور آنر! وکیل صفائی معزز گواہ کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی سوال پوچھنے کا حق نہیں رکھتے۔''

میں نے جج کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اگر کنول صاحبہ کو میرے استفسار پر کوئی اعتراض ہو تو میں اپنا سوال واپس لینے کو تیار ہوں...... اور وہ بھی دلی معذرت کے ساتھ۔'' بات کے اختتام پر میں نے مقام دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے گردن کو تھوڑا سا خم دیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' کنول دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑی شگفتگی تھی۔ ''میں آپ کے سوال کا جواب دیتی ہوں اور جواب یہ ہے کہ میں تاحال غیر شادی شدہ ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے آپ کو مس کنول کہا جا سکتا ہے؟''

''شیور!''

''مس کنول!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز قاضی قیوم کے دفتر پہنچتے ہی ان کی بیوی کا فون آ گیا تھا کہ گھر میں کوئی ڈاکو گھس آیا ہے جس کے نتیجے میں قاضی صاحب فوراً دفتر سے روانہ ہو گئے۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ اس روز مقتول سے فون پر آپ کی بات ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے کیا وہ کال آپ ہی نے ریسیو کی تھی؟''

''نہیں، وہ کال براہِ راست قاضی صاحب نے ریسیو کی تھی۔''

''آپ تو اس دفتر میں ٹیلی فون آپریٹر کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں، پھر؟''

وہ زود فہم اور موقع شناس تھی۔ میرے الجھے ہوئے سوال کو پلک جھپکتے میں سمجھ گئی۔ جواباً بولی۔

''دراصل ہمارے دفتر میں ٹیلی فون کی تین لائنیں ہیں۔ دو کا کنٹرول میرے ہاتھ میں ہے اور تیسری لائن قاضی صاحب کے کمرے میں ہے۔ قاضی صاحب کے سوا کسی اور کو اس فون کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔ میڈم نوشابہ نے اسی نمبر پر قاضی صاحب کو ڈکیتی کی اطلاع دی تھی۔''

اس کا جواب مدلل تھا۔ میں نے نئے زاویے سے اسے گھسنا شروع کیا۔ میں نے کٹہرے میں کھڑے اپنے موکل کی جانب اشارہ کیا اور اس سے پوچھا۔

''کنول صاحبہ! کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟''

''صرف اس حد تک کہ یہ شخص اس مقدمے کا ملزم اور مبینہ قاتل ہے۔''

وہ بڑی صفائی اور ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہی تھی بلکہ اس دروغ گوئی میں بلا کا اعتماد بھی تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص وقوعہ سے تین ماہ پہلے آپ کے دفتر آتا رہا ہے لیکن کبھی اکیلا اور کبھی اپنے مبینہ دوست شکیل کے ساتھ؟''

اس نے میری آنکھوں جھانکتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ نفی میں گردن ہلا دی۔

''آپ کو یہ تو یاد ہوگا، ملزم نے قاضی قیوم کے پاس کچھ رقم انویسٹ کر رکھی تھی؟''

''میں ایسے کسی معاملے سے واقف نہیں ہوں۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

''ہوں!'' میں چند لمحات تک خاموش نظر سے اسے گھورتا رہا۔ اس کے انداز و تیور سے واضح ہو گیا کہ وہ بھی قاضی کی سازش میں برابر کی شریک تھی اور مجھے امید نہیں تھی وہ ''قاضی انویسٹرز'' کے بارے میں ایک لفظ بھی بتا کر دے گی۔ لمحاتی سوچ بچار کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''مس کنول! اٹھارہ مارچ دوپہر کا وقت ذہن میں لائیں۔ وقوعہ سے چار روز پہلے شکیل دو افراد مروت شاہ اور اشفاق حسین کے ساتھ آپ کے دفتر میں آیا تھا اور ان لوگوں نے خاصی ہنگامہ آرائی کی تھی؟''

''ہاں، وہ واقعہ میرے ذہن میں روز اول کی طرح تازہ ہے۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''ان لوگوں نے بہت توڑ پھوڑ مچائی تھی چنانچہ بہ حالت مجبوری قاضی صاحب نے انہیں پولیس کے حوالے کر دیا۔''

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ کیوں ہنگامہ آرائی کر رہے تھے۔ ان کا کوئی تو مطالبہ ہوگا؟''

''وہ کسی انویسٹ منٹ اور منافع کا بار بار تذکرہ کر رہے تھے۔'' کنول نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ قاضی صاحب پر جھوٹ اور فراڈ کا الزام عائد کر رہے تھے۔ حالانکہ قاضی صاحب کا ایسے کسی فراڈ بزنس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔''

وہ میری توقع کے عین مطابق غلط بیانی سے کام لے رہی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا وہ قاضی کے فراڈ انویسٹ منٹ بزنس کی راز داں تھی اور اس کی پردہ پوشی پر کمر بستہ تھی۔

میں نے کہا۔ ''مس کنول! اس بلوے اور توڑ پھوڑ والے واقعے سے چند روز قبل ملزم اپنے دوست شکیل کے ساتھ آپ کے دفتر میں آیا تھا۔ آپ نے انہیں بتایا کہ قاضی صاحب خطرناک فلو کے سبب دفتر نہیں آئے۔ انہیں آپ کی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ ہر صورت قاضی قیوم سے ملنا چاہتے تھے۔ آپ کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ زبردستی قاضی قیوم کے کمرے میں گھس گئے جہاں قاضی سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ یہ واقعہ تو آپ کے ذہن میں نقش ہوگا؟''

''میں ایسے کسی واقعے کی چشم دید گواہ نہیں۔'' وہ سرے سے مکر گئی۔ ''اور نہ ہی میں نے کسی اور سے یہ بات سنی ہے۔ اس فرضی واقعے سے آپ پتا نہیں کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی ڈھٹائی کے جواب میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کہ کنول صاحبہ! آپ مکمل طور پر سیکرٹری ہیں اور نہ ہی ریسپشنسٹ، نہ ٹیلی فون آپریٹر اور نہ ہی گائیڈ بلکہ آپ کے لئے موزوں ترین خطاب ''مس گائیڈ'' ہونا چاہئے۔''

''آئی آبجیکٹ!'' وکیل استغاثہ اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

اس کے بعد عدالت کی کارروائی جاری نہ رہ سکی کیوں کہ ساعت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا تھا۔

جج نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

* * *

محمد علی کلے ہمیشہ سے میرا فیورٹ رہا ہے۔ اس کا فائٹنگ اسٹائل مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ مقابلے کے آغاز میں اس کے ٹھنڈے مزاج کو دیکھ کر کوئی اَن جان یہ اندازہ قائم نہیں کرسکتا کہ وہ مقابلے کے آخری مراحل میں اچانک کتنا جارح ہو جائے گا۔ یہ محمد علی کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ وہ پہلے پٹتا ہے اور پھر یک لخت ہی اپنے مدِّ مقابل پر تابڑتوڑ حملے کر کے اسے ناک آؤٹ کر دیتا ہے۔ اب تو یہ مقابلے قصہ پارینہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

یہ انسانی نفسیات ہے کہ جس چیز سے متاثر ہوتا ہے اسے اپنے معمولات میں شامل کرنے، اپنی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عدالت کا کمرا کسی فائٹنگ رِنگ سے کم نہیں ہوتا۔ وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی دو ماہر فائٹرز کی طرح جج کی منصفی میں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے قانون اور دلائل کی جنگ لڑتے ہیں۔ ہر اکھاڑے کے اصول کی طرح یہاں بھی ایک فریق کو مات اور دوسرے کو فتح نصیب ہوتی ہے۔ میں نے اپنی وکالت میں کلے کا رنگ شامل کرلیا تھا۔ میں ابتدائی راؤنڈز میں وکیل مخالف سے کھیلتا تھا، ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے دوران میں مخالف پارٹی کی بہت سی کمزوریاں میرے ہاتھ آجاتی تھیں جن کا متعلقہ افراد کو مطلق احساس نہ ہو پاتا۔ چنانچہ ساعت کے آخری مراحل میں، میں اچانک کیس کا پاسا پلٹ کر رکھ دیتا۔

موجودہ کیس بھی اپنے اختتامی حصے میں داخل ہو چکا تھا۔ پچھلی پیشی پر ہمیں بہت کم وقت مل سکا تھا لہٰذا جج نے عدالت برخاست کرنے کے بعد مجھ سے پوچھا تھا کہ آیا میں آئندہ پیشی پر

استغاثہ کی گواہ مس کنول پر مزید جرح کروں گا یا نہیں؟ میں نے یہی جواب دیا تھا کہ گواہ پر میری جرح مکمل ہو چکی۔ کنول کے ارادوں کے پیش نظر مزید سوالات وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا!

جج کرسی انصاف پر براجمان ہو چکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ آج استغاثہ کے آخری گواہ یعنی ''قاضی ٹریڈنگ کمپنی'' کے مالک قاضی قیوم کی شہادت تھی۔ وہ اس وقت وٹنس باکس میں موجود تھا۔

حلف کی کارروائی مکمل ہوئی تو قاضی کا طویل بیان ریکارڈ کیا گیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ نے چند رسمی مگر ضمنی سوالات کر کے جرح ختم کردی۔ میں اپنی مخصوص سیٹ سے اٹھا اور قاضی والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

''قاضی صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے گمبھیر لہجے میں مخاطب کیا۔

''آپ ویسے تو بڑے دھان پان اور مختصر القامت شخص ہیں لیکن آپ کے ہاتھوں میں بڑی طاقتور گرفت نظر آتی ہے!''

وہ کٹہرے کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بے ساختہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لئے۔ پھر وہ ہاتھ اس کی پشت پر پہنچ گئے۔

میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارے قاضی صاحب! آپ تو اپنے ہاتھوں کو اس طرح چھپا رہے ہیں جیسے آپ نے ان ہاتھوں سے کوئی سنگین جرم کیا ہو یا ان ہاتھوں میں کوئی خطرناک اور خلاف قانون شے تھام رکھی ہو......مثلاً پستول یا خنجر یا کوئی بھی آلہ قتل......؟''

میرے اس ادھورے اور معنی خیز جملے نے اس کی بوکھلاہٹ میں اضافہ کردیا۔ وہ متذبذب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ تاہم اس تامل آمیز تذبذب میں اس نے میکانکی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ دوبارہ چوبی ریلنگ پر ٹکا دیئے تھے۔ یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔

وکیل استغاثہ اپنا فرض نبھاتے ہوئے قاضی کی مدد کو پہنچا اور چیخ سے مشابہ لہجے میں اس نے اپنا احتجاج نوٹ کروایا۔

''آبجیکشن یور آنر! فاضل وکیل معزز گواہ پر اوچھے اور لایعنی وار کر کے اسے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کا پابند بنایا جائے!''

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ گواہ کے ہاتھوں کو چھوڑ کر اس کی بیوی کے قتل کی طرف آئیں اور سوالات کے دائرے کو متعلقات تک محدود رکھیں۔''

''اوکے یور آنر!'' میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے کہا پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

''قاضی صاحب! مقتول نوشابہ سے آپ کی شادی کتنا عرصہ پہلے ہوئی تھی؟''

"لگ بھگ دو سال ہونے کو آ رہے ہیں۔" اس نے قدرے سنبھل کر جواب دیا۔

قتل کے وقت ان کی شادی شدہ زندگی کی عمر ایک سال سے تھوڑی زیادہ تھی اور اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے اب تقریباً آٹھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ آج کل ماہ نومبر چل رہا تھا۔ اس حساب سے قاضی کا جواب درست تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"قاضی صاحب! نرسری والے اس بنگلے میں آپ کب سے رہ رہے ہیں؟"

"میں تین سال پہلے یہاں شفٹ ہوا تھا؟"

"اس سے پہلے آپ کہاں رہائش پذیر تھے؟"

"گلشن اقبال بلاک تیرہ میں۔"

"یعنی اپنی ٹریڈنگ کمپنی کے نزدیک ہی؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے اسے گھیرنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"قاضی ٹریڈنگ کمپنی کب سے وجود میں ہے؟"

"تقریباً آٹھ سال سے۔"

"یعنی آپ کی بیوی صوفیہ کے زمانے سے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بے حد گھبرا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا میں نے اس کی پہلی بیوی کا ذکر کر کے اس کے کسی نازک پہلو پر ٹھوکر لگا دی ہو۔ شکیل کی روز و شب کی بھاگ دوڑ میرے کام آ رہی تھی۔ میں اس کی فراہم کردہ معلومات کو دیکھ بھال کر استعمال کرنے لگا۔ میں نے قدرے سخت انداز میں کہا۔

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا قاضی صاحب!"

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"صوفیہ کی جب آپ سے شادی ہوئی یا صحیح طور پر یوں کہنا چاہئے کہ جب آپ نے صوفیہ کو اپنے جال میں پھنسایا تو وہ ایک یتیم اور بے سہارا لیکن مالدار عورت تھی۔ اس وقت آپ معاشی اور مالی طور پر کچھ بھی نہیں تھے۔ صوفیہ کے مال و دولت نے آپ کو ایک مضبوط سہارا دیا اور کچھ عرصے بعد آپ نے ایک ٹریڈنگ کمپنی بنا لی۔ آپ دن رات ترقی کرنے لگے۔ لیکن چار سال بعد آپ کی بیوی کو ایک حادثہ پیش آ گیا جس میں وہ جان ہار گئی۔ صوفیہ چھت سے گر کر ہلاک ہو گئی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ چھت سے گر کر شدید زخمی ہوئی تھی پھر جب آپ اسے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے جانے لگے تو راستے میں اس کی روح پرواز کر گئی۔" "ایم آئی رائٹ؟"

وٹنس باکس میں کھڑا قاضی قیوم بے حد گھبرایا ہوا نظر آنے لگا تاہم میرے سوال کا جواب بھی ضروری تھا، اس نے مریل سی آواز میں کہا۔ "یو آر رائٹ۔"

وکیل استغاثہ نے گواہ کی کیفیت کے پیش نظر اعتراض کرنا ضروری جانا اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی نوشابہ مرڈر کیس کو فراموش کر کے گواہ کے ماضی کو

کھکھوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "یور آنر! نوشابہ بلاشبہ معزز گواہ قاضی قیوم کی بیوی تھی جو حادثاتی موت کا شکار ہوئی۔ لہٰذا گواہ کی گزشتہ ازدواجی زندگی کا ذکر بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ قاضی صاحب کی دو بیویاں پہلے بھی حادثاتی طور پر موت سے ہم کنار ہو چکی ہیں۔ اس قدر مشترک کو نظر انداز کرنا موجودہ کیس کی ہسٹری پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہوگا اور انصاف کے اصولوں کے منافی بھی!"

میری بات ختم ہوئی تو جج نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ "تین بیویاں اور حادثاتی موت!"

"اِٹ اِز اے میٹر آف فیکٹس۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

جج نے دلچسپی لیتے ہوئے مجھے ہدایت کی۔ "بیگ صاحب! آپ جرح کو موجودہ خطوط پر جاری رکھیں۔"

میں شیر ہو گیا اور استغاثہ کے گواہ قاضی قیوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "قاضی صاحب! میری معلومات کے مطابق صوفیہ کی موت پر اس کی لائف انشورنس کے ذیل میں آپ نے ایک بھاری رقم وصول کی تھی۔ اس کے بعد آپ گلشن اقبال کو چھوڑ کر مسلم آباد میں آ بسے اور ریحانہ نامی ایک مالدار بیوہ سے شادی کر لی!"

میں نے ڈرامائی انداز میں بات ختم کر کے جج کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جناب عالی! میں ان واقعات کی تفصیل میں جا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا لہٰذا اپنے بیان کو مختصر کرتا ہوں۔"

جج نے سر کو اثباتی جنبش دی، پھر میں گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"قاضی صاحب! ریحانہ سے شادی آپ کو کچھ زیادہ راس نہ آئی۔ اس کی دولت ہتھیانے میں تو آپ کامیاب رہے تاہم اس سے وابستہ آپ کی بلند بانگ توقعات پوری نہ ہو سکیں چنانچہ وہ بے چاری ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسی۔ کشمیر روڈ پر ایک واٹر ٹینکر نے اس کی گاڑی کو اس بری طرح ہٹ کیا کہ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی۔ واضح رہے کہ واٹر ٹینکرز والوں کا اڈا آپ کی رہائش سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ریحانہ کی حادثاتی موت کا کلیم آپ نے پانچ لاکھ وصول کیا تھا۔ اگر میرے بیان میں کوئی غلطی ہو تو فوراً ٹوک دیں۔"

قاضی قیوم کی حالت دیدنی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا جواب دے۔ جج اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اور حقیقی معنوں میں محظوظ بھی ہو رہا تھا۔ میں نے گواہ پر جرح جاری رکھی اور کہا۔

"قاضی صاحب! نوشابہ کی لائف پالیسی لگ بھگ دس لاکھ کی آپ نے لے رکھی ہے۔ اس

بے چاری کی موت کو آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ کیا آپ نے کلیم وصول کرلیا؟‘‘

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ وکیل استغاثہ نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

’’یور آنر! میرے فاضل دوست حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ گواہ کی پرائیویٹ لائف کو موضوع بنانا قطعاً درست نہیں۔‘‘

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ’’میں نے گواہ سے مقتول کے کلیم سے متعلق سوال کیا ہے۔ گواہ اور مقتول دونوں اس کیس کے اہم کردار ہیں لہٰذا گواہ کو جواب دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘

آخری جملہ میں نے قاضی قیوم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ ’’کلیم کی کلیئرنس میں کچھ قانونی پیچیدگی ہے۔‘‘

’’یہ پیچیدگی خود آپ کی پیدا کردہ ہے۔‘‘ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ مجھ سے نگاہ چرا کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

وکیل استغاثہ بھی الجھ کر رہ گیا تھا۔ جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

’’بیگ صاحب! آپ اپنی بات کی وضاحت کریں؟‘‘

میں نے بہ صد احترام کہا۔ ’’جناب عالی! میں اگر اس سلسلے میں کچھ عرض کروں گا تو وکیل استغاثہ کو شکایت ہوگی۔ میرا کہا ہوا الزام کے زمرے میں آئے گا۔‘‘

’’آپ کھل کر کہیں، کیا کہنا چاہتے ہیں؟‘‘ وکیل استغاثہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ’’جناب عالی! استغاثہ کا گواہ قاضی قیوم اپنی دوسری بیوی کی موت کے بعد مسلم آباد سے نرسری کے علاقے میں منتقل ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد اس نے نوشابہ سے شادی کر لی۔ یہ ایک بے میل جوڑی تھی۔ نوشابہ مطلقہ تھی۔ بانجھ پن کے الزام میں اسے طلاق ہو چکی تھی لیکن گواہ کے لئے یہ ایک آئیڈیل ہدف تھا۔ نوشابہ صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ خود مختار بھی تھی لیکن ہم اس وقت کلیم کے کلیئرنس کی بات کر رہے ہیں۔‘‘ میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

’’جناب عالی! میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ’’اگر اس مرتبہ بھی قاضی صاحب کی بیوی کی ہلاکت کو حادثے کا رنگ ہی دیا جاتا تو پھر کچھ بھی نہ بگڑتا۔ کہانی بہت سمپل تھی۔ ایک ڈاکو، کوئی نامعلوم شخص گھر میں گھسا اور نوشابہ کی مزاحمت پر وہ اس کا گلا گھونٹ کر چلتا بنا۔ کسی خاص شخص کو قاتل نامزد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ نہ یہ معاملہ عدالت تک جاتا اور نہ ہی انشورنس کمپنی کا کلیم ڈیپارٹ قاضی صاحب کی راہ کھوٹی کرتا۔ دیٹس آل یور آنر!‘‘

میں خاموش ہوا تو عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر موجود شخص کی نظر قاضی قیوم پر ٹکی ہوئی تھی اور اس نظر میں درجنوں سوالات تھے۔ جج بھی استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے شوہر کو گھور

رہا تھا البتہ وکیل استغاثہ انتہائی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی فائلز میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ’’بیگ صاحب! آپ گواہ سے کچھ اور پوچھنا چاہیں گے؟‘‘

’’قاضی صاحب!‘‘ میں نے گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ’’آپ اس شخص کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟‘‘ میرا اشارہ اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم خلیل کی طرف تھا۔

’’میں اس سفاک شخص کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ میری بیوی کا قاتل ہے۔‘‘

’’میں نے عرصے کے بارے میں پوچھا تھا؟‘‘

’’قتل کی اس واردات کے بعد سے۔‘‘

’’گویا آپ اپنی انویسٹ منٹ کمپنی اور ملزم کی تین لاکھ انویسٹ منٹ سے انکاری ہیں؟‘‘

’’میں اس سوال کا جواب پہلے بھی دے چکا ہوں۔‘‘ اس کا اعتماد رفتہ رفتہ بحال ہو رہا تھا۔

’’انویسٹ منٹ اور بھاری منافع والی فرضی بوگس کہانی مجھ پر سراسر الزام ہے۔‘‘

’’کیا آپ کو یہ معلوم تھا کہ ملزم برنس روڈ پر پرنٹنگ پریس وغیرہ کے کام سے وابستہ ہے؟‘‘

میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بولا۔ ’’ملزم کے بارے میں ساری معلومات مجھے اس واقعے کے بعد حاصل ہوئی ہیں۔‘‘

’’ملزم کی آپ سے کوئی دشمنی تھی؟‘‘

’’میری یادداشت میں ایسی کوئی بات نہیں۔‘‘

’’آپ کی بیوی نوشابہ سے اس کی کوئی دشمنی رہی ہو؟‘‘

’’ایسا کوئی واقعہ میرے علم میں نہیں۔‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

’’پھر آپ کے خیال میں قتل کا محرک کیا ہو سکتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’کوئی خواہ مخواہ گھر میں گھس کر کسی کی جان تو نہیں لے لیتا۔‘‘

وہ گھبراہٹ آمیز اور بے ربط لہجے میں بولا۔ ’’مم...... میرا خیال ہے...... وہ چوری کی نیت سے میرے گھر میں داخل ہوا...... پھر نوشابہ کی مداخلت پر وہ...... اسے موت کے گھاٹ اتار کر فرار ہو گیا۔‘‘

’’گویا یہ ایک نئی کہانی ہے۔‘‘ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ’’پہلے آپ کا موقف یہ رہا ہے کہ ملزم نے اپنے دوست شکیل کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے آپ کی بیوی کو قتل کیا تھا۔ یہ کیسی الٹ بازی ہے قاضی صاحب؟‘‘

’’مم...... میرا مطلب ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے......‘‘ اس کے انداز میں بے پناہ بوکھلاہٹ تھی۔

’’شکیل والے واقعے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔‘‘

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’آپ ٹھیک کہتے ہیں قاضی صاحب! واقعی یہ بھی ہو سکتا

اور وہ بھی ہوسکتا ہے...... اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے!"

وہ بری طرح میرے جال میں گھر چکا تھا۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر امداد طلب نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اس کی دانست میں اس نازک موقع پر وہ اس کی دست گیری کرسکتا تھا لیکن میں نے وکیل مخالف کی زبان کھلنے سے پہلے ہی گواہ پر تابڑ توڑ حملے شروع کردیئے۔

"قاضی صاحب!" میں نے جارحانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "آپ کا دعویٰ ہے قتل کی اس واردات سے پہلے آپ ملزم کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ وقوعہ کے روز آپ کے بیان کے مطابق جب آپ مقتول کی اطلاع پر گھر پہنچے تو پورا بنگلہ اُلٹا پڑا تھا اور ڈرائنگ روم میں نوشابہ کی لاش موجود تھی۔ آپ نے اس صورت حالات کو دیکھ کر پولیس کو فون کردیا۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ گھر پہنچنے کے کتنی دیر بعد آپ نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟"

"لگ بھگ پندرہ منٹ بعد۔" وہ سراسیمہ نظر سے جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ "پولیس کے روزنامچے کے مطابق آپ نے بائیس مارچ کی دوپہر ساڑھے گیارہ بجے تھانے فون کیا تھا۔ اس کا تذکرہ پولیس چالان اور استغاثہ میں بھی موجود ہے۔ اس حساب سے آپ سوا گیارہ بجے گھر پہنچے تھے جب کہ آپ کی سیکرٹری کنول کے مطابق آپ سوا دس بجے دفتر سے نکلے تھے۔ ممتاز منزل سے نرسری کے علاقے میں پہنچنے کے لئے زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لگتا ہے، پھر آپ ایک گھنٹے بعد جائے وقوعہ پر کیوں پہنچے؟ جبکہ آپ کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ یہ سفر تو بیس منٹ میں طے ہو جانا چاہئے تھا۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟"

وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ "وہ دراصل...... راستے میں میری گاڑی خراب...... ہوگئی تھی اس لئے اتنی دیر ہوگئی۔"

"قاضی صاحب! اب اتنا بھی کمال نہ کریں۔" میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ "گاڑی خراب ہوگئی تھی تو آپ ٹیکسی پکڑ سکتے تھے۔ نوشابہ نے انتہائی ایمرجنسی میں آپ کو پکارا تھا۔ آپ کو اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہئے تھا؟"

اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا بغلیں جھانک کر رہ گیا۔

میں نے ایک اور وار کیا۔ "پولیس ریکارڈ کے مطابق آپ نے تھانے فون کرکے یہ اطلاع دی تھی کہ خلیل نامی ایک شخص نے آپ کی بیوی نوشابہ کو قتل کردیا ہے۔ جب آپ وقوعہ سے پہلے ملزم سے واقف ہی نہیں تھے تو پھر کیا آپ کو قاتل کے بارے میں اللہ معاف کرے، کوئی الہام آیا تھا؟"

وہ کٹہرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت وہ برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے جواب دینے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کی خاموشی ہی بڑا واضح جواب تھی...... اس کے مجرم ہونے کا ثبوت!

میں نے گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دیتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ "قاضی

صاحب! آپ تو انویسٹ منٹ کا کام نہیں کرتے۔ شکیل، مروت، اشفاق اور خلیل سب جھوٹے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ملزم برنس روڈ پر کام کرتا تھا پھر......" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سلگتے ہوئے انداز میں کہا۔

"پھر آپ نے انکوائری آفیسر کی راہ نمائی کیونکر کی؟ آپ کی نشان دہی پر پولیس نے دوپہر ایک بجے ملزم کو اس کی دکان واقع برنس روڈ سے گرفتار کیا تھا۔ تفتیشی افسر معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ آپ ہی نے اسے ملزم کی دکان کا ایڈریس بتایا تھا۔ آپ کی یہ حرکات......؟"

میں نے سوالیہ انداز میں ایک مرتبہ پھر جملہ نامکمل چھوڑا اور روئے سخن جج کی جانب موڑ لیا۔

"جناب عالی! استغاثہ کے گواہ کی "حرکات" سے ظاہر ہوتا ہے وہ وقوعہ سے قبل ہی ملزم سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ برنس روڈ پر کس نوعیت کا کام کرتا ہے۔ گواہ کے بیان کا تضاد اس کی ذات کو شکوک و شبہات کی دبیز چادر میں لپیٹ رہا ہے۔ اس کی گواہی، راست گواہی کے جملہ اصولوں پر پوری نہیں اترتی۔ مدعی کا یہ دوغلا پن اور دروغ گوئی معزز عدالت کی توجہ کی طلب گار ہے۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دلائل کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

✿✿✿

آئندہ پیشی پر پہلے وکیل استغاثہ نے ملزم کے خلاف دلائل دیئے لیکن اس کے بیان میں زور تھا اور نہ ہی دلائل میں دم۔ اپنی باری پر میں نے بھرپور تقریر کر ڈالی۔ کیس کی صورت حال تو گزشتہ پیشی پر ہی واضح ہوگئی تھی۔ تاہم میں نے اس تابوت میں آخری میخ بھی ٹھونک دی۔

میں نے سب سے پہلے فنگر پرنٹس کی رپورٹ کے غیاب کو تنقید کا نشانہ بنا کر پولیس کے خوب لتے لئے پھر استغاثہ کے گواہ عدیل خان کی قوتِ مشاہدہ کا مہذب اور ناقابل گرفت انداز میں مذاق اڑایا۔ اس کے بعد کنول کی ہٹ دھرمی زیر بحث آئی۔ پھر جب قاضی قیوم کی دروغ گوئی پر بات ہوئی تو جج پوری طرح میرے موکل کے حق میں ہموار ہوگیا۔ رہی سہی کسر قاضی کی سابق دو بیویوں کی حادثاتی اموات نے پوری کردی۔ جج نے دلائل کی کارروائی مکمل ہونے پر فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کردیا۔ اس کے ساتھ ہی استغاثہ پر زور دیا کہ وہ نوشابہ کے اصل قاتل کو گرفتار کرکے جلد از جلد چالان پیش کرے۔

پولیس کے لئے جج کے احکام پکے پکائے حلوے سے کم نہیں تھے۔ اگلے ہی روز پولیس پنجے جھاڑ کر قاضی قیوم کے پیچھے پڑ گئی۔

قاضی قیوم پولیس کے پنجوں میں پائے جانے والے نکیلے ناخنوں کی تاب نہ لا سکا اور جلد ہی اس نے نوشابہ کے ساتھ ساتھ اپنی پہلی دو بیویوں کے قتل کا بھی اقرار کر لیا۔ البتہ آخری وقت تک اس نے ''قاضی انویسٹرز'' اور لوگوں کی ہڑپ کی ہوئی رقوم کا اعتراف نہ کیا۔ یہ ''چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے'' والی صورت حال تھی۔ حالانکہ اس اقبال میں کوئی حرج نہ تھا۔

پتہ نہیں، اس مجرم ذہن شخص کی یہ کون سی ادا تھی!

✿✿✿

جرنر باز

ایک روز میں عدالت سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا کہ عقب سے کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک شناسا چہرے پر نظر پڑی۔ ہمارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور وہ شخص تیز قدموں سے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ صدیق تھا۔ تقریباً ایک سال پہلے میں اس سے مل چکا تھا۔

صدیق کسی سرکاری محکمے میں کلرک تھا۔ اس کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ ریٹائرمنٹ زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ ایک سال قبل اس کی گواہی نے ایک بے گناہ کو پھانسی کے پھندے تک جانے سے بچا لیا تھا۔ اگر وہ بر وقت جرأت کا مظاہرہ کر کے عدالت میں نہ پہنچتا تو اس کے محکمے کا ایک آدمی ناکردہ جرم کی سزا پا کر جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔

رسمی علیک سلیک کے دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ صدیق خاصا گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے صدیق صاحب! آج عدالت میں...... خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت کہاں بیگ صاحب!'' وہ تقریباً روہانسا ہو رہا تھا۔ ''میری بیٹی سخت مشکل میں گرفتار ہے۔''

''کیا ہو گیا آپ کی بیٹی کو؟''

''صندل کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کس جرم میں؟''

''جرم بے گناہی میں۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

میں نے چونک کر اس شریف آدمی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ کس قسم کا جرم ہے؟''

''صندل پر قتل کا الزام ہے۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''حالانکہ اس نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتی بیگ صاحب!''

میں نے استفسار کیا۔ ''آپ کی بیٹی پر کس کے قتل کا الزام ہے؟''

''اس کے شوہر صفدر بیگ کے قتل کا الزام۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

''یہ کل کا واقعہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''اس عدالت میں آپ کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ آج پولیس نے صندل کو

عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کیا ہوگا!''

''بالکل یہی بات ہے۔'' اس نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔''ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس اسے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ میں ابھی تک صندل کے لئے وکیل کی خدمات حاصل نہیں کر سکا۔'' وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔''میں ابھی کسی وکیل سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ پر نظر پڑ گئی......اور میں آپ کے پیچھے لپک آیا۔''

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور کہا۔''صدیق صاحب! آپ ایسا کریں، ایک گھنٹے بعد آپ میرے دفتر میں آ جائیں پھر اس مسئلے پر تفصیلی بات کر لیتے ہیں۔ آپ نے میرا دفتر تو دیکھ رکھا ہے نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر ایک جانب بڑھ گیا۔

مجھے ایک دوست کے ساتھ قریبی ریسٹورنٹ میں لنچ کرنا تھا۔ لہٰذا میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے صدیق کو ایک گھنٹے بعد دفتر آنے کو کہا تھا مگر لنچ میں مجھے ذرا دیر ہو گئی اور جب لنچ سے فارغ ہو کر ڈیڑھ گھنٹے بعد میں دفتر پہنچا تو وہ دفتر کی انتظار گاہ میں موجود تھا۔

میرا دفتر سٹی کورٹ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جب میں اپنے چیمبر میں پہنچا تو میری سیکرٹری نے بتایا۔''بیگ صاحب! صدیق نامی ایک کلائنٹ بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ کورٹ میں آپ کی اس سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔''

لگتا تھا، وہ کورٹ سے سیدھا یہاں آ گیا تھا۔ میں نے کہا۔''ٹھیک ہے، صدیق صاحب کو میرے پاس بھیج دو۔''

صدیق کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، وہ محمود آباد میں رہائش پذیر تھا۔ میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا، اس نے دوبارہ ہاتھ ملایا اور ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''آپ آرام سے بیٹھ کر مجھے ساری باتیں بتائیں۔''

پھر میں نے رف پیڈ اپنے سامنے رکھ لیا اور قلم سنبھال کر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

چند لمحے خاموش رہ کر اس نے اپنے خیالات کو مجتمع کیا پھر نہایت ہی افسردہ انداز میں گویا ہوا۔

''بیگ صاحب! صندل کی بدقسمتی کی کہانی تو بہت طویل ہے لیکن فی الحال میں آپ کو حالیہ واقعے کے بارے میں بتاتا ہوں۔ بس یہ یوں سمجھ لیں، صفدر بیگ سے شادی اس کو راس نہیں آئی۔'' پھر وہ شادی کی تفصیل میں کھو گیا۔ میں نے بیچ میں وقفہ دیکھ کر سوال کیا۔

''آپ کی باتوں سے لگتا ہے، صندل کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا؟''

اس نے بتایا۔''اس کی شادی کو ابھی صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے۔''

میں نے پوچھا۔''صفدر بیگ کے قتل کا کیا معاملہ ہے؟''

صدیق نے ایک شکستہ سانس لیتے ہوئے کہا۔''بیگ صاحب! کل دوپہر میری بیوی نے دفتر فون کر کے مجھے بتایا کہ پولیس صندل کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اس پر صفدر بیگ کے قتل کا الزام ہے۔''

''کیا ان دنوں صندل اپنے میکے آئی ہوئی تھی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔''وہ کل صبح ہی وہاں پہنچی تھی۔ میں اس وقت تک دفتر کے لئے نکل چکا تھا۔ میری بیوی نے بتایا کہ اپنے شوہر سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے کہا۔''جب سے صندل کی شادی ہوئی ہے، اس نے اپنی سسرال میں ایک دن بھی سکون سے نہیں گزارا۔ پتا نہیں، وہ کون سی بری گھڑی تھی جب صندل نے یہ قدم اٹھایا تھا۔''

میں چونکا۔''کیا صندل نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی تھی؟''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' اس نے مبہم جواب دیا۔

''اس بارے میں ذرا کھل کر بتائیں۔''

''بس بیگ صاحب!'' صدیق نے ایک گہری سانس لی۔''وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ اس لئے ہم نے زیادہ مخالفت نہیں کی۔ ویسے میرے دل میں شروع ہی سے یہ کھٹکا تو تھا کہ یہ گاڑی زیادہ عرصے تک نہیں چلے گی اور دیکھ لیں، آٹھ ماہ بعد اس شادی کا کیا انجام سامنے آیا ہے۔'' وہ خاموش ہو کر امداد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔''آپ نے اپنے دل کے کس کھٹکے کا ذکر کیا ہے۔ یہ کیا قصہ ہے؟''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔''بیگ صاحب! بے میل شادیوں میں اکثر مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں بھی اسی حوالے سے ڈر رہا تھا اور شادی کے فوراً بعد ہی میرا یہ ڈر حقیقت بن گیا۔ صندل نے اپنی سسرال میں ایک دن بھی سکھ کا نہیں گزارا۔

''بے میل شادی سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے کہا۔''میرا مطلب ہے، صندل اور صفدر بیگ کی شادی کس لحاظ سے بے میل تھی؟''

اس نے بتایا۔''جناب! ہمارے سوشل اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دس ماہ پہلے صندل جس فرم میں کام کرتی تھی، صفدر بیگ اس کا مالک تھا۔ یعنی صمد بیگ کا اکلوتا بیٹا اور ساری جائیداد، کاروبار کا وارث۔ یہ لوگ بہت بڑا بزنس چلاتے ہیں۔''

اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ میں نے پوچھا۔''کیا اس شادی کے لئے صمد بیگ آسانی سے تیار ہو گیا تھا؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے تھوڑا تامل کیا پھر بولا۔''صفدر کا باپ صمد بیگ کسی کھاتے میں نہیں۔ اس گھر میں صفدر کی ماں صاعقہ بیگم کی چلتی ہے اور صاعقہ نے اس رشتے کی مخالفت کی

تھی۔"

"پھر یہ شادی کس طرح ہوگئی؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے نہایت مختصر الفاظ میں جواب دیا۔ "دونوں کی باہمی رضامندی سے!"

"آپ کا مطلب ہے، کورٹ میرج؟"

جواب میں اس نے خاموشی سے گردن جھکا دی۔

میں نے متذبذب انداز میں پوچھا۔ "آپ نے بتایا ہے کہ صندل نے اپنی سسرال میں ایک دن بھی سکھ سے نہیں گزارا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی ساس کے ساتھ ہی رہتی تھی جب کہ آپ کے بیان کے مطابق صاعقہ اس رشتے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھی۔ یہ کیا ماجرا ہے؟"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "کورٹ میرج کے بعد صاعقہ نے صندل کو اپنی بہو تسلیم کر کے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اس کے ساتھ ہمیشہ نوکروں ایسا سلوک کیا اور بالآخر اس پر قتل کا الزام لگا کر گرفتار کروا دیا۔"

"صدیق صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "جب صاعقہ اس شادی کے لئے تیار نہیں تھی تو پھر آپ کے جانتے بوجھتے یہ معاملہ کورٹ تک کس طرح پہنچ گیا۔ آپ نے صندل کو سمجھایا ہوتا۔ یہ معاملہ کسی اور طرح بھی طے ہوسکتا تھا!"

"صندل کو سمجھانے کی نوبت تو اس وقت آتی جب وہ اس سلسلے میں ہمیں بتاتی۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "صفدر نے پتا نہیں اسے کیا پٹی پڑھائی تھی کہ وہ اس کے اشاروں پر ناچتے ہوئے کورٹ جا پہنچی۔ ہمیں تو اس وقت پتا چلا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ہم نے بیٹی کی خوشی میں خوش ہونے کو ترجیح دی کیونکہ ہمارے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا!"

بات ختم کرتے کرتے اس کے لہجے میں کرب در آیا۔ صدیق ایک شریف النفس انسان تھا۔ اس مزاج کے لوگوں کی مجبوریاں بھی انہی جیسی ہوتی ہیں جنہیں وہ کھل کر بیان بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے بھی اس سلسلے میں اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"کیا صندل پہلے بھی لڑ جھگڑ کر میکے آتی رہتی ہے؟"

"ہاں، ایک دو مرتبہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔"

"جب انہوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی تو پھر آئے دن کے لڑائی جھگڑے کا کیا جواز ہے؟"

صدیق نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "سارے فساد کی جڑ صفدر بیگ کی ماں صاعقہ ہے۔ اس نے بیٹے کو قابو میں رکھنے کے لئے اوپری دل سے صندل کو بہو تسلیم کر لیا تھا مگر اندر سے وہ اس کی کاٹ میں لگی رہتی تھی۔ صفدر کی غیر موجودگی میں کئی مرتبہ اس نے بڑے کھلے الفاظ میں صندل کو

دھمکی بھی دی تھی کہ وہ اسے ایک روز اس گھر سے نکال کر رہے گی، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند زیادہ عرصے تک نظر نہیں آئے گا۔" پھر وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "صاعقہ بہت خطرناک عورت ہے!"

"کل صبح کیا واقعہ پیش آیا تھا؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"بیگ صاحب! آپ صندل سے ملاقات کر لیں۔" وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ "وہی آپ کو حقائق سے آگاہ کر سکے گی۔ کچھ تو اس نے کھل کر بتایا ہی نہیں اور پھر اس وقت میرا دماغ بھی پوری طرح کام نہیں کر رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں، کہاں جاؤں؟ آپ صندل کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو مجھے اطمینان رہے گا۔"

صدیق سے مزید تفصیل حاصل ہونے کے امکانات نہیں تھے۔ میں نے پیڈ پر ضروری باتیں نوٹ کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔ "پولیس نے تفتیش مکمل کرنے کے لئے کتنے روز کا ریمانڈ لیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "سات روز کا۔"

پھر میں نے اس سے متعلقہ تھانے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ صندل کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے۔ صفدر بیگ کی رہائش محمد علی سوسائٹی میں تھی۔ یہ ایک ہزار گز پر تعمیر شدہ ایک عالی شان بنگلہ تھا جو ان لوگوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میں صدیق کی حیثیت سے بھی آگاہ تھا۔ گویا صاعقہ بیگم نے "مخمل میں ٹاٹ کے پیوند" والی بات کچھ زیادہ غلط بھی نہیں کی تھی! یہ محاورہ ایسے ہی مواقع کے لئے بنایا گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد صدیق دفتر سے رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا۔ "میں پہلی فرصت میں تھانے جا کر صندل سے مل لوں گا۔ آپ ایسا کریں، کل اسی وقت میرے دفتر آ جائیں۔ ویسے بھی سات روز سے پہلے کسی قسم کی عدالتی کارروائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

صدیق کے جانے کے بعد کافی دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے اکثر کورٹ میرج کو فلاپ ہوتے دیکھا ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جو شادی کے بعد اپنی فیملی کو جوائن کر لیتے ہیں ان کی زندگی مسائل کا مرقع بن جاتی ہے۔ بہت ہی کم والدین ایسے ہوتے ہیں جو اولاد کی ایسی نافرمانی کو معاف کر کے انہیں کھلے دل سے خوش آمدید کہتے ہیں ورنہ کسی نہ کسی بڑی مجبوری کے تحت ہی انہیں برداشت کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں لڑکوں کی مائیں بہت اہم رول "پلے" کرتی ہیں۔ ان کی دانست میں غیر اور ناپسندیدہ لڑکی ان سے بیٹے کو چھین کر گویا ان کے سینے پر مونگ دل رہی ہوتی ہے۔

کورٹ میرج کو کامیاب اور خوش گوار بنانے کا فارمولا یہی ہے کہ جب سب کی مخالفت مول

لے کر ایک انتہائی قدم اٹھالیا جائے تو پھر سب سے الگ تھلگ اور دور رہ کر نئی زندگی کا آغاز کیا جائے۔ اس طرح میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں اور ان غلط فہمیوں کے نتیجے میں کھڑے ہونے والے جھگڑوں کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ سخت گیر اور روایتی قسم کے والدین سے پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ ایک کھلی حقیقت ہے......اور حقیقت کے اظہار میں کوئی عار نہیں ہونا چاہئے!

میں رات کو ساڑھے نو بجے دفتر سے فارغ ہوا تو گھر جانے سے پہلے میں نے اس تھانے کی جانب گاڑی بڑھا دی جہاں صندل عدالتی ریمانڈ پر تفتیشی مراحل سے گزر رہی تھی۔ جب کوئی ملزم ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہوتا ہے تو اس سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ میں نے یہ مشکل کام آسان بنانے کے لئے اپنے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کئے اور صندل سے مختصر گفتگو کے لئے راہ نکال لی۔ اتفاق سے اس وقت تھانہ انچارج وہاں موجود نہیں تھا۔ میں اس کی واپسی سے پہلے پہلے اپنا کام ختم کر لینا چاہتا تھا۔

صندل حوالات کے ٹھنڈے ٹھار اور ننگے فرش پر ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میرے ساتھ وہاں تک آنے والے کانسٹیبل نے صندل کو پکار کر میری جانب متوجہ کیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''جناب! آپ نے ملزم سے جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی سے پوچھ لیں۔ اگر انچارج صاحب کو پتا چل گیا تو میری وردی اتر جائے گی۔''

''ارے، بھیڑ کی طرح کیا بزدلی دکھا رہے ہو۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے انچارج صاحب کو اس وقت تک کچھ پتا نہیں چلے گا جب تک تم زبان نہیں کھولو گے......اور تمہاری زبان بندی کا نسخہ ہے میرے پاس۔''

اس نے دلچسپی آمیز سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہپ پاکٹ میں سے اپنا بٹوا نکالا پھر اس میں سے پچاس روپے کا ایک کرارا نوٹ نکال کر کانسٹیبل کی جانب بڑھا دیا۔

اس نے مذکورہ نوٹ میرے ہاتھ سے ایسے جھپٹ لیا جیسے اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کر دیتا تو میں اپنا فیصلہ بدل لیتا۔ میں نے اس کی حریص آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''قائداعظم اگرچہ دھان پان اور کمزور جسم کے مالک تھے، مگر انگریز سمیت پوری دنیا کے لوگ اس کی طاقت کو مانتے ہیں۔ اس کمزور بدن میں اتنی توانائی تھی کہ آج تک اس کی اثر پذیری کم نہیں ہوئی۔ اس طاقت سے ہر بند دروازہ کھل جاتا ہے اور ہر کھلی ہوئی زبان بند ہو جاتی ہے۔''

ان طنزیہ کلمات کے بعد ایک لمحے توقف کر کے میں نے کہا۔ ''تم میرا مطلب بخوبی سمجھ رہے ہو اس لئے ایک آدھ گھنٹے کے لئے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

وہ معنی خیز انداز میں زیر لب مسکراتے ہوئے ہمارے پاس سے ہٹ گیا۔ میں مطمئن ہو کر صندل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ ابھی تک متذبذب نگاہ سے مجھے تک رہی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور معتدل آواز میں کہا۔ ''صندل! میں تمہارا وکیل ہوں۔ تمہارے باپ نے مجھے تمہارے مقدمے کے لئے منتخب کیا ہے۔ میں صدیق صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ انتہائی شریف اور ایماندار آدمی ہیں۔ جرائم کی دنیا سے دور رہنے والے۔ مجھے یقین ہے، ایسے شخص کی بیٹی بھی قتل ایسے سنگین جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتی۔ یقیناً کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت تمہیں اس کیس میں الجھایا گیا ہے۔''

ہمدردی اور تشفی کے دو بول سن کر اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں اس کے لئے واقعی نیک نرم گوشہ وا ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کی ستم رسیدگی اور مصیبت زدگی اس کی حالت سے عیاں تھی۔

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے تکتی رہی۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ مجھے اپنے احوال سے آگاہ کرے یا نہیں۔ اس خاموشی کے دوران میں، میں نے اس کے سراپا کا مکمل جائزہ لیا۔

صندل متناسب جسم کی مالک ایک دراز قامت عورت تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ رہا ہو گا۔ عمر کا اندازہ میں نے بائیس اور تیئیس کے درمیان لگایا۔ اس کے خال و خط بڑے جاذب نگاہ اور دلکش تھے۔ وہ ایک سانولی سلونی اور بے انتہا پُرکشش لڑکی تھی۔ اس بپتا نے صندل کے حُسن میں افسردگی بھر کر اسے پہلے سے کہیں زیادہ پُراثر بنا دیا تھا۔ سوگوار حُسن کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے۔ صندل اس انداز کی منہ بولتی تصویر نظر آتی تھی۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں، میں نے اس پر ٹوٹنے والی افتاد کی تفصیل اس کی زبانی سن لی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ صندل کو ایک مضبوط پلاننگ کے تحت صفدر بیگ کے قتل میں ملوث کیا گیا تھا۔ میں نے وکالت نامے پر اس کے دستخط لینے کے بعد کہا۔

''صندل! تمہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہارا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں باعزت بری ہو جاؤں گی نا؟'' وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بولی۔

میں نے پورے وثوق سے کہا۔ ''کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔ میں پہلی ہی پیشی پر تمہاری ضمانت کروانے کی کوشش کروں گا۔''

میں مزید دس پندرہ منٹ تک اسے مختلف ہدایات دیتا رہا پھر تسلی آمیز انداز میں اسے ''خدا حافظ'' کہہ کر اس کے پاس سے چلا آیا۔

واپسی میں تھانہ انچارج سے سامنا ہو گیا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چوکنا ہو گیا اور سرسری انداز میں بولا۔

''بیگ صاحب! آپ میرے تھانے میں۔ خیریت تو ہے نا؟ آپ کی آمد بے مقصد تو نہیں ہو

سکتی!"

اس کے لہجے سے گہرے طنز کی عکاسی ہوتی تھی۔ میں نے کہا۔"یہ میری آمد نہیں بلکہ رفت ہے۔ میں ایک گھنٹہ پہلے حاضر ہوا تھا۔ آپ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھے اس لئے شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہو سکا۔ پھر میں نے سوچا، آپ کے انتظار میں بے آرام کرسی پر سوکھنے سے بہتر ہے میں حوالات کا دورہ ہی کرلوں۔ ابھی میں اسی طرف سے آرہا ہوں۔"

"حوالات کی طرف سے!" وہ اچانک بے حد محتاط ہوگیا۔"ادھر آپ کیا لینے گئے تھے؟"

میں نے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے مذاقیہ انداز برقرار رکھا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔"آپ تو جانتے ہیں صداقت صاحب! آج کل دھندا بہت ٹھنڈا جارہا ہے۔ سارا سارا دن دفتر میں بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہوں۔ اب تو میں نے دفتر سے باہر نکل کر بھی کلائنٹ تلاش کرنا شروع کردیئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ واقعی الجھ کر رہ گیا تھا۔

تھانہ انچاج کا نام تو صداقت تھا لیکن وہ "رانا صاحب" کے نام سے مشہور تھا۔ میں نے بدستور سنجیدہ رنگ اختیار کرتے ہوئے کہا۔"رانا صاحب! میں آج کل گلی گلی، محلہ محلہ پھر کر کلائنٹ پکڑ رہا ہوں۔ اسی سلسلے میں، میں نے آپ کے تھانے کا چکر بھی لگا لیا اور اللہ کا شکر ہے، تھانے کے حوالات میں مجھے ایک کلائنٹ مل گیا ہے۔"

"کون؟" بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

میں نے کہا۔"قتل کی ملزم صندل...... جو ریمانڈ پر آپ کی تحویل میں ہے۔"

"اوہ!" اس کے تیور بدل گئے، برہمی سے بولا۔"تو اب آپ میرے تھانے میں بدمعاشی دکھائیں گے!"

"بدمعاشی نہیں رانا صاحب!" میں نے انگشت شہادت کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔"آپ میری اس کوشش کو خوش معاشی کہیں۔ آپ تو ماشا اللہ خاصے سمجھ دار ہیں۔ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ تلاشِ رزق حلال عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ ہمارے ملک کے کرنسی نوٹوں کی پشت پر بھی یہ عبارت درج ہوتی ہے...... حصولِ رزق حلال عین عبادت ہے۔ ان نوٹوں کی اہمیت سے واقف آپ سے زیادہ بھلا اور کون ہوگا۔"

وہ میری ان لچھے دار باتوں میں تھوڑی دیر الجھا پھر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے بولا۔"آپ کس کی اجازت سے حوالات کی طرف گئے تھے؟"

پھر اس نے اپنے اردگرد پولیس والوں کی جانب استفساریہ نگاہ سے دیکھا۔ اس وقت رانا صداقت کے کمرے میں اس کے علاوہ ایک اے ایس آئی، ایک ایس آئی اور دو کانسٹیبلو موجود تھے۔ مگر ان میں وہ اہلکار مجھے کہیں نظر نہ آیا، میں نے جس کی زبان بندی کے لئے پچاس کا نقش

استعمال کیا تھا۔ بندش کے کاموں میں کرنسی کے عملیات بہت قوی اثرات رکھتے ہیں۔

میں نے تھانہ انچارج کے چبھتے ہوئے سوال کا بڑی سادگی سے جواب دیا۔"رانا صاحب! آپ تو اس وقت تھانے میں موجود نہیں تھے۔ آپ مل جاتے تو ظاہر ہے، میں آپ سے اجازت لیتا۔ آپ کے غیاب میں، میں نے آپ کے عملے کے کسی فرد کو زحمت نہیں دی اور خود ہی پیّوں پیّوں اس طرف جا نکلا۔ آپ تو جانتے ہیں...... پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ اللہ کا احسان ہے، میری اس کوشش کے نتیجے میں مجھے ایک کلائنٹ مل گیا۔ اب صندل کی حیثیت میرے مؤکل ایسی ہے۔ میں نے وکالت نامے پر اس کے دستخط حاصل کر کے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔"

آخری دو جملے میں نے بڑے ٹھوس انداز میں ادا کئے تھے۔ تھانہ انچارج گہری نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"میں یہ تو جانتا ہوں، پولیس والے بڑے بدلحاظ ہوتے ہیں۔ آپ جھوٹے منہ بھی مجھے چائے پانی کا نہیں پوچھیں گے۔ چلیں یہی بتا دیں، آپ میری مؤکل صندل پر کون سی دفعہ لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

وہ تلملا کر رہ گیا۔ پھنکار سے مشابہ لہجے میں بولا۔"ہم جتنے بھی بدلحاظ ہوں لیکن وکیلوں سے جیت نہیں سکتے۔ وہ ہم سے کئی ہاتھ آگے کی چیز ہیں۔ اپنے مؤکل کی کھال اتارنے میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی رورعایت کے قائل نہیں ہوتے۔"

اس نے ایک طرح سے میرے پیشے پر چوٹ کی تھی۔ میں نے برا مانے بغیر خوش گوار انداز میں کہا۔"اگر وکیل اپنے مؤکل کی کھال اتارتا ہے تو کم از کم اس بات کا خیال ضرور رکھتا ہے کہ اس کی چھری کی دھار میں کوئی کلام نہ ہو مگر آپ لوگ تو کند آلات سے مظلوموں اور بے کسوں کی کھال اتارتے بلکہ کھینچتے ہیں۔ آپ کی اس مہارت سے عوام بخوبی آگاہ ہیں۔"

"آپ کا کام اگر ہو گیا ہو تو آپ یہاں سے تشریف لے جاسکتے ہیں۔" وہ بے مروتی سے بولا۔

میں نے کہا۔"کیا آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیں گے؟"

"کون سا سوال؟"

"ملزم پر لگائی جانے والی دفعہ کے بارے میں، میں نے پوچھا تھا۔"

"تمام دفعات کا اطلاق اور ہر قسم کے جرائم کے بارے میں قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں بہت کچھ درج ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔"اور آپ نے تو ماشا اللہ تمام کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ اب میں آپ سے کیا عرض کروں۔ اتنا جان لیں کہ آپ کی مؤکل پر قتل عمد کا الزام ہے...... اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں ہوتا!" پھر وہ آنکھیں سکیڑ کر مضحکہ خیز انداز میں بولا۔"اس نوعیت کے جرم پر

شاید ''تھری ناٹ ٹو'' دفعہ لگائی جاتی ہے!''

''شاید نہیں بلکہ یقیناً'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اور جرم ثابت ہونے پر ملزم کے گلے میں رسّی کی ایک مخصوص ناٹ لگائی جاتی ہے جو تھری ناٹ تھری سے نکلنے والی گولی سے بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔''

''بیگ صاحب! ایسی خوفناک باتیں نہ کریں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''عدالت میں جا کر آپ کا سارا خوف نکل جائے گا رانا صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر طاری مصنوعی سراسیمگی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس کے تفتیشی افسر آپ ہی ہیں نا؟''

''میں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''یہ بات چھپنے والی تو نہیں بلکہ چھپنے والی ہے۔''

وہ اکتاہٹ آمیز نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں تھانے میں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ ان فضول باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔''

اس کے بعد وہ خود کو انتہائی مصروف تھانے دار ظاہر کرنے کے لئے میز پر رکھی ہوئی فائلوں سے نمٹنے لگا۔ میں نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور تھانے سے باہر آ گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے (روڈ پر نہیں بلکہ کہانی میں) میں آپ کو صندل کے بارے میں مختصراً بتانا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اس کو پیش آنے والے حالات سے آپ بخوبی آگاہ ہو جائیں۔ اس طرح عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کو کسی قسم کی الجھن کا سامنا نہیں ہوگا۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ درج ذیل واقعات میں سے بہت سی باتیں جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے میں انہیں ترتیب وار پیش کر رہا ہوں۔ اس قصے میں سے غیر ضروری باتیں حذف کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے چند نکات دانستہ چھپا لئے ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر آئے گا۔

۞۞۞

صندل نے گریجویشن کے بعد باپ کا سہارا بننے کی کوشش شروع کر دی۔ صدیق عمر اور صحت کی اس منزل پر تھا کہ مزید اس سے کوئی توقع رکھنا مناسب نہیں تھا۔ صندل گھر میں بڑی تھی۔ اس سے چھوٹا صرف ایک بھائی تھا جو پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ صدیق کا خیال تھا کہ اسے ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملے گی اس سے وہ کسی اچھی جگہ صندل کی شادی کر دے گا۔ باقی اللہ مالک ہے۔

صندل اور اس کی ماں صابرہ صدیق کے خیال سے متفق نہیں تھیں۔ صابرہ کا کہنا تھا، صندل کی شادی کے سلسلے میں جلدی نہ کی جائے، پہلے انہیں ذاتی گھر کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ وہ اس وقت محمود آباد میں دو کمرے کے ایک پورشن میں کرائے پر رہتے تھے۔ صابرہ کا خیال تھا اور فی

زمانہ بالکل درست خیال تھا کہ اچھے رشتے، اچھے گھروں میں آتے ہیں۔ شادی بیاہ ایک کاروبار کی سی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں، خوبصورت ہوتی ہیں ان کی صلاحیتوں سے کوئی انکار نہیں کرتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی والوں کی معاشرتی حیثیت کیا ہے۔ ان کی رہائش اپنی ہے یا کرائے کی اور اگر اپنی ہے تو کتنی بڑی ہے۔ لڑکی کے باپ کا کاروبار کیا ہے، ماہانہ اور سالانہ آمدنی کیا ہے؟ یہ سب کچھ اس لئے دیکھا جاتا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے، لڑکی جہیز میں اپنے ساتھ کیا کیا لا سکتی ہے؟ لڑکے کی سپورٹ کے لئے لڑکی کے والدین کیا کیا کر سکتے ہیں۔ وہ لڑکی اپنی سسرال میں زیادہ سکھی اور باوقار رہتی ہے جو اپنے میکے سے ٹرکوں سامان جہیز کے نام پر لائے۔ کرائے کے گھر میں رہنے والے ایک کلرک کی لڑکی کے لئے تو کسی کلرک ہی کا رشتہ آ سکتا تھا اور...... صابرہ اپنی بیٹی صندل کو کسی کلرک کے ساتھ بیاہنے کو ہرگز تیار نہیں تھی۔ اس کی اپنی زندگی اس کے سامنے تھی۔ وہ اسم بامسمیٰ تھی اس لئے ہر تنگی ترشی میں گزارہ کر لیا ورنہ گزشتہ تیئس چوبیس سال میں اس نے جو جو محرومیاں دیکھی تھیں، بیان سے باہر ہیں۔

صندل اپنی ماں کی ہم خیال تھی۔ وہ گریجویشن کے بعد اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتی تھی لیکن اس طرح کہ باپ پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ اسی لئے وہ عملی میدان میں آ گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے ٹائپنگ سیکھی کیوں کہ کسی بھی دفتر میں ملازمت کے لئے یہ بڑی سودمند اہلیت تھی۔ تین چار دفتروں میں قسمت آزمائی کے بعد وہ صمد بیگ کی فرم میں پہنچ گئی۔ اس فرم کا ماحول اسے پسند آیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں ٹک کر کام کرے گی۔ ورنہ دیگر دفتروں میں اسے چند ناخوشگوار تجربات بھی ہوئے تھے۔ وہ چوں کہ اس لائن کی لڑکی نہیں تھی اس لئے ملازمت برقرار رکھنے میں ناکام رہی۔ مگر صمد بیگ کے دفتر کے ماحول نے اسے بہت متاثر کیا۔ اسے یہاں اپنی عزت بہت محفوظ محسوس ہوئی۔ اس فرم کا آفس شاہراہِ فیصل پر ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں تھا اور بین الاقوامی معیار پیش کرتا تھا۔

ٹائپسٹ کی حیثیت میں وہاں کام کرتے ہوئے اسے ایک ہی ماہ گزرا تھا کہ اس نے محسوس کیا، چھوٹے بیگ صاحب اس میں خصوصی دلچسپی لینے لگے تھے۔ صندل کے حُسن و جمال میں کوئی کلام نہیں تھا پھر اس کی سانولی رنگت نے اس کے سراپا میں ایک پراسرار سی جاذبیت بھر دی تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھ اس کے چہرے پر چپک کر رہ جاتی۔

عورت، مرد کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتی ہے اور اس قسم کے معاملات میں وہ کچھ زیادہ ہی زود حسی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ مرد کو تو صرف شک ہوتا ہے لیکن عورت کو یقین ہو جاتا ہے۔ صندل کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صفدر بیگ اس میں بھرپور دلچسپی لے رہا ہے۔ صفدر نے کامرس سے ماسٹرز کرنے کے بعد آفس میں باقاعدہ بیٹھنا شروع کر دیا تھا اور

فرم کے معاملات کو پوری طرح دیکھ رہا تھا۔ بڑے بیگ صاحب یعنی صمد بیگ بہت کم دفتر آتے۔ یہ شخص شراب کو پانی کی طرح پیتا اور بسا اوقات نشے میں ہی رہتا تھا۔ صاعقہ دو تین مرتبہ اسے گھر سے نکال بھی چکی تھی۔ وہ صمد کے شرابی دوستوں سے عاجز تھی۔ صاعقہ نے ایک دو ماہر ڈاکٹروں سے صمد کا علاج کرانے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ صمد کے شرابی دوست مختلف حیلے بہانوں سے اس کا پرہیز تڑوا دیتے۔ اس طرح ڈاکٹروں کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ ترکِ شراب نوشی کے سلسلے کی ساری کوششیں بار آور نہ ہوئیں تو صاعقہ نے اپنے شوہر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ صاعقہ ایک حوالے سے خاصی مطمئن تھی کہ صمد اس کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ مے نوشی کے علاوہ وہ اس کی ہر بات مانتا تھا۔ صاعقہ صحیح معنوں میں ایک زوردار اور دھانسو عورت تھی جس نے گھر کے علاوہ دفتر کا نظم و نسق بھی سنبھال رکھا تھا۔ صفدر بیگ کی حیثیت اس کے ایک آلہ کار سے زیادہ نہیں تھی۔ بزنس کے معاملات کے لئے اس کا ایک بھائی صغیر شاہ بھی ہر وقت معاونت کو تیار رہتا۔ صمد بیگ اس پورے سیٹ اپ میں عضوِ معطل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا جسے شراب پینے کے سوا اور کسی شے سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

صاعقہ کو آفس میں سب میڈم کہتے تھے۔ وہ بہت رعب دار اور دبدبے والی عورت تھی۔ پورا اسٹاف اس کی موجودگی میں سہا اور ڈرا رہتا۔ صندل بھی اس کے تیور سے بہت خوف کھاتی تھی اور خاص طور پر جب سے اس نے صفدر کی خود میں دلچسپی محسوس کی تھی، وہ میڈم کی طرف سے کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گئی تھی۔

چند روز اسی کیفیت میں گزرے پھر بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ ایک دن صفدر نے صندل کو اپنے کمرے میں بلایا اور کھل کر اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ وہ صفدر کے کمرے میں پہلے بھی کئی مرتبہ جا چکی تھی مگر وہ اب تک اشاروں کنایوں میں بات کرتا رہا تھا۔

صندل نے تحمل سے اس کی بات سنی اور آخر میں کہا۔ ''کیا آپ کو بھی مجھ سے اسی قسم کی محبت ہو گئی ہے جیسی اکثر باسز کو اپنے دفتر میں کام کرنے والی خوبصورت لڑکیوں سے ہو جاتی ہے؟''

''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔'' صفدر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تم سے فلرٹ نہیں کر رہا۔''

''شروع میں سب یہی کہتے ہیں، بعد میں سب وہی کرتے ہیں۔'' صندل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پہلے خوبصورت نظر آنے والی ہر لڑکی انہیں محبوبہ دکھائی دیتی ہے۔ اس سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ اس کے ناز نخرے بھی اٹھاتے ہیں، دل کھول کر یا ہاتھ روک کر اس پر مال بھی خرچ کرتے ہیں اور پھر کچھ دیر بعد اس سے جان چھڑا کر دوسری کا رخ کر لیتے ہیں۔''

صفدر نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے، تمہیں اس قسم کا کوئی تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔''

صندل کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے، میں ابھی کسی باس کی محبوبہ کا درجہ حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن جاننے کے لئے ذاتی تجربہ ضروری

نہیں۔ انسان کو اللہ نے آنکھیں اور کان دیئے ہیں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کیوں دی ہے۔ دوسروں کے تجربات سے بھی تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔''

''یقیناً'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں اور اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ تم ایک ذہین لڑکی ہو۔ میں تمہاری ذہانت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ شاید یہ تمہارے حُسن اور ذہانت کا امتزاج ہے جس نے مجھے تمہاری طرف مائل کیا ہے۔ میں واقعی تم سے محبت کرنے لگا ہوں صندل!''

صفدر کے لہجے میں اتنی شدت تھی کہ صندل کو لگا، وہ صد فیصد سچ بول رہا ہے۔ اس کا دل فرطِ جذبات سے دھڑکنے لگا۔ ایک لڑکی کے لئے یہ بڑے فخر کا مقام ہوتا ہے کہ کوئی پوری سچائی کے ساتھ اس کے سامنے اقرارِ محبت کرے...... اور سامنے والا شخص اگر صفدر بیگ کی طرح ہینڈسم، تعلیم یافتہ اور دولت مند بھی ہو تو اس فخر میں آٹھ چاند لگ جاتے ہیں۔ لیکن صندل کوئی نادان لڑکی نہیں تھی کہ اس قسم کی باتوں پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتی۔ اس نے اپنے دل کی حالت کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

''میں کیسے یقین کر لوں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ کیوں کہ میں جانتی ہوں، مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''تمہاری خاص بات تمہیں نظر نہیں آ سکتی۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''آنکھ ہمیں ہر منظر دکھاتی ہے مگر خود کو نہیں دیکھ سکتی۔'' پھر اچانک اس نے سوال کیا۔ ''کیا تم اپنی آنکھ کو دیکھ سکتی ہو؟''

صندل نے بے اختیار پلکیں جھپکائیں اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کوئی اپنی آنکھیں کس طرح دیکھ سکتا ہے۔ اس کے لئے آئینے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''ایگزیکٹلی!'' وہ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں یہی بات تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خود کو دیکھنے کے لئے کسی دوسرے دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارا حُسن، ذات کی خوبیاں اور شخصیت کی کشش میرے دل کے آئینے میں اجاگر ہو رہی ہے اور اسی بنا پر مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔''

صندل اپنی اس شاعرانہ تعریف پر شرما کر رہ گئی۔ اس شرماہٹ میں ایک عجیب قسم کی سرشاری بھی شامل تھی۔ گویا اس نے صفدر بیگ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

صفدر نے کہا۔ ''میں اپنی محبت کو ثابت کرنے کے لئے اس سے زیادہ الفاظ استعمال نہیں کر سکتا۔ ہاں، تمہارے پاس آزمائش کا کوئی طریقہ ہو تو تم مجھے اس میں سے گزار سکتی ہو!''

صندل خاموشی سے سر جھکا کر اس کے کمرے سے نکل آئی۔

وہ صفدر بیگ کے کمرے سے تو نکل آئی تھی لیکن اس کی یاد بھی صندل کے ذہن سے چپک کر باہر آ گئی تھی۔ اور پھر یہ یاد اس کے ساتھ گھر تک چلی گئی۔ چند روز تک یہ یاد اس کے ساتھ گھر سے

دفتر اور دفتر سے گھر جاتی آتی رہی۔ دفتر میں صفدر بیگ سے سامنا ہونا ناگزیر تھا لہٰذا اس یاد کی گاہے بہ گاہے تجدید ہوتی رہی۔ گھر میں تنہائی میسر آتے ہی جب وہ صفدر کے بارے میں سوچتی تو اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگتا۔ ایک ہفتے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے بھی صفدر بیگ سے محبت ہوگئی تھی۔

ایک روز صندل نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صفدر سے سوال کیا۔ ''اگر میں یقین کرلوں کہ آپ کو مجھ سے واقعی محبت ہوگئی ہے تو آپ اپنی اس محبت کے بدلے میں مجھ سے کیا چاہیں گے؟''

وہ اس وقت صفدر بیگ کے کمرے میں بیٹھی تھی اور ابھی تک اس نے صفدر کو اپنے دل کے احوال سے آگاہ نہیں کیا تھا، تاہم اشاروں کنایوں سے اس نے اتنا ضرور واضح کردیا تھا کہ وہ صفدر کو پسند کرنے لگی ہے یا یہ کم ازکم اس نے صفدر کے اظہارِ محبت سے کوئی غلط مطلب نہیں لیا۔

صفدر بیگ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''اگر میں تمہارے سوال کے جواب میں یہ کہوں کہ میری محبت کے بدلے میں تم بھی مجھ سے محبت کرو تو یہ خودغرضی کی عظیم الشان مثال ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا، تمہارے سوال کا کیا جواب دوں۔ کیا اس سلسلے میں تم میری مدد کرسکتی ہو؟''

''مم...... میں؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے اپنے باس کو دیکھنے لگی۔

وہ بولا۔ ''تم چاہو تو اس مرحلے پر واقعی میری مدد کرسکتی ہو۔''

''وہ کس طرح؟'' صندل نے پوچھا۔

''اس طرح۔''

صفدر بیگ نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم خود کو میری جگہ تصور کرو اور فرض کرو، میں یہی سوال تم سے کررہا ہوں۔ اس صورت میں تمہارا جواب کیا ہوگا؟''

اس نے گھما پھرا کر بڑی پتے کی بات کی تھی۔ صندل نے چند لمحے سوچا اور پھر اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

''صفدر صاحب! اگر مجھے آپ سے محبت ہوجاتی اور آپ پوچھتے کہ میں اپنی اس محبت کے بدلے میں آپ سے کیا چاہتی ہوں تو میرا اٹل جواب ہوتا...... شادی۔''

''میں بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

''کیا؟'' صندل کو شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک جذب کے عالم میں صندل کو تکتا رہا پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''یقین کرو صندل! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن یہ...... کیسے ممکن...... ہوسکے گا؟''

''میں پوری کوشش کروں گا۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''آجائے گا۔''

صندل قدرے مطمئن ہوگئی۔ صفدر آئندہ آدھے گھنٹے تک اسے یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرکے رہے گا۔ وہ خوشی خوشی اس کے کمرے سے نکل آئی۔

صفدر بیگ کو پورا اعتماد تھا کہ وہ اپنی پسند کو پالے گا۔ صندل کے حصول میں اسے دور دور تک کوئی رکاوٹ نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن اس کا خیال یک سر غلط ثابت ہوا۔ بظاہر انتہائی آسان نظر آنے والا معاملہ اس وقت الجھ کر رہ گیا جب اس سلسلے میں اس نے اپنی ماں صاعقہ بیگم سے بات کی۔ اپنی ماں کا جواب سن کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔

''نن...... نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''یہ نہیں ہوسکتا...... کبھی نہیں!''

''مگر کیوں نہیں ہوسکتا؟'' صفدر نے احتجاج کیا۔ ''صندل میں کس چیز کی کمی ہے؟''

''اس میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ ایک غریب لڑکی ہے۔'' صاعقہ نے بڑی رعونت سے کہا۔

''غریب ہونا کوئی جرم نہیں!'' وہ سٹپٹا کر بولا۔

''جرم!'' صاعقہ نے عجیب نظروں سے بیٹھے کو دیکھا۔ ''ٹھیک کہا تم نے! غریب ہونا واقعی کوئی جرم نہیں بلکہ ایک گالی ہے۔'' پھر چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''صفدر! اس لڑکی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ وہ تمہارے لائق نہیں۔''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''میں نے پوچھا، صندل میں کیا کمی ہے؟ آپ نے کہا، وہ ایک غریب لڑکی ہے۔ اب آپ کہہ رہی ہیں، وہ میرے لائق نہیں!'' وہ خاموش ہوکر تھوڑی دیر تک اپنی ماں کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ اللہ نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے۔ اگر صندل کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''بہت فرق پڑتا ہے۔ میں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگنے دوں گی۔''

''آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔''

''وہ اس لئے کہ تم نے آج کل اپنی سمجھ میں صندل کو بٹھا رکھا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اسی لئے میری باتیں تمہارے سر کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔''

وہ بے بسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

صاعقہ بیگم نے کہا۔ ''صفدر! ان غریب گھرانے کی لڑکیوں کو تم نہیں جانتے۔ یہ بہت عیار اور مکر و فریب کی ماہر ہوتی ہیں۔ اپنی اداؤں سے امیر زادوں کو پھانسنے کا ہنر و فن انہیں بخوبی آتا ہے۔ یہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتی ہیں۔''

"آپ یقین کریں، صندل ایسی لڑکی نہیں!"

"تم اپنی فرم کی ایک معمولی ٹائپسٹ کی وکالت کر کے یہ ثابت کر رہے ہو کہ اس کا جادو تم پر اثر کر رہا ہے۔" صاعقہ بیگم نے تنبیہی انداز میں انگلی کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی ماں کی باتوں اور تجربے پر اس دو ٹکے کی چھوکری کو ترجیح دے رہے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے!" وہ جھلا کر بولا۔

صاعقہ بیگم نے اصراری لہجے میں کہا۔ "بالکل یہی بات ہے صفدر۔"

"میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔" صفدر نے بے بسی کے عالم میں کہا۔ "آپ یقین کریں، اس میں صندل کا کوئی ہاتھ نہیں رہا۔ میں خود اس کی طرف بڑھا تھا۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں، اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں صندل سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

صاعقہ چند لمحات تک اپنے بیٹے کو گھورتی رہی، پھر دوٹوک الفاظ میں حکم صادر فرما دیا۔ "یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی قیمت پر نہیں ہو سکتی۔"

"آپ زیادتی کر رہی ہیں!"

"تم ایک معمولی ملازمہ کی فریبی محبت کے نشے میں ماں کو ظالم کہہ رہے ہو صفدر۔" صاعقہ نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ "جانتے ہو، تم کتنے بڑے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو؟"

"آپ میری بات کو سمجھ نہیں پا رہی ہیں!" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

صاعقہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں تمہاری بات اور صندل کے ہاتھ کو بخوبی سمجھ رہی ہوں۔ تم پہلی فرصت میں اس لڑکی کو اپنے دل و دماغ سے نکال دو ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔"

"میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ مجروح لہجے میں بولا۔ "میں صندل کو اپنے اندر سے کسی بھی صورت نہیں نکال سکتا۔"

"تو پھر میں پہلی فرصت میں اس فتنہ لڑکی کو اپنی فرم سے نکال رہی ہوں۔" صاعقہ بیگم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اور اگر ضرورت پڑی تو میں اسے......"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی...... اگر ضرورت پڑی تو وہ اسے دنیا سے بھی نکال دے گی!

صفدر نے ماں کو جلال میں دیکھا تو خاموشی اختیار کر لی۔ اس موقع پر وہ صاعقہ سے الجھ کر معاملے کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ صاعقہ عجیب مزاج کی عورت تھی۔ اسے گھر سے زیادہ باہر کی فکر رہتی۔ صفدر کا خیال تھا کہ اگر وہ اس کے باپ صمد بیگ پر مناسب توجہ دیتی تو اس کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی۔ صاعقہ ظاہر یہی کرتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے لئے بہت فکرمند ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ صمد کا عضو معطل بنے رہنا اس کے مفاد میں تھا۔ اس طرح وہ زیادہ سہولت کے ساتھ من مانیاں کر سکتی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت پارٹی بازی اور تفریحات میں گزرتا یا وہ دفتر کو بھرپور ٹائم

دیتی تھی کیونکہ وہ آمدنی کی ایک ایسی مشین تھی جس کی دیکھ بھال از حد ضروری تھی۔

صفدر بیگ گیارہ بجے تک دفتر پہنچا تو صندل کو سیٹ سے غائب پایا۔ صندل کی ڈیوٹی نائن ٹو فائیو تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ دفتر میں قدم رکھے تو صندل سیٹ پر موجود نہ ہو۔ چپراسی صفدر کے لئے پانی لے کر آیا تو اس نے اس سے صندل کے بارے میں استفسار کیا۔

"کیا آج صندل نہیں آئی؟"

"وہ تو آ کر چلی گئیں۔" چپراسی نے بتایا۔

"کہاں چلی گئیں؟"

"پتہ نہیں صاحب۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "صغیر صاحب نے انہیں کمرے میں بلایا تھا۔ اس کے بعد ہی صندل اپنا پرس اٹھا کر چلی گئیں۔ آپ اس کے بارے میں صغیر صاحب سے پوچھ لیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" اس نے چپراسی سے کہا۔

صغیر شاہ، صاعقہ کا بھائی تھا اور فرم میں جنرل منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ خاص طور پر جب سے صمد بیگ نے فرم کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی، صغیر شاہ فعال ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بہن کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ صفدر کو اپنا ماموں کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ ماں کی وجہ سے مجبور تھا اس لئے وہ صغیر شاہ کو برداشت کر لیتا تھا۔

صفدر نے انٹرکام پر صغیر شاہ سے صندل کے بارے میں پوچھا۔ "کیا صندل آپ کو کچھ بتا کر گئی ہے؟"

"برخوردار! اس نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ اس کے اس انداز سے صفدر کو چڑ تھی۔ "بلکہ میں نے اسے کچھ بتایا ہے جسے سن کر وہ چلی گئی، ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔"

صفدر کو ماموں کی بات سن کر غصہ آ گیا۔ "آپ نے اس سے ایسی کیا بات کہہ دی کہ وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی؟" اس نے برہمی سے پوچھا۔

"میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا برخوردار!" صغیر شاہ نے اپنا انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو میڈم کے احکام کی تعمیل کی ہے۔"

صغیر شاہ بھی عام ملازمین کی طرح صاعقہ بیگم کو میڈم ہی کہتا تھا۔ شاید اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ بہن کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے اور آفس ڈیکورم کی پابندی خود پر بھی لازم سمجھتا ہے۔

گزشتہ روز صاعقہ اپنے عزائم کا کھل کر اظہار کر چکی تھی۔ تاہم پھر بھی صفدر بیگ نے تصدیق کرنا ضروری سمجھا اور صغیر شاہ سے پوچھا۔ "میڈم نے آپ کو صندل کے بارے میں کیا احکام دیئے تھے؟"

"ڈسمس......فنش!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میڈم نے رات ہی فون کر کے مجھے یہ فرض سونپ دیا تھا۔ میں نے آتے ہی اس کا حساب کر دیا۔ وہ چلی گئی۔ اب ہمیں اپنے آفس کے لئے ایک نئی ٹائپسٹ کی ضرورت ہے۔ میں نے اخبار کے لئے اشتہار بک کروا دیا ہے۔ کل سے امیدوار آنا شروع ہو جائیں گے۔ آپ انٹرویوز کیلئے تیار ہو جائیں۔" اس کے لہجے میں پوشیدہ طنز کو صفدر نے فوراً محسوس کر لیا۔

"یہ نیک کام بھی آپ ہی کریں صغیر صاحب!" اس نے جھلاہٹ آمیز انداز میں کہا اور ریسیور کو کریڈل کر دیا۔

وہ سارا دن صفدر نے دفتر میں بے چینی سے گزارا۔ دوسرے روز اس کے لئے صندل کا فون آ گیا۔ نہایت ہی مختصر گفتگو کر کے انہوں نے کسی پُرسکون مقام پر ملاقات طے کر لی۔ شام پانچ بجے وہ دونوں اعلیٰ درجے کے ایک ریسورنٹ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

صفدر نے اس سے بھرپور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ ممی کی وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو، میں ایک آدھ دن میں تمہیں کسی بھی اچھے آفس میں رکھوا دوں گا۔ میرے تعلقات بہت دور تک ہیں۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "صفدر! مجھے فی الحال نوکری کی نہیں، بلکہ تمہاری ضرورت ہے۔" جب سے وہ دونوں آپس میں بے تکلف ہوئے تھے صندل "آپ" سے "تم" پر اتر آئی تھی۔

"تمہارے تعلقات بہت دور تک ہیں، یہ بات مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے تعلقات جلد از جلد مجھ تک محدود ہو جائیں۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ جلد از جلد ہماری شادی ہو جائے۔" صفدر نے صدق دل سے کہا۔ "اسی سلسلے میں، میں نے اپنی ممی سے بات کی تھی جس کے نتیجے میں دوسرے روز تمہیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ اس کا مطلب سمجھتی ہو نا؟"

"خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" وہ گمبھیر آواز میں بولی۔ "تمہاری ممی اور میری سابق میڈم اس رشتے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔"

"انہوں نے اس انکار کی کوئی وجہ تو بتائی ہو گی؟"

صفدر نے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔ "معاشی اور معاشرتی تفاوت!"

"اوہ!" صندل ایک گہری سانس لے کر رہ گئی تھی پھر پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے، وہ تمہاری شادی کسی بہت ہی مالدار گھرانے کی لڑکی سے کرانا چاہتی ہیں۔"

"نظر تو یہی آ رہا ہے۔" صفدر نے کہا۔ "لیکن میں صرف اور صرف تمہی سے شادی کروں گا۔"

صندل نے استفسار کیا۔ "تمہاری ممی نے تمہارے لئے کوئی لڑکی تو دیکھی ہو گی؟"

"فی الحال یہ بات میرے علم میں نہیں۔" وہ پوری سچائی سے بولا۔ "اگر ان کی نظر میں کوئی لڑکی ہے بھی تو اس کا ذکر ابھی میرے سامنے نہیں آیا۔"

"اب آئے گا...... بہت جلد آئے گا!" صندل نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

صفدر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم فکر نہ کرو صندل! میں ہر قیمت پر تمہیں اپناؤں گا، چاہے اس کے لئے مجھے پورے زمانے کی مخالفت مول کیوں نہ لینا پڑے۔"

"دیکھو صفدر! میں ایک حقیقت پسند لڑکی ہوں۔" صندل یک دم بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔ "میرا اب تک کا تجزیہ یہ ہے کہ تمہارے گھر کے سارے فیصلے تمہاری ممی ہی کرتی ہیں۔ گھر کیا، آفس اور فرم کے معاملات میں بھی وہی اتھارٹی ہیں۔ تمہارے ڈیڈی کی حیثیت شاملِ باجا سے زیادہ نہیں۔ وہ ایک خاموش شو پیس کی مانند اس سیٹ اپ میں موجود ہیں۔ ان حالات میں تمہارے لئے بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔" وہ چند لمحے خاموش رہ کر کسی سوچ میں ڈوبی رہی پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "میں کسی نہ کسی طرح اپنے والدین کو اس رشتے کے لئے تیار کر لوں گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ لیکن تم کیا کرو گے؟ شادی میں دونوں خاندانوں کی شرکت لازمی ہے اور شرکت سے قبل ان کی رضامندی ضروری ہے۔"

صفدر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "میں ایک مرتبہ پھر ممی سے بات کروں گا۔ اگر انہوں نے اس سلسلے میں کسی لچک کا مظاہرہ نہ کیا تو پھر میں کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہوں۔"

"مثلاً؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"ہم کورٹ میرج کر لیں گے!"

"کورٹ میرج!" صندل نے حیرت سے اس کے الفاظ دہرائے۔

صفدر نے کہا۔ "یہ آخری راستہ تو ہمارے سامنے ہر وقت کھلا ہے نا!"

"تم یہ راستہ اس لئے دیکھ رہے ہو کہ تمہاری ممی اس رشتے کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔" صندل نے کہا۔ "لیکن اس راستے پر چل کر میری پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ میں نے کہا نا، میں اپنے والدین کو اس شادی کے لئے تیار کر لوں گی۔"

صفدر نے کہا۔ "میں تمہاری پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ فرض کرو، اگر تم اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتی ہو تو پھر بھی مسائل کھڑے ہوں گے۔ تمہارے والدین یہ ضرور چاہیں گے کہ میرے والدین اس شادی میں پیش پیش ہوں جو کہ ناممکن ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے!" صندل نے پُرتشویش انداز میں کہا۔

صفدر بولا۔ "تم فی الحال اپنے ذہن کو کسی پریشانی میں نہ الجھاؤ۔ میں پہلے ممی سے فائنل بات تو کر لوں۔ انشاءاللہ کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔"

صندل قدرے مطمئن ہوگئی۔

دو روز بعد ایک مناسب موقع دیکھ کر صفدر نے صاعقہ سے بات کی۔ صاعقہ پتہ نہیں، کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ اپنی بات پر ڈٹی رہی کہ کسی بھی صورت وہ صندل کو اپنی بہو نہیں بنائے گی کیونکہ وہ اس گھر اور اس کے بیٹے کے لائق نہیں۔

''یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے ممی؟'' صفدر نے مایوسی سے پوچھا۔

''اگر صندل سے شادی کرنے کی اجازت نہ دینے کی بات ہے تو واقعی یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''اور اگر صرف تمہاری شادی کا معاملہ ہے تو میرے ذہن میں اس کے لئے ایک نہایت ہی عمدہ منصوبہ ہے۔''

''کیسا منصوبہ ممی؟'' صفدر نے حیرت بھری نظر سے اپنی ماں کو دیکھا۔

اس نے بتایا۔ ''میں تمہاری شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہوں۔''

''کہاں؟...... کس سے؟......'' ایک سانس میں اس نے دو سوال پوچھ ڈالے۔

''ہے ایک بہت ہی اچھی لڑکی میری نظر میں۔'' صاعقہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''کون ہے وہ؟'' صفدر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

صاعقہ نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''اس لڑکی کا نام صدف ہے۔ تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔''

''آپ کس صدف کی بات کر رہی ہیں؟'' وہ چونک کر بولا۔ ''کہیں آپ کا اشارہ صغیر ماموں کی بیٹی صدف کی طرف تو نہیں؟''

''میں بالکل اسی صدف کا ذکر کر رہی ہوں۔''

صفدر نے برا سا منہ بنایا۔ ''کیا میں اس سے شادی کروں گا؟''

''کیوں، میری بھتیجی میں کیا خرابی ہے؟''

''بات خوبی یا خرابی کی نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں صدف کو پسند نہیں کرتا۔'' صفدر نے بیزاری سے کہا۔

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''تم تو اپنے ماموں کو بھی پسند نہیں کرتے...... بلکہ ننھیال والوں سے تو تمہیں جیسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ تمہارے ددھیال کے کرتوت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اپنے شرابی باپ کو ہی دیکھ لو۔ کیا ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہیں؟''

صاعقہ ایک زبان دراز و تیز طرار عورت تھی۔ وہ جب بولنے پر آتی تو پھر کسی کی نہیں سنتی تھی۔ صفدر کے لئے ماں کے رشتے کا احترام واجب تھا۔ اس لئے خاموشی سے اس کی کڑوی کسیلی باتیں سنتا رہا۔ آخر میں اس نے متحمل لہجے میں کہا۔

''بات یہ ہے ممی کہ اگر میں صغیر ماموں اور اس کی بیٹی صدف کو پسند نہیں کرتا تو یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ بس وہ لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان کی آڑ میں آپ خواہ مخواہ ڈیڈی کو برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ شراب نوشی کو ہمارے معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا، میں یہ بات مانتا ہوں لیکن ہم معاشرے کے جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں یہ عام سی بات ہے۔ اس کی وجہ سے آپ کو منہ چھپا کر جینے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''اب تم مجھے اچھے برے کی تمیز سکھاؤ گے!'' وہ طیش میں آگئی۔

''آپ میری بات کو غلط رنگ دے رہی ہیں۔''

''تم کچھ بھی کہو لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو۔'' صاعقہ نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''تم چاہے صغیر اور صدف کو پسند کرو یا نہ کرو مگر میرے لئے وہ لوگ بہت اہم ہیں۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہو گا کہ میری خواہش کے سامنے سر جھکا دو۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ کو میری خواہش کا کوئی احساس نہیں؟''

''تم ابھی نادان ہو، صندل کی مکاری کو محبت سمجھ رہے ہو!''

''اگر مجھے اپنی نادانی کے فیصلے پر کبھی پچھتانا پڑا تو آپ سے شکایت نہیں کروں گا۔''

''میں تمہیں ہرگز ہرگز اس شادی کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

صفدر نے کہا۔ ''پھر مجھے اور کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''تم جو بھی فیصلہ کرو گے اس پر عمل سے پہلے مجھے ضرور آگاہ کرو گے صفدر!'' صاعقہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں ایک ماں کی حیثیت سے تمہیں یہ حکم دیتی ہوں۔''

اس نے ''ہاں'' یا ''نہ'' میں کوئی جواب نہیں دیا بلکہ مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔ ایک بات وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ صندل کو اپنانے کے لئے اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا اور کوئی صورت تاحدِ نگاہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ ماں کو راضی کرنے میں ناکام رہا تھا۔ صاعقہ کی مرضی اور شمولیت کے بغیر صندل کے والدین کو مطمئن کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس بات کے بھی امکانات نظر نہیں آتے تھے کہ وہ صدیق اور صابرہ کو اعتماد میں لے کر کوئی قدم اٹھائے۔ اس قسم کی صورت حال میں لڑکی کے والدین کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس نے کورٹ میرج کا فیصلہ کر لیا۔

آئندہ روز صندل سے ملاقات ہوئی تو اس نے اسے ساری کہانی سنا ڈالی۔ اس نے خاموشی سے صفدر کی بات سنی اور کہا۔ ''صدف کو تو ایک دو مرتبہ میں نے بھی آفس میں دیکھا ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے نا جسے ماڈلنگ کا بہت شوق ہے۔ وہ صغیر صاحب سے ملنے آئی تھی۔''

''تم نے صحیح پہچانا۔'' صفدر نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایسی ہی بات ہے جیسے بھینس کو ماڈلنگ کا شوق چڑھ جائے۔ ہمارے ملک میں یہی تو ایک مصیبت ہے۔ جو کام جس شخص کا نہیں ہوتا، وہ اسے کرنے پر بضد نظر آتا ہے۔ کیا صدف کسی بھی زاویے سے ماڈل نظر آتی

ہے؟"

"اب میں تمہاری کزن پر کوئی تبصرہ کرتے ہوئے اچھی نہیں لگوں گی۔" صندل نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے پہلے ہی اسے ایک معقول جانور سے تشبیہ دے دی ہے۔"

صفدر نے کہا۔ "خدا کی پناہ! قد پانچ فٹ، وزن ستر کلوگرام، کمر چھتیس انچ اور عمر تیس سے نکلتی ہوئی۔ ان خصوصیات پر ماڈلنگ کی شوقین ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ میں اپنی تشبیہ پر ثابت قدم ہوں۔"

"صفدر!" وہ شرارت آمیز انداز میں اسے سرزنش کرتے ہوئے بولی۔ "یہ مت بھولو کہ وہ تمہاری امیدوار ہے تمہاری امی اسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں...... یعنی صدف کو تمہاری بیوی بنانا چاہتی ہیں۔"

"میری بیوی...... مائی فٹ!" صفدر نے حقارت سے کہا اور فرش پر زور سے پاؤں مارا۔

آئندہ ہونے والی دو تین ملاقاتوں میں یہ طے پا گیا کہ وہ دونوں کورٹ میرج کریں گے۔ اس شادی کو وہ بعد میں حالات کا رخ دیکھتے ہوئے ظاہر کریں گے۔ صندل کے لئے، اپنے والدین کے علم میں لائے بغیر عدالت میں جا کر شادی کرنا اگرچہ خاصا تکلیف دہ مرحلہ تھا لیکن اس اقدام کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا، بعد میں اپنے والدین کو منا لے گی۔ اسے صفدر کی محبت پر پورا بھروسا تھا اس لئے آنکھیں بند کر کے وہ اس کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ محبت میں لوگ نتائج کی پروا نہیں کرتے!

محبت کی اس شادی کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہو گیا جو ابتدا میں خاصا تلخ تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تلخی میں کمی آ گئی بلکہ اس تلخی کی جگہ خوشگواریت نے لے لی۔ صندل نے رفتہ رفتہ اپنے والدین کو راضی کر لیا۔ صفدر بھی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ صاعقہ بیگم شروع میں صندل کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی لیکن ایک ماہ بعد ہی اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔ اس نے صفدر سے کہہ کر صندل کو بنگلے میں بلا لیا یعنی اسے اس کا جائز مقام دے دیا۔ شادی کے فوراً بعد صندل کو صفدر نے کرائے کے فلیٹ میں رکھا تھا۔ صفدر کو اپنی ماں کی اس تبدیلی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کایا پلٹ پر حیران تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے اس مہربانی میں صاعقہ کی کوئی پوشیدہ چال ہو! اس نے صندل کو محتاط رہنے کی ہدایت بھی کی لیکن صندل نے اسے صفدر کا وہم قرار دے کر بات کو مذاق میں اُڑا دیا۔ وہ صفدر کو اور اپنے جائز مقام کو حاصل کر کے اس قدر خوش تھی کہ منفی انداز کی باتوں کو ذہن میں جگہ دینے پر قطعاً تیار نہ تھی۔

بنگلے میں آمد کے بعد چند روز تو خیریت سے گزر گئے اس کے بعد ساس بہو کا ازلی دنگل شروع ہو گیا۔ اس سلسلے میں صاعقہ ہمیشہ میدان مار جاتی کیوں کہ صندل اسے طرح دے جاتی تھی اور ان یک طرفہ معرکوں کو اپنے شوہر سے بھی چھپا لیتی۔ مگر پھر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

صاعقہ ایک نئے روپ سے اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ بڑی ہوشیاری سے وار کرتی۔ اسے جو کچھ بھی کہنا کوسنا ہوتا وہ صفدر کی غیر موجودگی میں کرتی اور صفدر کے ہوتے ہوئے وہ انتہائی میٹھی اور پُرخلوص بن جاتی۔ وہ یہی ظاہر کرتی جیسے صندل کو ماں کا پیار دے رہی ہو۔ صندل نے واضح طور پر محسوس کیا، صاعقہ اس سے بھرپور انتقام لے رہی تھی مگر اس طرح کہ اس پر کوئی الزام نہ آئے۔

صندل کے ہاتھ سے صبر کا دامن اس وقت چھوٹ گیا جب صاعقہ کے ایما پر صغیر شاہ اور اس کی بیٹی صدف نے مستقل بنگلے پر ڈیرا ڈال دیا۔ صغیر شاہ تو صرف نفرت آمیز نگاہ سے اسے گھورتا تھا لیکن صدف کھلے عام ٹونٹنگ کرتی۔ اس معاملے میں اسے اپنی پھوپی کی بھرپور حمایت بھی حاصل تھی۔ صندل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس نے ان لوگوں کا بگاڑا کیا تھا۔ وہ تو حتیٰ الوسع ان سے بہتر برتاؤ کرنے کی کوشش کرتی۔ جب پانی اس کے سر سے اوپر ہو گیا تو اس نے صفدر سے ان لوگوں کے رویوں کی شکایت کی۔

"مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آ رہا صندل۔" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں تو محسوس کر رہا ہوں، سب لوگ تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں۔"

صندل نے کہا۔ "تمہارے سوا اس گھر کے ہر فرد کے دو چہرے ہیں۔ آنٹی صاعقہ، انکل صغیر اور صدف تمہارے سامنے بڑا مثبت کردار ادا کرتے ہیں لیکن جیسے ہی میں اکیلی ان کے ہتھے چڑھتی ہوں، وہ جلادوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ لگتا ہے، وہ مجھے اس گھر سے نکالنے پر کمربستہ ہیں۔ مجھے پتا تھا، تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے کیوں کہ تم نے ان کرداروں کا دوسرا چہرہ نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے بلکہ روز دیکھتی ہوں۔"

صفدر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ سردست صندل کو جھٹلا سکتا تھا اور نہ ہی اپنے گھر کے تین افراد کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ "صندل! تم اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر لو۔ میں کسی مناسب موقع پر ممی سے بات کروں گا۔"

"اور یہ جو دو باپ بیٹی ہیں؟"

"وہ چند روز کے مہمان ہیں۔ واپس چلے جائیں گے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں صفدر! اب وہ ہمیشہ اسی بنگلے میں رہیں گے۔"

"یہ بات تم کس بنا پر کہہ رہی ہو؟"

"میں نے آنٹی صاعقہ اور انکل صغیر کو باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔" صندل نے کہا۔ "وہ دونوں کچھ اس قسم کی پلاننگ کر رہے ہیں کہ صغیر شاہ اپنے فلیٹ کو کرائے پر اٹھا دیں اور خود دونوں باپ بیٹی اس بنگلے کو اپنا مستقل مسکن بنا لیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" صفدر اچھل پڑا۔

صندل نے کہا۔ "یہ تقریباً ہو چکا ہے صفدر! اور اس میں تمہاری ممی کی رضا شامل ہے۔"

"میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ مضطرب ہوگیا۔

"اسی لئے تم مطمئن بیٹھے ہو۔"

"میں ممی سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔"

"ضرور کرو...... مگر مجھے کامیابی کی امید نہیں۔" صندل مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

صفدر نے اگلے روز صاعقہ بیگم کو ٹٹولا تو صندل کا کہا ہوا سچ نکلا۔ صغیر شاہ اپنا فلیٹ کرائے پر اٹھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور جہاں تک باپ بیٹی کے بنگلے پر منتقل ہونے کی بات تھی تو وہ یہ کام کرہی چکے تھے۔ بس ساز و سامان کی شفٹنگ باقی تھی۔

"یہ تو ٹھیک نہیں ہوگا ممی!" صفدر نے کمزور سا احتجاج کیا۔

"تمہیں کیا اعتراض ہے ان کے یہاں آنے پر؟"

"کیا آپ کو یہ سب مناسب لگتا ہے؟" صفدر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

صاعقہ نے پُر اعتماد انداز میں جواب دیا۔ "ہاں، مجھے تو یہ سب کچھ انتہائی معقول اور مناسب لگتا ہے لیکن میں محسوس کر رہی ہوں کہ تمہیں میرے بھائی اور بھتیجی کی مستقل رہائش سے خاصی تکلیف پہنچی ہے۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کر کے بیٹے کو گھورا اور معنی خیز انداز میں بولی۔ "اور میں اس کی وجہ بھی جانتی ہوں۔"

صفدر الجھن زدہ نظر سے ماں کو دیکھتا رہا۔ اس نے استفسار کیا۔ "صفدر! کیا تم وہ وجہ جاننے کی خواہش نہیں رکھتے ہو؟"

"آپ خود ہی بتا دیں۔" وہ بددلی سے بولا۔

وہ بولی۔ "اس سلسلے میں صندل نے تمہارے کان بھرے ہوں گے۔ میں اور میرے رشتے دار اس کی آنکھ میں خار کی طرح کھٹکتے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ممی۔"

"بالکل ایسی ہی بات ہے ورنہ تم مجھ سے انکوائری نہ کر رہے ہوتے!"

"میں نے تو صرف آپ سے ایک بات پوچھی تھی۔"

"تم جورو کے غلام ہو صفدر!" صاعقہ نے سخت لہجے میں کہا۔

اب صفدر کی برداشت بھی جواب دے گئی۔ وہ خاصی دیر سے صبر کئے بیٹھا تھا، اچانک پھٹ پڑا۔ اس نے ان تمام رویوں کا ذکر کیا جن کے بارے میں صندل نے اسے بتایا تھا۔ صاعقہ اپنے خلاف بہو کی شکایتیں سن کر آگ بگولا ہوگئی۔ اس روز وہ خاصی چیخی چلائی لیکن دوسرے روز حالات معمول پر آگئے۔

صفدر نے تنہائی میں صندل کو سمجھایا کہ وہ درگزر کی عادت ڈالے۔ وہ ماں سے کسی قسم کی گستاخی نہیں کرسکتا۔ انشاء اللہ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

"بات گستاخی کی نہیں، تم انہیں سمجھا تو سکتے ہو!" صندل نے اپنے تئیں ایک جائز اور معقول بات کی۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ سمجھنے والی شخصیت نہیں ہیں۔ میں اپنی ممی کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ انہیں تو ڈیڈی آج تک سمجھا نہیں پائے۔ وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتیں۔" پتا نہیں، وہ کس رو میں بولتا چلا گیا۔

صندل نے کہا۔ "لیکن یہ اس مسئلے کا حل تو نہیں۔ اس طرح ہماری ٹینشن بڑھتی رہے گی۔"

"وہ تو فی الحال بڑھے گی۔" صفدر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"اگر ہم علیحدہ کہیں اپنی رہائش کا بندوبست......!"

"نہیں۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "میں کوشش کروں گا صغیر اور صدف یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ یہ سارا فتنہ انہی دونوں کا پھیلایا ہوا ہے۔ صغیر مجھ سے بہت خفا ہیں۔ ایک تو میں انہیں پسند نہیں کرتا پھر میں نے ان کی بیٹی کو بھی بڑے کھلے الفاظ میں مسترد کیا ہے۔ صغیر منتقم مزاج ہیں، کوئی بھی اوچھی حرکت کر سکتے ہیں۔ ان دونوں سے نمٹنے کے لئے مجھے بھرپور پلاننگ کرنا ہوگی اور اس کے لئے ہمارا اس بنگلے میں رہنا ضروری ہے۔ مجھے خدشہ ہے، اگر میں یہاں نہ رہا تو یہ لوگ بنگلے پر قبضہ بھی کر سکتے ہیں۔" وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "ڈیڈی نے کبھی اپنے سالے صغیر شاہ کو پسند نہیں کیا تھا۔ جب تک وہ ہوش حواس میں تھے، صغیر شاہ کو دم مارنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اب جب کہ وہ ایک لاتعلق سے انسان ہو گئے ہیں تو ماموں فرم میں جنرل منیجر بھی ہو گئے اور بنگلے میں بھی ان کی آمد و شد شروع ہوگئی ہے۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" صندل نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "انکل صمد اتنے بھی مجبور اور بے بس نہیں ہیں جتنا وہ خود کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ ہر وقت کیوں خود کو نشے میں ڈبوئے رکھتے ہیں۔ وہ چاہیں تو بنگلے اور بزنس میں اپنے اختیارات استعمال کر سکتے ہیں۔"

صفدر نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی پر ہمیشہ ممی نے حکمرانی کی ہے۔ وہ ہیں ہی ایسی۔ شروع سے اب تک گھر میں انہی کا حکم چلتا آیا ہے۔ پھر ڈیڈی نے پتا نہیں کس نازک موقع پر اپنا سارا بزنس ممی کے نام کر دیا۔ اب وہی مالک و مختار ہیں۔ اسی لئے دفتری معاملات میں وہ زیادہ دخل نہیں دیتے۔"

اس انکشاف نے صندل کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اس نے پوچھا۔ "صفدر! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اپنی ممی کی فرم میں ایک ملازم کی حیثیت سے کام کرتے ہو؟"

"خیر، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ڈیڈی نے میرے تحفظات کا بھی بہت خیال رکھا ہے۔ بہرحال، ممی کے اختیار کو نظر انداز یا چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔"

"اس کا مطلب ہے، مجھے ہی اپنی برداشت کے دامن کو وسیع و عریض کرنا ہوگا۔" صندل نے

خودکلامی کے انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھے ایک کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے صفدر!''

صفدر بیگ نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

صندل نے بساط بھر صبر سے کام لیا مگر ساس بہو میں کھٹ پٹ شروع ہو چکی تھی۔ پھر صدف اور صغیر بھی صاعقہ کو ''کمک'' مہیا کر رہے تھے جب کہ صندل تن تنہا اس مقابلے پر ڈٹی ہوئی تھی۔ وہ جس شخص سے مدد کی طلب گار ہو سکتی تھی اس نے صندل کے سامنے نصیحتوں کا ماؤنٹ ایوریسٹ کھڑا کر رکھا تھا۔ ان حالات میں میاں بیوی کے درمیان تلخیاں جنم لینے لگیں جو رفتہ رفتہ چھوٹی موٹی جھڑپ کی صورت بھی اختیار کرنے لگیں۔ وقوعہ کے روز بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور میاں بیوی کے بیچ بحث اس قدر بڑھ گئی کہ صندل غصے میں اپنے میکے روانہ ہو گئی۔ ازاں بعد پولیس نے اسے محمود آباد سے اپنے شوہر کے الزام میں گرفتار کر لیا۔

یہ تھے وہ حالات جو صندل کی زبانی مجھے معلوم ہوئے۔ میں نے چند باتیں دانستہ یہاں بیان نہیں کیں۔ آپ اسے مصلحت کا تقاضا سمجھ لیں۔ مذکورہ باتیں میں بعد میں عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کے سامنے لاؤں گا۔

✿✿✿

پولیس نے ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد چالان پیش کر دیا۔

اس موقع پر میں نے اپنی موکل کی ضمانت کروانے کی بھرپور کوشش کی مگر مجھے اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت بڑی مشکل سے ہوتی ہے، خاص طور پر جب استغاثہ کے پاس قتل کا کوئی عینی شاہد بھی موجود ہو۔ صندل کے کیس میں کچھ اسی قسم کی صورت حال تھی۔

جج نے باقاعدہ سماعت کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

آگے بڑھنے سے قبل میں چند ضروری باتوں کا ذکر کروں گا۔ سب سے پہلے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتول صفدر بیگ کی موت صبح نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کا سبب دل میں گھسنے والی وہ گولی تھی جو اعشاریہ تین دو کیلی بر کے ریوالور سے چلائی گئی تھی۔ مقتول کے جسم میں سے دو گولیاں برآمد ہوئی تھیں۔ دوسری گولی صفدر کے پیٹ میں لگی تھی۔ تاہم جان لیوا وہی گولی ثابت ہوئی جس نے دل کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ایکسپرٹ نے واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ دل میں گولی لگنے کے بعد دس پندرہ منٹ میں مقتول کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اسے نزع کی تکلیف سے زیادہ عرصہ نہیں گزرنا پڑا تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور میری موکل یعنی اس مقدمے کی ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے کل آٹھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی لیکن میں یہاں پر صرف انہی کا

تذکرہ کروں گا جو میری نظر میں اہم ہوں گے۔

سب سے پہلے جج کی اجازت لے کر اس مقدمے کا تفتیشی افسر کٹہرے میں آیا اور استغاثہ کے حق میں اور اپنی کارکردگی کو ثابت کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ استغاثہ کی وضاحت ختم ہوئی تو میں جرح کے لئے گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔ تفتیشی افسر بے داغ اور کلف دار وردی میں بہت اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا سر تا پا جائزہ لیا اور زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''آئی۔ او صاحب! کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟''

''صلاح الدین!'' اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''صلاح الدین صاحب! اگر میں آپ کو تفتیشی افسر کی بجائے آپ کے اصل نام سے پکاروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''قطعی نہیں!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ مجھے صلاح الدین یا آئی۔ او یا تفتیشی افسر یا اے ایس آئی جو دل چاہے، کہہ کر پکار سکتے ہیں۔''

وہ رینک کے اعتبار سے اے ایس آئی تھا۔ میں نے باقاعدہ سوالات کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ''آئی۔ او صاحب! آپ کو اس واردات کی اطلاع کتنے بجے دی گئی تھی؟''

''تھانے میں رکھے روزنامچے کے مطابق یہ اطلاع صبح نو بج کر پچاس منٹ پر دی گئی تھی۔''

اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اطلاع کس نے دی اور کس ذریعے سے؟''

''یہ اطلاع فون پر دی گئی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور اطلاع دینے والے شخص کا نام تھا صغیر شاہ جو مقتول کا سگا ماموں ہے اور ان کی فرم کا جنرل منیجر بھی۔''

''کریکٹ!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا۔ ''آپ کتنے بجے جائے واردات پر پہنچے تھے؟''

''ساڑھے دس بجے۔''

''ایکسیلنٹ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اس سلسلے میں آپ نے کافی ایفی شینسی دکھائی ہے ورنہ پولیس والے ہڈ حرامی کے لئے بہت مشہور ہیں۔''

''آبجیکشن یور آنرز!'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''فاضل وکیل محکمہ پولیس کے لئے قابل اعتراض الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں تنبیہہ کی جائے۔''

جج نے وکیل سرکار کے اعتراض کو درست مانتے ہوئے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنے بیان میں سے الفاظ ''ہڈ حرام'' کو خارج کر دوں۔

میں نے جج کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ کو ''ست اور غیر ذمے دار'' سے

بدلتے ہوئے انکوائری افسر سے دوبارہ وہی سوال پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''تمام پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے، ہم اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور اس سلسلے میں کوتاہی سے حتیٰ الامکان بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو مقتول کی کیا پوزیشن تھی؟''

''جائے واردات کا تفصیلی نقشہ چالان کے ساتھ موجود ہے جس میں خاص طور پر مقتول اور آلۂ قتل کا ذکر کیا گیا ہے۔'' وکیل استغاثہ اچانک بول اٹھا۔ ''لگتا ہے، آپ نے کیس فائل کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا!''

اس نے ایک طرح سے مجھ پر چوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے تفتیشی افسر سے پوچھا۔ ''میں دراصل یہ پوچھنا چاہتا ہوں، جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو قاتل کی گولیوں کا نشانہ بننے والا اصفدر بیگ زندہ تھا یا اس کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں؟''

''اس کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں۔'' اس نے بتایا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی جب کہ ہم ساڑھے دس بجے وہاں پہنچے تھے۔''

''آلۂ قتل آپ کو جائے واردات پر ہی پڑا مل گیا تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ مقتول کو جس آتشیں ہتھیار سے قتل کیا گیا وہ ایک ریوالور ہے اور اس کا کیلی بر اعشاریہ تین دو ہے؟''

''ہاں، یہ سچ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''آلۂ قتل حاصل کرنے کے بعد آپ نے اس کا سرسری جائزہ لیا تھا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''ریوالور کے کتنے چیمبرز خالی ہو چکے تھے؟''

''تین گولیاں اس وقت چیمبرز میں موجود تھیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کا یہی مطلب ہے، باقی تین چیمبرز خالی ہو چکے تھے۔''

''آپ نے جائے وقوعہ کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد رپورٹ تیار کی ہوگی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ مقتول کے جسم سے صرف دو گولیاں برآمد ہوئی ہیں۔ ایک دل کے اندر سے اور دوسری پیٹ میں سے۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ ''تیسری گولی کے بارے میں آپ کا کیا

خیال ہے؟ اس کا کہیں سراغ نہیں ملا؟''

''میں اس سلسلے میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں؟'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''ممکن ہے، ریوالور میں سے ایک گولی پہلے کبھی چلا لی گئی ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے، اس میں سرے سے پانچ گولیاں ہی بھری گئی ہوں۔ ایسا کرنے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے!''

''کوئی پابندی نہیں ہے۔'' میں نے اسی کے الفاظ سرسری انداز میں دہرائے اور اگلا سوال کیا۔ ''آپ نے آلۂ قتل پر سے فنگر پرنٹس تو ضرور اٹھائے ہوں گے۔''

''اٹھانے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ریوالور کو بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے کسی کپڑے وغیرہ میں پکڑ کر استعمال کیا گیا تھا اس لئے واضح فنگر پرنٹس نہیں بن سکے۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے، قاتل نے دستانوں کا استعمال کیا ہو!''

''ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' اس نے تائید کی۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے میری موکل کو کتنے بجے گرفتار کیا تھا؟''

''لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے۔''

''آپ کو کیسے علم ہوا کہ میری موکل نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہوگا؟''

اس نے بتایا۔ ''جس شخص نے تھانے فون کر کے اس واردات کی اطلاع دی تھی اسی نے ہمیں بتایا کہ صندل نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔ محمود آباد کا پتا ہمیں مقتول کی ماں صاعقہ بیگم نے دیا تھا۔ اس واردات کے بعد ملزم جائے وقوعہ سے فرار ہو گئی تھی اور صاعقہ بیگم کو پورا یقین تھا کہ وہ سیدھی اپنے میکے پہنچی ہوگی...... اور ایسا ہی ہوا بھی۔ ہم نے ملزم صندل کو اس کے والدین کے گھر واقع محمود آباد سے گرفتار کر لیا۔''

''جب آپ ملزم کے میکے پہنچے تو وہ کیا کر رہی تھی؟''

''اپنی والدہ صابرہ کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔''

''گھر میں اس وقت اور کون کون موجود تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ان دونوں کے سوا گھر میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔''

صدیق کی زبانی مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ صندل کی گرفتاری کے وقت وہ اپنے دفتر میں تھا اور اس کی بیوی صابرہ نے فون کر کے اسے واقعے کی اطلاع دی تھی۔ صندل کا چھوٹا بھائی یقیناً اس وقت اسکول گیا ہوگا۔

میں نے تفتیشی افسر سے سوال کیا۔ ''ملزم کو گرفتار کرنے کے بعد آپ نے اس کے فنگر پرنٹس لئے تھے؟''

"ظاہر ہے، یہ تو کارروائی کا ایک حصہ ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"حالانکہ آلہ قتل پر کسی قسم کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔" میں نے عام سے انداز میں کہا۔

"اس لئے لگتا ہے، آپ خاصے ہوشیار اور فرض شناس اے ایس آئی ہیں۔"

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا پھر سادگی سے بولا۔ "آپ اگر ایسا سمجھتے ہیں تو پھر یہی ہو گا۔"

میں نے جرح کے سلسلے کو اختتامی مرحلے کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے گرفتاری کے بعد ملزم کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ کیا تھا؟"

یہ ایک مخصوص قسم کا کیمیکل ٹیسٹ ہوتا ہے جس سے فائرنگ کرنے والے شخص کے ہاتھوں پر موجود بارودی ذرات کا پتا چلایا جاتا ہے۔ عام طور سے یہ ذرات دکھائی نہیں دیتے۔ تفتیشی افسر اے ایس آئی صلاح الدین نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"ہم نے اس ٹیسٹ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ ملزم صندل میکے پہنچنے کے بعد اپنا منہ ہاتھ اچھی طرح دھو چکی تھی۔ اس لئے ہم نے اس کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ نہیں کروایا۔"

میں نے کہا۔ "تو آپ کے خیال میں ہاتھ دھونے سے وہاں موجود تمام بارودی ذرات رخصت ہو جاتے ہیں؟"

اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ "تو ایسا نہیں ہوتا؟"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ بہر حال، آپ کو یہ ٹیسٹ ضرور کروانا چاہئے تھا۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں اس کیس میں ایک عینی شاہد مل گیا تھا۔ اس لئے بھی ہمیں یقین تھا کہ قتل ملزم صندل ہی نے کیا ہے۔"

"آپ اشارہ استغاثہ کے ایک معزز گواہ صغیر شاہ کی طرف ہے نا؟"

اس نے اثبات میں گردن کو حرکت دی۔ میں نے پوچھا۔

"گرفتاری کے وقت میری موکل نے کس قسم اور رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "ملزم صندل نے اس وقت فیروزی رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ شلوار سادہ تھی جب کہ قمیص پھول دار۔"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد جج کی اجازت پا کر وکیل استغاثہ نے اپنا پہلا گواہ پیش کیا۔ صادق علی نامی یہ شخص صاعقہ بیگم کا ایک گھریلو ملازم تھا جو مختلف قسم کے کام سرانجام دیتا تھا۔ صادق علی کی عمر لگ

بھگ پینتیس سال رہی ہو گی۔

اس نے گواہوں کے کٹہرے میں آ کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور پھر اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ یہ بیان اس بیان سے بڑی حد تک ملتا جلتا تھا جو اس نے وقوعہ کے روز پولیس کو دیا تھا۔

ایک بات واضح کر دوں کہ عدالت میں گواہوں کو باری باری بلایا جاتا ہے۔ ایک وقت میں صرف ایک گواہ ہی کٹہرے میں موجود ہوتا ہے۔ یہ احتیاط اس لئے ملحوظ رکھی جاتی ہے تا کہ ایک شخص کی گواہی سے دوسرے کا بیان متاثر نہ ہو۔ ویسے یہ کوئی ہارڈ اینڈ فاسٹ رول بھی نہیں۔ جج کے حکم پر بعض پیچیدہ کیسز کے اندر بیک وقت دو دو گواہوں کو ایک ساتھ کمرے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب جج کسی معاملے میں براہ راست تصدیق یا تردید چاہ رہا ہو۔ دونوں گواہ باری باری کٹہرے میں آ کر جج کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔

استغاثہ کے گواہ صادق علی کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے اس سے چند سرسری نوعیت کے سوال پوچھنے کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔ پھر میں کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

"صادق علی!" میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں صاعقہ بیگم کے پاس کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"لگ بھگ پانچ سال۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہاری ملازمت کی نوعیت کیا ہے؟"

"میں ہر قسم کے اوپری کام کرتا ہوں۔"

"کیا تمہاری رہائش بھی صاعقہ بیگم کے بنگلے ہی میں ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے بتایا۔ "اکیلی جان ہوں اس لئے ادھر ہی سرونٹ کوارٹر میں پڑا رہتا ہوں۔"

"اکیلی جان کیوں ہو بھائی؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ "کیا تم نے ابھی شادی نہیں کی یا تمہاری فیملی کسی دوسرے شہر میں رہتی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں ابھی تک کنوارا ہوں۔"

"صادق علی! تم گزشتہ پانچ سال سے صاعقہ بیگم کے بنگلے پر ملازم ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چھوٹے بیگ صاحب کی شادی تمہاری نظر کے سامنے ہوئی تھی؟"

"جی ہاں، یہ زیادہ پرانی بات نہیں۔"

"ملزم صندل تمہیں کیسی لگتی تھیں؟"

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے، میری موکل کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟"

"ٹھیک ٹھاک ہی تھا جناب۔"

”اس دوران میں کبھی تمہاری اس سے لڑائی تو نہیں ہوئی؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!“ وہ جلدی سے بولا۔”صندل صاحبہ کی حیثیت میری مالکن ایسی تھی۔ ایک نوکر اپنی مالکن سے کیوں کر لڑائی جھگڑا کر سکتا ہے۔ وہ تو میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔“

میں نے کہا۔”کیا یہ سچ ہے کہ صاعقہ بیگم سے اس کی اکثر لڑائی فساد ہوتا رہتا تھا؟“

وہ گول مول جواب دیتے ہوئے بولا۔”جناب! آپ تو سیانے آدمی ہیں۔ ساس بہو کا تو رشتہ ہی ایسا ہے کہ نوک جھوک لازمی ہے۔“

”میں نے سنا ہے صاعقہ بیگم غصے کی خاصی تیز ہیں۔“ میں نے کہا۔”کیا ملزم صندل بھی اسی طبیعت کی مالک تھیں کیونکہ جب دونوں طرف برابر کا مقابلہ ہو تو پھر جنگ ضرور ہوتی ہے۔“

اس نے جواب دیا۔”ملزم صندل صلح پسند اور خوش اخلاق تھیں۔“

”مجھے پتا چلا ہے، صاعقہ بیگم اپنی بہو کو پسند نہیں کرتی تھیں؟“

”میں نے کبھی اس حد تک جاننے کی کوشش نہیں کی۔“ وہ محتاط انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔”وقوعہ کے روز تم بنگلے پر موجود تھے؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔”اس روز کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

استغاثہ کے گواہ صادق علی نے جواب دیا۔”میں اس وقت کچن میں مصروف تھا کہ اچانک فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ میں کام چھوڑ کر آواز کی سمت لپکا پھر مجھے معلوم ہوا کہ صندل چھوٹے بیگ صاحب کو قتل کر کے فرار ہو گئی ہے۔“

”تم نے کتنے بجے فائرنگ کی آواز سنی تھی؟“

”اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔“

”کیا یہ تمہارا اندازہ ہے یا تم نے باقاعدہ گھڑی میں وقت دیکھا تھا؟“

اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔”جب فائرنگ کی صدائیں میرے کانوں تک پہنچیں تو اس وقت میں اتفاق سے دیوار گیر کلاک کو دیکھ رہا تھا اس لئے مجھے یہ وقت یاد رہ گیا۔“

”تم نے لفظ صدائیں استعمال کیا ہے! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہاں ایک سے زائد گولیاں چلی تھیں؟“

”جی ہاں، وہ دو یا تین گولیوں کی آوازیں تھیں۔“

”دو یا تین؟“ میں نے کڑے انداز میں دریافت کیا۔

”میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ بے بسی سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ اسے جتنا سبق یاد کرایا گیا تھا وہ اس سے آگے ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے سلسلۂ سوالات کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔

”جب تم فائرنگ کے مقام پر پہنچے تو تم نے وہاں کیا دیکھا؟“

”میں نے چھوٹے بیگ صاحب کو خون میں لت پت پایا۔“ اس نے جواب دیا۔”ان کا لباس سینے اور پیٹ کے مقام سے خون آلود ہو رہا تھا۔“

”کیا مقتول اس وقت تک زندہ تھا؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔“ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔”میں صفدر صاحب کی حالت دیکھ کر بے انتہا خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس لئے میں اس بات پر دھیان نہیں دے سکا کہ وہ اس وقت زندہ تھے یا جان ہار چکے تھے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔“

”تم نے تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ جب تم جائے وقوعہ پر پہنچے تو تمہیں پتا چلا، میری موکل اپنے شوہر کو قتل کر کے بنگلے سے فرار ہو گئی ہے۔“ میں نے گواہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔”کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اسے فرار ہوتے دیکھا تھا؟“

اس نے الجھن زدہ چہرے کے ساتھ نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے زور دے کر پوچھا۔”جب کہ تم فائرنگ کی آواز سنتے ہی جائے وقوعہ کی طرف دوڑ پڑے تھے؟“

وہ بولا۔”میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ جا چکی تھی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا، ملزم صندل کے فرار کے بارے میں تمہیں کسی اور نے بتایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، مجھے یہ بات صغیر صاحب نے بتائی تھی۔“

”کیا صغیر شاہ موقع پر موجود تھا؟“

”جی، موجود تھا۔“

”اس کے علاوہ جائے وقوعہ پر اور کون تھا؟“

”صرف بیگم صاحبہ!“

”تمہارا مطلب ہے، صاعقہ بیگم؟“

”جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”صفدر بیگ کا قتل کس جگہ ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔”ان کے بیڈروم میں۔“

”کیا تم سیدھے مقتول کے بیڈروم میں جا گھسے تھے؟“

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں جواب دیتے ہوئے بولا۔”اندر تو میں دس منٹ بعد گیا تھا لیکن بیڈروم سے باہر ہی صغیر صاحب نے مجھے اس واقعے کے بارے میں بتا دیا تھا۔“

میں نے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔”صادق علی! کیا اس موقع پر ملزم کو فرار سے روکنے یا اس

کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی؟"

"جناب! فائرنگ کے بعد تو بنگلے میں ایک افراتفری مچ گئی تھی۔" اس نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ملزم کے تعاقب پر کون دھیان دیتا؟"

میں نے پوچھا۔ "جب تم جائے وقوعہ پر پہنچے تو بیڈروم کا دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا؟"

"دروازہ بند تھا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اور صغیر شاہ اس بند دروازے کے باہر کھڑا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"کیا صاعقہ بیگم بھی صغیر شاہ کے پاس موجود تھی یا وہ بیڈروم کے اندر تھی؟" میں نے استفسار کیا۔ "تھوڑی دیر پہلے تم معزز عدالت کے روبہ رو یہ بیان کر چکے ہو کہ جائے وقوعہ پر صغیر شاہ کے علاوہ بیگم صاحبہ بھی موجود تھی!"

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "وہ دونوں بند دروازے کے باہر کھڑے تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "کچن سے جائے واردات کا فاصلہ کتنا ہوگا؟"

"فاصلہ!" اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔ "اس طرح میں کیا بتا سکتا ہوں جناب۔"

"تم اس طرح نہیں بتا سکتے تو اُس طرح بتا دو۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔

وہ الجھ کر بولا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا جناب!"

میں نے سوال کیا۔ "صادق علی! تمہیں کچن سے جائے وقوعہ پر پہنچنے میں کتنا وقت لگا ہوگا؟"

"بمشکل پندرہ سیکنڈ۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔

"اور اگر اسی رفتار سے تمہیں جائے وقوعہ سے بنگلے کے مین گیٹ تک جانا پڑے تو کتنا وقت درکار ہوگا؟"

"تیس سیکنڈ رکھ لیں۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "کیوں کہ بنگلے کا گیٹ بیڈروم سے خاصے فاصلے پر ہے اور راستہ بھی گھماؤ پھراؤ والا ہے۔"

میں نے گواہ پر جرح ختم کر دی۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ اس قلیل مدت میں کسی مزید گواہ کو ٹرائی نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا جج نے تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان فرما دیا۔

✿✿✿

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں صاعقہ بیگم کا چوکیدار صبور خان کھڑا تھا۔ صبور کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروا چکا تو وکیل استغاثہ نے چند سرسری سوالات کے بعد اسے میرے حوالے کر دیا۔

میں نے چوکیدار صبور خان پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ڈیوٹی کب سے کب تک ہوتی ہے؟"

"میں دن رات ادھر بنگلے پر ہی رہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "اپنا ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم صاعقہ بیگم کے مستقل ملازم ہو؟"

"بالکل پکا پکا۔" وہ اثبات میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

"صبور خان! وقوعہ کے وقت تم بنگلے کے کس حصے میں تھے؟"

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "ام ادھر گیٹ پر موجود تھا۔"

"کیا تم چوبیس گھنٹے گیٹ پر موجود رہتے ہو؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔ "گیٹ کے پاس جو چھوٹا سا کیبن بنا ہوا ہے نا، ادھر آرام فرماتا ہے اور گیٹ پر ڈیوٹی دیتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا، جب بنگلے کے ایک بیڈروم میں فائرنگ ہوئی تو تم اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے یعنی گیٹ پر موجود تھے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ام اس وقت اپنے کیبن میں چپل تبدیل کر رہا تھا۔"

"کیا تم نے کیبن میں فائرنگ کی آواز سنی تھی؟"

"ہاں، ام نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔"

"کتنی گولیاں چلی تھیں؟"

"صرف دو۔"

"دو یا تین؟"

"دو۔"

"تمہارے دوٹوک لہجے سے ظاہر ہوتا ہے، تم نے فائرنگ کی آواز بہت واضح سنی تھی۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسی لئے تمہیں فائر کی تعداد اچھی طرح یاد ہے۔"

"ام ہر کام بہت توجہ سے کرتا ہے۔" وہ سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ "فائرنگ کی آواز سنتے ہی تم نے سب سے پہلے کیا کیا تھا؟"

"ام بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب دوڑا تھا۔"

"پھر تم نے کیا دیکھا اندرونی حصے میں؟"

"ام نے اندرونی حصے میں بھی بہت کچھ دیکھا اور بیرونی حصے میں بھی۔" وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا۔

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے سنجیدگی سے اسے گھورا۔

وہ بولا۔

"وکیل صاحب! امارا مطلب یہ ہے کہ بنگلے کے اندر، بیڈروم میں ام نے صدر رصیب کی لاش دیکھا تھا لیکن اندر پہنچنے سے پہلے ام نے صندل بی بی کو بنگلے کے برونی حصے میں دیکھا تھا۔"

"اچھا!" میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا جیسے صبور خان نے کوئی حیرت ناک بات کی ہو۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "جب تم نے صندل بی بی کو بنگلے کے بیرونی حصے میں دیکھا تو وہ کیا کر رہی تھی؟"

"وہ بہت پریشانی اور جلدی میں بنگلے کے گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔"

"تم نے اس کی پریشانی کا سبب معلوم نہیں کیا؟"

"میں نے اس سے پوچھا، اندر کیا ہوا بی بی صیب۔ یہ فائرنگ کی آواز کیسا تھا۔" صبور خان نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"پھر ملزم نے تمہیں کیا جواب دیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ وہ خاموشی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔"

"اور تم؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"ام بنگلے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے استفسار کیا۔ "تم نے اندر جا کر کیا دیکھا؟"

"صدر رصیب کی لاش۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

"کیا تم سیدھے مقتول کے بیڈروم میں جا گھسے تھے؟"

اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ "بیڈروم کے اندر اور کون کون موجود تھا؟"

"صغیر صیب، میڈم صاعقہ اور صادق علی۔" صبور خان نے جواب دیا۔

میں نے فاتحانہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ میں دوبارہ کٹہرے میں کھڑے ہوئے استغاثہ کے گواہ صبور خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"صبور خان! تم کتنے وقت کی نماز پڑھتے ہو؟"

"پورے پانچ وقت کی۔" اس نے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ "اور اکثر تہجد بھی پڑھ لیتا ہوں۔"

میں نے کاٹ دار آواز میں پوچھا۔ "اور جھوٹ کتنے وقت بولتے ہو؟"

گواہ کے جواب دینے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ چلا اٹھا۔ "آبجیکشن یور آنر!"

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل سرکار کو دیکھا۔

وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ "فاضل وکیل استغاثہ کے معزز اور پرہیزگار گواہ کی بے عزتی کر

رہے ہیں بلکہ اس شریف انسان پر جھوٹ بولنے کا الزام لگا رہے ہیں۔"

"میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔" میں بے پروائی سے بولا۔ "میں نے تو گواہ سے صرف ایک سادہ سا سوال پوچھا ہے۔"

"آپ نے گواہ کی نیت پر شک کیا ہے۔ اسے دروغ گو کہا ہے۔" وکیل استغاثہ خاصے جوش میں تھا۔ "آپ نے اس کی عمر کا بھی خیال نہیں کیا۔"

وکیل سرکار کو جواب دینا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے نہایت متحمل انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے فاضل دوست! پہلی بات تو یہ کہ جھوٹ بولنے کا تعلق عمر کے کسی خاص حصے سے نہیں ہوتا۔ انسان جب چاہے، عمر کے جس حصے میں چاہے، بڑی فراخ دلی سے دروغ گوئی کر سکتا ہے۔" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک استغاثہ کے گواہ صبور خان پر دروغ گوئی کا الزام لگانے کا معاملہ ہے تو میں نے سرے سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے تو صرف اس بندۂ خدا سے اتنا پوچھا تھا، وہ دن میں کتنی مرتبہ جھوٹ بولتا ہے؟ اگر وہ جھوٹا نہیں، دروغ گوئی نہیں کرتا تو نہایت ہی سادہ الفاظ میں جواب دے سکتا ہے۔ اس میں ایسی مشکل کیا ہو گی؟"

وکیل استغاثہ اس مدلل تقریر سے کچا ہو گیا اور خجالت آمیز نظر سے جج کو دیکھنے لگا۔ جج نے مجھ سے دریافت کیا۔

"بیگ صاحب! کیا آپ نے گواہ سے یہ سوال کسی خاص مقصد کے تحت کیا تھا؟"

"انتہائی خاص مقصد کے تحت جناب عالیٰ!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس سلسلے میں سردست کوئی وضاحت نہیں کروں گا۔ اپنے اس مقصد کو میں بعد میں کھول کر بیان کروں گا۔ فی الحال یہ ذکر مناسب نہ ہو گا۔"

جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

میں نے کٹہرے میں موجود صبور خان سے پوچھا۔ "تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "وکیل صیب! ام جھوٹ اور جھوٹے سے بہت نفرت کرتا ہے۔ ایسا لوگ ام کو پسند نہیں۔ ام خود بھی جھوٹ بولنے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش فرماتا رہتا ہے۔"

"جزاک اللہ!" میں نے کراری آواز میں کہا۔

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں نے "جزاک اللہ" کے الفاظ ادا کر کے اس کی تعریف کی تھی یا پھر اس پر طنزاً اچھالا تھا۔

میں نے اسے مخمصے میں دیکھ کر سوال کیا۔ "صبور خان! جب تم فائرنگ کی آواز سن کر بنگلے کی اندرونی جانب دوڑے تو تمہیں ملزم صندل دکھائی دی تھی جو بنگلے کے اندرونی حصے سے نکل کر بڑی

تیزی سے باہر کی جانب جا رہی تھی۔ تم نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل ٹھیک بول رہے ہو وکیل صیب!'' وہ تصدیق کرنے والے انداز میں بولا۔ ''یہ ساری باتیں ام نے ہی آپ کو بتائی ہیں۔''

''جہاں اتنی باتیں بتائی ہیں، وہیں ایک اور بات بھی بتا دو۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''بنگلے سے نکلتے وقت ملزم صندل نے کون سا لباس پہنا ہوا تھا؟''

''امارے خیال میں صندل بی بی نے گلابی رنگ کا شلوار قمیص پہنا ہوا تھا۔''

''خیال میں یا یقیناً؟'' میں نے اسے گڑبڑانے کے لئے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''یقیناً وکیل صیب!''

''مجھے گواہ سے مزید کچھ نہیں پوچھنا یور آنر!'' میں نے جج کی طرف روئے سخن پھیرتے ہوئے کہا اور جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد استغاثہ کا اگلا گواہ صدام حسین کٹہرے میں آیا۔ صدام حسین سامنے والے بنگلے میں رہتا تھا۔ ایک طرح سے وہ صاعقہ بیگم کا پڑوسی ہی تھا۔ صدام کی عمر پینتالیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ ایک معروف گارمنٹس فیکٹری کا مالک تھا۔ وقوعہ کے روز اس نے ملزم صندل کو اپنے بنگلے یعنی صاعقہ کے بنگلے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اس لئے پولیس نے اسے گواہوں میں شامل کر لیا تھا۔ صدام حسین اس وقت ایک نفیس سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔

اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا مختصر بیان ریکارڈ کروا دیا۔ یہی بیان وہ پہلے پولیس کو بھی دے چکا تھا۔ وکیل استغاثہ نے اپنی باری نمٹاتے ہوئے اس سے مختلف سوالات کئے۔ ان سوالات کا مقصد صرف اتنا سا تھا کہ وقوعہ کے روز ملزم اپنے گھر سے بہت پریشانی کی حالت میں نکلی تھی۔ وکیل سرکار عدالت کو باور کرانا چاہتا تھا کہ ملزم صندل کی گھبراہٹ کے پیچھے اس کے فعل کا ہاتھ تھا...... وہ قتل ایسا سنگین جرم کر کے وہاں سے فرار ہوئی تھی۔

وکیل استغاثہ نے جیسے ہی گواہ کو فارغ کیا، میں جج سے اجازت لے کر کٹہرے کے قریب پہنچ گیا اور وہاں موجود صدام حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا نام بہت گریس فل ہے۔''

وہ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ''تھینک یو۔ آپ کی تعریف میں کوئی مبالغہ نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کب سے صاعقہ بیگم یعنی مقتول کے پڑوسی ہیں؟''

''کم و بیش دس سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر تو آپ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہوں گے؟''

''میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ کا ان سے زیادہ ربط ضبط نہیں تھا؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''اصل میں صمد بیگ صاحب ذرا مختلف ٹائپ کے انسان ہیں۔ میں دوسری لائن کا ہوں اس لئے بھی ان سے تعلقات وسیع نہ ہو سکے اور جہاں تک صفدر بیگ کا تعلق ہے تو ان سے بس سلام دعا تھی۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ اس کیس میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے شامل ہیں۔ کیا یہ شمولیت آپ کی اپنی مرضی سے ہے یا پھر کسی دباؤ کا نتیجہ ہے؟''

''دونوں ہی باتیں نہیں ہیں۔'' وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ''میں از خود گواہی دینے کے شوق میں عدالت تک نہیں پہنچا اور نہ ہی اس کام کے لئے مجھ پر دباؤ ڈالا گیا ہے۔ بس پولیس نے مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے اسے بیان دے دیا...... اور عدالت میں بھی حاضر ہو گیا ہوں۔'' وہ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد بولا۔ ''ایکچوئیلی، وقوعہ کے روز میں نے ملزم صندل کو اس کے بنگلے سے نکل کر گھبراہٹ کے عالم میں ایک طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس بات کی گواہی دینے میں، میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔''

''یو آر رائٹ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''صدام صاحب! جب آپ نے ملزم کو اس کے بنگلے سے گھبراہٹ کے عالم میں نکلتے دیکھا اس وقت آپ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''وکیل صاحب! میں اس وقت بیکری سے ناشتے کا سامان لے کر واپس آ رہا تھا اور اپنی گاڑی میں تھا۔ ابھی میں اپنے بنگلے سے چند گز دور ہی تھا کہ میں نے صمد بیگ کے بنگلے کا گیٹ کھلتے دیکھا، پھر وہاں سے ملزم صندل برآمد ہوئی اور گھبراہٹ کے عالم میں ایک طرف چل دی۔ اسی وقت سامنے سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی۔ میں نے دیکھا، ملزم نے اس ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی رکی تو وہ اس میں بیٹھ گئی۔''

''پھر اس کے بعد کیا ہوا؟'' وہ خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں معمول کے مطابق اپنے گھر آ گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے شوہر کو قتل کر کے فرار ہوئی تھی۔''

''آپ تک یہ اطلاع کس نے پہنچائی تھی؟''

''میری بیوی نے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس وقت میں اپنی فیکٹری میں تھا۔ مجھے فیکٹری پہنچے ابھی آدھا گھنٹا ہی ہوا تھا کہ میری وائف کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ سامنے والے بنگلے میں پولیس آئی ہوئی ہے۔ میں نے سوال کیا، کیوں آئی ہے وہاں پولیس؟ اس نے بتایا کہ صاعقہ بیگم کی بہو نے اپنے میاں کو قتل کر دیا ہے۔''

"جب آپ کی بیوی نے فون پر اس واقعے کی اطلاع دی، کیا وقت ہوگا؟"

"اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

واقعات اور استغاثہ کے مطابق پولیس ٹھیک ساڑھے دس بجے جائے واردات پر پہنچی تھی۔ اس کا مطلب تھا، پولیس کی وہاں آمد کے بعد ہی یہ خبر بنگلے سے باہر نکلی تھی۔

"صدام حسین صاحب!" میں نے استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جس وقت آپ نے گھبرائے ہوئے انداز میں ملزم کو بنگلے سے نکلتے دیکھا، اس لمحے کیا بجا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے وہ نو بجے کے اریب قریب کا وقت تھا۔"

"نو سے کچھ کم یا زیادہ؟"

"یقیناً کم۔"

"آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہیں؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیا آپ نے اس وقت گھڑی پر نگاہ ڈالی تھی؟"

میری موکل کے مطابق وہ پونے نو بجے بنگلے سے نکلی تھی۔ باہر نکلتے ہی اسے فوراً ٹیکسی مل گئی تھی اس لئے وہ بہ آسانی پندرہ بیس منٹ میں محمود آباد اپنے میکے پہنچ گئی تھی۔ کٹہرے میں کھڑے گواہ نے میرے استفسار کا جواب یوں دیا۔

"جناب! میرے اس وثوق کی ایک ٹھوس وجہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے، میں نے ملزم صندل کو دیکھنے کے فوراً بعد ہی اپنی رسٹ واچ میں وقت نہیں دیکھا تھا لیکن جب میں ناشتا لے کر اپنے بنگلے میں آ گیا اور ازاں بعد میں باتھ لینے کے لئے واش روم میں جانے لگا تو اس وقت میری نظر وال کلاک پر پڑی تھی اور وہاں نو بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے۔"

"اوکے!" میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ ٹھیک نو بجے آپ شاور لے رہے تھے۔"

"آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔"

"کیا غسل کے دوران میں آپ نے سامنے والے بنگلے میں کسی قسم کی فائرنگ کی آواز سنی تھی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں جناب! ایسی کوئی آواز میری سماعت تک نہیں پہنچی تھی۔"

اس کا جواب میرے حسب توقع تھا۔ استغاثہ کے گواہ صادق علی کے مطابق، اس نے فائرنگ کی آواز ٹھیک نو بجے سنی تھی۔ اس کی بات میں کوئی وزن نہیں تھا، اس حوالے سے کہ وہ فائرنگ میری موکل نے کی تھی۔ ملزم صندل پونے نو بجے بنگلے سے باہر آ چکی تھی۔ بہرحال، ٹھیک نو بجے سامنے والے بنگلے کے بیڈروم میں چلنے والی دو گولیوں کی آواز گواہ صدام حسین کی سماعت تک نہیں

پہنچ سکی تھی اور اس صورت میں وہ اپنے واش روم میں شاور بھی لے رہا تھا۔

"آپ سے آخری سوال صدام صاحب!" میں نے وٹنس باکس میں موجود گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا کیونکہ آپ کے جواب کی بہت اہمیت ہے۔"

وہ یک دم گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور گواہ سے پوچھا۔ "جب وقوعہ کے روز آپ نے، ملزم صندل کو بنگلے سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تو وہ کس قسم کا لباس پہنے ہوئے تھی؟"

"شلوار قمیص!" وہ پُراعتماد انداز میں بولا۔

"لباس کا رنگ کیا تھا؟"

"فیروزی!"

"کوئی اور تفصیل؟"

اس نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔ "قمیص پھول دار تھی جب کہ شلوار پلین۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!" جج نے عدالت کی برخاستی کا اعلان کر دیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو میری موکل کا باپ صدیق بہت خوش تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔ "بیگ صاحب! آپ بڑی ہوشیاری سے کیس کو اپنے حق میں ہموار کر رہے ہیں۔"

"صدیق صاحب! عدالت ایک اکھاڑے کی مانند ہے۔" میں نے اپنی گاڑی کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "دنیا میں جتنی بھی اقسام کے اکھاڑے ہیں وہاں جیتنے کے لئے ہوشیاری اور چالاکی بہت ضروری ہے۔ جسمانی بھی اور ذہنی بھی۔ اگر ہم اس صلاحیت کا بروقت استعمال نہیں کریں گے تو سامنے والا حریف پلک جھپکتے میں ہمیں پچھاڑ دے گا۔"

"آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔" وہ اپنے لہجے میں ممنونیت کے جذبات سمیٹتے ہوئے بولا۔ "آپ کی اب تک کی کارکردگی سے میں مطمئن ہوں۔ آپ نے دشمن کے ہتھیاروں کو اسی پر استعمال کرنے کی پالیسی اپنا رکھی ہے اور خاصے کامیاب بھی ہیں۔"

کامیابی سے متعلق اس کا اشارہ میں بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ذہین قارئین سے کچھ بعید نہیں۔ ان میں سے بعض تو مجھ سے بھی پہلے نشانے پر پہنچ چکے ہوں گے۔ میں نے صدیق کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"دشمن کے ہتھیاروں کو اسی پر آزمانے کی پالیسی بہت پرانی ہے اور اس کے نتائج بہت حوصلہ افزا ہیں۔" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ہتھیاروں کو بچا کر رکھتا ہوں اور انتہائی نازک مرحلے پر استعمال کرتا ہوں۔ زیادہ تر میں حریف کی کورٹ

میں کھیلنے کا عادی ہوں۔"

"مجھے قوی امید ہے کہ میری بیٹی بہت جلد اس کیس سے باعزت بری ہو جائے گی۔" صدیق نے میری جانب دیکھتے ہوئے بھرپور لہجے میں کہا۔

"انشاء اللہ!"

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

✿✿✿

صاعقہ پوری تیاری کے ساتھ گواہی دینے آئی تھی۔ اس کے بناؤ سنگار سے لگتا تھا جیسے وہ کسی تقریب میں شرکت کے لئے آئی ہو۔ اس کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ اس نے تیز میک اپ کر رکھا تھا۔ چیختے ہوئے نارنجی رنگ کی ساڑھی میں وہ کسی قیامت سے کم نظر نہیں آ رہی تھی۔

صاعقہ کا بیان عناد اور نفرت کا آمیزہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی بہو کے لئے دل میں جس قسم کے جذبات رکھتی تھی ان کا اس نے کھل کر اظہار کر دیا۔ اس کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے اپنے مفاد میں گواہ پر کچھ طبع آزمائی کی۔ اس کے بعد میری باری آئی۔

میں نے گواہ کو انتہائی ضروری امور تک محدود رکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔ "صاعقہ بیگم، مجھے معلوم ہوا ہے، آپ ملزم کو سخت ناپسند کرتی تھیں؟"

"آپ کو کسی نے بالکل درست معلومات فراہم کی ہیں۔" وہ ایکوزڈ باکس میں کھڑی صندل کی جانب قہر آلود نظر سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ مردود مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔"

"اس ناپسندیدگی اور تنفر کی کوئی وجہ؟"

"وجوہات تو درجن بھر ہوں گی۔" وہ بے اعتنائی سے بولی۔ "لیکن سب سے اہم سبب یہ ہے کہ اس نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا تھا۔ یہ کسی ڈائن سے کم نہیں۔"

صندل نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاعقہ کے کڑوے کسیلے جملے برداشت کرتی رہی۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں ملزم کی پوزیشن بہت نازک اور قابل رحم ہوتی ہے۔ اسے وکیل استغاثہ اور دیگر گواہوں کے ترش اور نکیلے فقرے سن کر خاموش رہنا پڑتا ہے۔ اس کی بے بسی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔

میں نے صاعقہ بیگم سے استفسار کیا۔ "میری موکل اور اس مقدمے کی ملزم صندل نے آپ کے بیٹے صفدر بیگ سے باقاعدہ شادی کی تھی۔ اسے آپ "بیٹا چھیننا" تو نہیں کہہ سکتیں۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتی؟" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ "جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی، صفدر مجھ سے بہت دور ہو گیا تھا۔ اپنی ماں کا فرماں بردار وہ لڑکا اب ماں سے شاکی اور متنفر رہنے لگا تھا۔ اس کلموہی نے میرے بیٹے کا دماغ الٹ کر رکھ دیا تھا۔ کاش، وہ میری بات مان جاتا اور اس جنم جلی سے شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دیتا تو آج نہ وہ جان سے جاتا اور نہ ہی مجھے یہ

دن دیکھنے کو ملتا۔" اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ سانس درست کرنے کے لئے وہ رکی تو عدالت میں سناٹے کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ میں نے اتنی زبان دراز عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"صفدر نادان تھا جو اس کی فریب کاری کو سمجھ نہ سکا۔ میں ایسی چالباز لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں اسی لئے میں نے اس شادی سے انکار کر دیا تھا۔ صندل جیسی غریب گھرانوں کی لڑکیاں بڑی چلتا پُرزہ قسم کی شے ہوتی ہیں۔ اپنے ناز و ادا سے امیرزادوں کو پھانستی ہیں اور انہیں اپنے حُسن کے جال میں جکڑ کر شادی پر مجبور کر دیتی ہیں۔ میرا صفدر بھی اس مکار کی مکاری کا شکار ہو گیا۔ جی چاہتا ہے، میں اس کا منہ نوچ لوں۔"

وہ خاموش ہوئی تو جج حیران نظر سے اس بولتی ہوئی مشین کو تکنے لگا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور زاویہ سوال تبدیل کر کے صاعقہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو صاعقہ کی زبان کی قینچی دوبارہ حرکت میں آ جاتی۔

"صاعقہ بیگم! ملزم لگ بھگ آٹھ ماہ آپ کے ساتھ بنگلے میں رہی۔ اس دوران میں آپ دونوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟"

"درست ہے۔" اس نے بڑی نخوت سے کہا۔ "اور ان جھڑپوں کا سبب بھی یہی تھی۔ میں تو حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ پہلے براہ راست مجھ سے منہ ماری کرتی تھی۔ ازاں بعد اس نے صفدر کو میرے خلاف بھرنا شروع کر دیا۔ اس کی سازش نے صفدر کو مجھ سے بدگمان کر دیا۔ یہ منحوس نہ صرف مجھ سے پنگا لینے کی ماہر تھی بلکہ یہ اکثر و بیشتر صفدر سے بھی لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔"

"آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز بھی صبح ہی سے میاں بیوی کے درمیان کسی مسئلے پر بحث و تکرار چل رہی تھی۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ اور آپ کا بھائی صغیر شاہ ان کا جھگڑا نمٹانے ان کے بیڈ روم میں پہنچے تھے اور انہیں کافی دیر تک سمجھاتے بھی رہے تھے مگر اس کا کچھ نتیجہ...... مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو سکا......؟"

"بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" وہ بولی۔ "میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وقوعہ پر صفدر بیگ کے قتل والا معاملہ کس طرح پیش آیا تھا؟"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ "صفدر اور صندل صبح آٹھ بجے ہی سے آپس میں جھگڑا کر رہے تھے۔ جب ان کا معاملہ کسی کنارے نہ لگا تو میں صغیر کو اپنے ساتھ لے کر ان کے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ ہم نے دونوں کو زمانے کی اونچ نیچ اور زندگی کے نشیب و فراز سمجھانے کی پوری کوشش کی لیکن ان پر ہماری نصیحت کا الٹا اثر ہوا۔ یہ بدبخت!" صاعقہ نے میری موکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کھری کھری سنانے لگی۔ اس موقع پر صفدر کا فرض بنتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کا منہ نوچ لیتا یا اس کا گلا دبا کر اسے بدزبانی سے باز رکھتا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں

کیا۔ وہ اس کے سوا کسی اور کی سنتا ہی نہیں تھا۔ صفدر کا دل و دماغ اس جادوگرنی کی مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔ صفدر نے اسے باز رکھنے کی بجائے صغیر شاہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ صغیر نے ہمیشہ اسے اپنا بیٹا سمجھا تھا لیکن صفدر کبھی واضح انداز میں اور اکثر ڈھکے چھپے طور طریقوں سے صغیر سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے اس رویے کے پیچھے بھی صندل ہی کی کوئی سازش ہو گی۔ صغیر شاہ نے میرے ایما پر اسے فرم سے نکال دیا تھا اور......"

میں نے قطع کلامی ضروری سمجھی اور کہا۔ "آپ وقوعہ کے بارے میں بتانے والی تھیں؟"

"میں اسی طرف آ رہی ہوں۔" وہ ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ "جب صفدر نے صغیر کو اور صندل کو کھری کھری سنانا شروع کی تو میں وہاں سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ میرا خیال تھا، اس طرح معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا مگر اس کے برخلاف ہوا۔ تھوڑی دیر تک تو ملزم کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں پھر اس شور میں فائرنگ کی آواز شامل ہو گئی۔ یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں خود کو سنبھالتے ہوئے باتھ روم سے باہر آئی تو ایک وحشت ناک منظر نے میرا استقبال کیا۔ صفدر اپنے ہی خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی صغیر غم و اندوہ کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ میں نے چیخ کر صغیر سے پوچھا، صفدر کو کیا ہوا ہے؟ اس نے بتایا، ملزم نے اسے قتل کر دیا اور......خود فرار ہو گئی ہے۔"

صاعقہ یہاں تک پہنچنے کے بعد خاموش ہو کر آنسو بہانے لگی۔

یہ بڑی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ جج سمیت عدالت میں موجود ہر شخص حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں اگر حقیقت حال سے واقف نہ ہوتا تو یقیناً اس کی اداکاری سے متاثر ہو جاتا۔ وہ بڑی بھرپور ایکٹنگ کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا تو میں نے سوال کیا۔ "صاعقہ بیگم! آپ کا بیان حلق سے نہیں اتر رہا۔ جب آپ باتھ روم میں گئیں تو صندل اور صفدر آپ کے بھائی صغیر شاہ سے تلخ کلامی کر رہے تھے۔ اس صورت حال میں اگر صندل کو گولی چلانا ہی تھی تو وہ صغیر شاہ پر چلاتی۔ اس نے صفدر بیگ کو کیوں موت کے گھاٹ اتار دیا؟"

صاعقہ نے تیوری چڑھا کر ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور رکھائی سے بولی۔ "یہ بات تو آپ اسی نامراد سے پوچھیں۔" پھر اس نے صندل کی جانب باقاعدہ اشارہ بھی کر دیا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "صاعقہ صاحبہ! آپ کے بیان کے مطابق قتل کی یہ واردات نو بجے صبح پیش آئی۔ جب کہ آپ کے بھائی صغیر شاہ نے اس واقعے کی اطلاع نو پچاس پر تھانے فون کر کے پہنچائی۔ اس تاخیر کا کیا سبب تھا؟"

"ہم دونوں بری طرح گھبرا گئے تھے۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولی۔

"گھبرا گئے تھے یا سٹپٹا گئے تھے؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "یا پھر گڑبڑا گئے تھے؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں وکیل صاحب!" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ آپ دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کریں تو کیا کریں۔ حتیٰ کہ اس وقت آپ کو جو نہایت ہی ضروری کام کرنا چاہئے تھا وہ بھی نہیں کیا۔ آپ کس قسم کی ماں ہیں صاعقہ بیگم؟"

میرے طرزِ تخاطب پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بے چین لہجے میں بولی۔ "مجھے اس موقع پر کون سا ضروری کام کرنا چاہئے تھا؟"

"صفدر بیگ کو فوراً ہسپتال پہنچانے کا کام!" میں نے تلخی سے کہا۔

وہ بہت زیادہ نروس نظر آنے لگی۔ میں نے اس پر اپنے حملے جاری رکھے اور کہا۔ "ایک ماں سے اس قسم کی کوتاہی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ آپ کا جگر گوشہ لب دم تڑپ رہا تھا اور آپ کو اس کی طبی امداد کا خیال تک نہ آیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ ایک ماں ہیں۔ کیا صفدر بیگ آپ کا سگا بیٹا نہیں تھا؟" میں نے ایک لمحے کا وقفہ دے کر سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "اگر آپ ہی نے اسے جنم دیا تھا تو پھر آپ کی ممتا ان لمحات میں کہاں جا سوئی تھی؟ کیا اس وقت آپ بیٹے کی زندگی سے بھی زیادہ اہم کسی پلاننگ میں مصروف تھیں؟"

وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل آب بہہ نکلا۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔ "صفدر میرا سگا بیٹا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ لمحوں میں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اسے کسی قسم کی طبی یا غیر طبی امداد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ علاج معالجے کی ضرورت زندگی کو پیش آتی ہے۔ وہ تو زندگی سے روٹھ کر بہت دور چلا گیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "بہرحال، ان حالات میں پھر بھی آپ کا فرض بنتا تھا کہ اسے کسی اسپتال لے جاتے۔ یہ متاثرین کا فطری ردِ عمل ہوتا ہے لیکن آپ لوگوں نے صفدر بیگ کو کسی ایمرجنسی میں پہنچایا اور نہ ہی ملزم کا تعاقب کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک اور غیر فطری ردِ عمل تھا۔"

صاعقہ کے چہرے پر زردی کھنڈنے لگی۔ میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بیان کے مطابق، ملزم نے صغیر شاہ کی موجودگی میں اپنے شوہر پر گولیاں برسا کر اس کی جان لے لی اور خاموشی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ ہے نا یہ مضحکہ خیز اور بودی سی بات کہ ایک مرد کی موجودگی میں ملزم اپنا کام کر کے چلتی بنی! کیا تمہارے بھائی نے چوڑیاں پہن رکھی تھیں؟" میں غصے میں آپ سے تم پر اُتر آیا تھا۔ "یا اس کے پاؤں میں مہندی رچی تھی جو ملزم کو پکڑنے کے لئے ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا۔"

کٹہرے میں کھڑی صاعقہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ میں نے پے در پے حملے کرتے ہوئے کہا۔ "معزز عدالت تو یہ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور ہے کہ جائے وقوعہ پر موجود تمام

افراد مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ کسی نے بھی ملزم کو روکنے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "اگر تم اور تمہارا بھائی بوکھلا کر رہ گئے تھے تو تم اپنے ملازمین کو تو احکام صادر کر سکتے تھے۔ تم لوگوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ ملزم کو جائے واردات سے صاف بچ کر کیوں جانے دیا؟"

"وہ...... وہ......" وہ کمزور سی آواز میں منمنائی۔ "ہم واقعی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے...... ہم سمجھ نہیں...... پا رہے تھے کہ......"

"جھوٹ...... بکواس......!" میں نے چڑھائی جاری رکھی۔ "درحقیقت تم دونوں اس وقت حالات کو قابو کرنے کی پلاننگ میں مصروف تھے تاکہ واقعات کو اس قسم کا رنگ دیا جائے کہ میری موکل کو قاتل ثابت کیا جا سکے! جب کہ وہ بے چاری تو اس واقعے سے پندرہ بیس منٹ پہلے ہی بنگلے سے رخصت ہو چکی تھی۔ تم لوگوں نے اپنے ملازمین کو اپنے بیانات یاد کرائے جو تمہارے حق میں اور ملزم کے خلاف جاتے تھے۔ کیوں کیا تم لوگوں نے ایسا؟ اس پلاننگ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"پپ...... پانی......" وہ کٹہرے کے چوبی ریلنگ کو تھامتے ہوئے کراہی پھر اپنے حلق کے مقام پر گردن سہلانے لگی۔ واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا، اس کے غبارے کی ساری ہوا نکل چکی تھی۔

میں نے اپنی حکمت عملی کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس اور تمہارے بھائی کے پاس میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں یا یوں سمجھو کہ جو اصل جواب ہے وہ تم لوگ اپنی زبان پر لانے کا رسک نہیں لے سکتے...... کیوں کہ...... کیوں کہ تم دونوں میں سے کوئی ایک صفدر بیگ کا قاتل ہے...... اور دوسرا اسے کور دینے کی مہم پر کمر بستہ ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

مجھے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا۔ صاعقہ بیگم کٹہرے کی ریلنگ کو تھامے تھامے نیچے بیٹھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر کچھ اس قسم کی حرکت پیش کر رہا تھا جیسے اسے شدید نوعیت کا چکر آ رہا ہو۔ میں نے کمر کے بل جھکتے ہوئے، اس کے کان کے قریب اپنا سلگتا ہوا یہ سوال پھینکا۔

"قاتل کون ہے...... صاعقہ بیگم؟"

✡✡✡

آئندہ پیشی پر مقتول کے ماموں کو گواہی کے لئے آنا تھا لیکن وہ منظر سے اس طرح غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میں نے معزز عدالت کے ذریعے استغاثہ پر بھرپور زور ڈلوایا کہ وہ جلد از جلد صغیر شاہ کو عدالت میں پیش کرے مگر وہ ہاتھ نہ آ سکا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے زمین نے نگل لیا ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔

میں نے اپنی جرح کے ذریعے جج پر صورت حال واضح کر دی تھی۔ صغیر شاہ اور صاعقہ بیگم کی

پوزیشن سوالیہ نشان بن کر رہ گئی تھی۔ اب تک بہت سے حقائق سامنے آ چکے تھے جن سے صاعقہ اور صغیر شاہ کی ذاتیں مشکوک ہو کر رہ گئی تھیں۔

صاعقہ کے ذاتی ملازمین صادق علی اور صبور خان کے بیانات میں تضاد پایا جاتا تھا۔

مقتول صفدر بیگ پر بند بیڈروم میں فائرنگ کی گئی تھی جب کہ وہ دونوں اس بات کے دعوے دار تھے کہ انہوں نے واضح طور پر فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ صادق علی نے اپنے بیان کے مطابق ٹھیک نو بجے فائرنگ کی آواز سنی تھی جب کہ میری موکل پونے نو بجے بنگلے سے نکل چکی تھی۔ اس بات کی تصدیق صاعقہ کے پڑوسی صدام حسین کے بیان سے بھی ہوتی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ فائرنگ میری موکل نے نہیں کی تھی۔ اس صورت میں انگلی سوالیہ انداز میں جن دو افراد کی جانب اٹھتی، وہ صغیر شاہ اور صاعقہ ہی تھے۔

صادق علی نے بتایا تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر وہ چوتھائی منٹ میں وقوعہ پر پہنچ گیا تھا اور وہاں صاعقہ اور صغیر شاہ بند دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ اس حادثے کی اطلاع صغیر نے اسے دی تھی۔ دس منٹ بعد اسے بیڈروم کے اندر جانے کا موقع ملا۔ جبکہ چوکیدار صبور خان کا کہنا تھا، وہ فائرنگ کی آواز سنتے ہی بیڈروم کے اندر پہنچ گیا جہاں صاعقہ، صغیر اور صادق علی پہلے سے موجود تھے۔ راستے میں اسے گھبرائی ہوئی صندل بھی ملی تھی لیکن اس نے صندل کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں صادق علی اور صبور خان کے بیانات میں تضاد پیدا ہو جاتا تھا۔

ایک تضاد صبور خان اور صدام حسین کے بیانات میں بھی تھا۔ صبور کے مطابق فرار کے وقت صندل نے گلابی رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا جبکہ صدام حسین کا کہنا تھا وہ اس وقت فیروزی شلوار قمیص میں تھی۔ یہی بیان انکوائری افسر صلاح الدین کا بھی تھا۔ گرفتاری کے وقت میری موکل نے فیروزی شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔

اسی طرح انکوائری افسر کے بیان اور رپورٹ میں بھی بہت سی خامیاں موجود تھیں۔ میں یہ تمام نکات جج کے علم میں لا چکا تھا۔ کیس جب آخری مراحل میں تھا تو استغاثہ کا گواہ صغیر شاہ اچانک غائب ہو گیا۔ سب سے مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اس کیس کا عینی شاہد تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے، استغاثہ کے مطابق ملزم صندل نے مقتول صفدر بیگ کے جسم میں دو گولیاں اتاری تھیں جن میں سے ایک اس کی موت کا سبب بن گئی۔

صغیر شاہ کی روپوشی نے استغاثہ کے بخیے ادھیڑ دیے اور صغیر شاہ کو بھاگنے پر مجبور کرنے والی میری جرح تھی جو میں نے گزشتہ پیشی پر صاعقہ بیگم پر کی تھی...... گویا میں نے صاعقہ کو سامنے رکھتے ہوئے استغاثہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔

جج نے صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے صاعقہ بیگم کو شامل تفتیش کرنے کے احکام صادر کر دیے۔ اس موقع پر اس نے بہت واویلا مچایا۔ دہائی دی کہ ایک تو اس کا بیٹا مارا گیا، الٹا

اس کے قتل کے شک میں گرفتار بھی اسی کو کیا جا رہا تھا!

مگر پولیس اس قسم کی داد فریاد پر کان نہیں دھرتی۔ عدالت میں کھلنے والے حقائق انکوائری افسر سے پوشیدہ نہیں تھے۔ جب صاعقہ بیگم پولیس کے ہتھے چڑھی تو انہوں نے اس کی زبان کھلوا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کروالیا۔

صاعقہ نے پولیس کسٹڈی میں ایک طویل اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا بیان ریکارڈ کرایا، جس کا خلاصہ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

وقوعہ کے روز جب میری موکل صندل اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر بنگلے سے نکل گئی تو صاعقہ اپنے بھائی کو لے کر صفدر کے بیڈ روم میں گھس گئی تھی۔ وہ میاں بیوی کی تلخ کلامی کا اندازہ لگا چکی تھی۔ جب انہوں نے صفدر کو سمجھانے کے چکر میں اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ پہلی فرصت میں صندل کو طلاق دے دے تو صفدر ان پر پلٹ پڑا۔ اس روز اس نے اپنی ماں کو بھی کھری کھری سنائیں۔ صغیر شاہ کو تو صفدر نے اتنا برا بھلا کہا کہ وہ طیش میں آ کر اسے مارنے کے لئے لپکا۔ صفدر پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ وہ صغیر شاہ اور اس کی بیٹی صدف سے بہت نالاں تھا۔ یہ سارا فساد انہی کا پھیلایا ہوا تھا۔ صدف ان دنوں اپنے ماموں کے پاس حیدرآباد گئی ہوئی تھی۔

جب صغیر شاہ نے صفدر پر ہاتھ اٹھایا تو وہ بھی لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے واضح الفاظ میں اپنے ماموں کو دھمکی دی کہ آج وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا پھر عملی طور پر ثابت کرنے کے لئے اس نے اپنا ریوالور نکال لیا۔

اس موقع پر صغیر شاہ نے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور آنِ واحد میں ایک خطرناک داؤ استعمال کر کے ریوالور صفدر کے ہاتھ سے چھین لیا...... پھر قبل اس کے کہ صاعقہ اپنے بھائی کو کسی انتہائی قدم سے باز رکھ سکتی۔ صغیر شاہ نے یکے بعد دیگرے دو فائر صفدر پر کئے۔ وہ پلک جھپکتے میں کسی کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین بوس ہو گیا۔ فوری طور پر اس کا جسم خون اگلنے لگا تھا۔ دس بارہ منٹ میں وہ ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔

بھائی کی حماقت اور جذباتیت سے صاعقہ کا بیٹا زندگی سے ہار بیٹھا تھا۔ اب اگر وہ کسی قسم کی حماقت یا جوش کا مظاہرہ کرتی تو بھائی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی۔ صغیر شاہ کو صفدر کے قتل کے الزام میں پولیس پکڑ لے جاتی پھر اسے بالآخر پھانسی ہو جاتی یا باقی ساری عمر اس کی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرتی۔

اس موقع پر باتدبیر صغیر شاہ نے اپنی بہن کو ایک انوکھی راہ سمجھائی جس پر قدم رکھ کر مزید کسی بھی نقصان سے بچا جا سکتا تھا اور اس طرح وہ دونوں میری موکل سے ایک عبرت ناک انتقام لینے میں بھی کامیاب ہو جاتے۔ صندل نے اگر ایک طرف صاعقہ کی مرضی کے بغیر اس کے بیٹے سے شادی کر کے اسے حاصل کر لیا تھا تو دوسری جانب اس نے صغیر شاہ کے خواب کو چکنا چور کر دیا تھا۔

وہ خواب جس میں وہ اپنی بیٹی کو صفدر کی بیوی بنا کر سارے مال و جائیداد پر قابض ہونے کی منصوبہ سازی کر چکا تھا۔

بہن بھائی نے باہمی مشاورت اور ملی بھگت سے ایسا اسٹیج تیار کیا کہ صندل ان کے پھینکے ہوئے جال میں جکڑ گئی۔ شیکسپیئر نے بالکل درست کہا تھا...... یہ دنیا ایک اسٹیج ہے جس پر ہم اپنے حصے کا کردار ادا کرتے ہیں۔

صاعقہ کے اقرارِ جرم کے بعد پولیس نے شد و مد کے ساتھ صغیر شاہ کو تلاش کیا اور چند روز بعد انہیں اپنی جستجو میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ پھر اس کی زبان کھلوانا پولیس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ صغیر شاہ کی گرفتاری کے بعد عدالت نے میری موکل کو اس کیس سے خارج کر دیا تھا۔ ویسے صاعقہ کے اقبالِ جرم نے صندل کی رہائی کی راہ تو پہلے ہی کھول دی تھی۔ جج نے اس کی، ملزم والی حیثیت کو ختم کر کے مقدمے میں پابند گواہ بنا لیا تھا۔ صغیر شاہ کی پکڑ کے بعد صندل ہر پابندی سے آزاد ہو گئی۔

✿✿✿

حاصل جمع

بعض لوگوں کی عجیب عادت ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات کہنے کے ڈھنگ سے واقف نہیں ہوتے۔ مدعا بیان کرتے ہوئے وہ فروعی اور غیر ضروری باتوں میں الجھ کر بار بار پٹری سے اترتے رہتے ہیں۔ انہیں موضوع پر باندھ کر رکھنا اور ان کے مقصد تک پہنچنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی شخص تھا!

اس نے میرے چیمبر میں داخل ہونے کے بعد مجھے ایک بھرپور سلام کیا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا پھر اپنی میز کے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شائستگی سے کہا۔ ”تشریف رکھیں!“

اس نے تشریف رکھ دی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ”مجھے فخرو بھائی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

فوری طور پر میرے ذہن میں نہ آسکا، وہ کس فخرو بھائی کا حوالہ دے رہا تھا۔ میں بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بڑی شد و مد سے اپنی جیب میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس بندۂ خدا کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ جسم متناسب، قد دراز اور ایک آنکھ میں معمولی سا نقص۔ اس عیب کو بھینگا پن تو نہیں کہا جا سکتا تھا، بہرحال اس کی دونوں آنکھوں کا زاویہ یکساں نہیں تھا۔

چند منٹ بعد وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اس کوشش کے ثمر کے طور پر اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ میری طرف بڑھایا۔ ”یہ دیکھیں وکیل صاحب!“

میں نے کارڈ ہاتھ سے لے کر اس پر نگاہ ڈالی۔ وہ کسی فخرو اسٹیٹ ایجنٹ کا تعارفی کارڈ تھا۔ اس حوالے کی بہ نسبت میں فوراً پہچان گیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ فخرو بھائی سے کچھ عرصہ پہلے میری ایک ڈیل ہوئی تھی۔ میرے ایک دوست کو گارڈن ایسٹ میں ایک بنگلا خریدنا تھا۔ وہ بنگلا فخرو بھائی کے ذریعے خریدا گیا۔ میں اس سودے میں ذاتی طور پر ملوث تھا اس لئے فخرو بھائی سے راہ و رسم قائم ہوگئی۔ اس کی خواہش تھی، میں باقاعدہ اس کے ساتھ کام کروں۔ وکیل ہر پراپرٹی ایجنٹ کی ایک اہم ضرورت ہوتا ہے۔ میرے پاس اس نوعیت کے چھوٹے موٹے کاموں کی چونکہ فرصت نہیں ہوتی، لہٰذا میں نے فخرو بھائی سے معذرت کر لی تھی۔

میں نے کارڈ کو میز پر ڈال دیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا۔ ”آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”فخرو بھائی نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔“ وہ بڑی عقیدت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ”تعریف اس خدا کی جو ہم سب کا خالق ہے۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر سوالیہ نظر سے اس شخص کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”وکیل صاحب! میں آپ کی پوری فیس ادا کروں گا اور جو بھی خرچا آئے گا، میں دوں گا۔ میں.....“

میں نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی اور کہا۔ ”یہ سب تو آپ کو کرنا ہی ہوگا۔ سب سے پہلے آپ مجھے اپنی پرابلم بتائیں۔“

”پرابلم میرے بیٹے کے ساتھ ہے۔“ وہ پریشانی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ کے بیٹے کو کیا ہوا ہے؟“

”میں پہلے اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام احمد علی ہے۔“ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک الگ موضوع چھیڑ ڈالا۔ ”میں گارڈن ویسٹ میں رہتا ہوں۔ سولجر بازار میں میرا ایک کاسمیٹکس سٹور ہے۔ سلیم میرے ساتھ اس سٹور پر بیٹھتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”فخرو بھائی نے کہا تھا، آپ ان کے دوست ہیں۔ میں جیسے ہی فخرو بھائی کا نام لوں گا، آپ فوراً میرا کام کر دیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، سلیم ایسا لڑکا نہیں۔“

میں اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔ آپ نے اندازہ لگایا، بعض اوقات مجھے کیسے کیسے لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بہرحال، یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے۔ تھوڑی جھنجلاہٹ الگ بات ہے۔ یہ کسی بھی معقول انسان کا فطری ردِعمل ہوگا لیکن اپنے پاس آنے والے کلائنٹس کی کہانیاں سننا میرے فرائض میں شامل ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کہانیوں میں کچھ بے سروپا اور اکتاہٹ آمیز بھی ہوتی ہیں۔ میرا روزگار لوگوں کے مسائل سننے اور انہیں حل کرنے سے وابستہ ہے لہٰذا ہر کلائنٹ پر توجہ دینا ایک لازمی امر ہے۔ سادہ الفاظ میں ”اِٹس اے جاب“ کہہ سکتے ہیں!

احمد علی نامی وہ عجیب شخص خاموش ہوا تو میں نے بڑے رسان سے کہا۔ ”میں نے فخرو بھائی کے ریفرنس کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا ہے۔ اس لئے فی الحال آپ اسے بھول جائیں۔ میں ہر ممکن آپ کی مدد کروں گا۔ برائے مہربانی مجھے اپنے مسئلے سے آگاہ کریں۔ یہ سلیم صاحب کون ہیں؟“

”سلیم میرا بیٹا ہے وکیل صاحب!“ احمد علی زور دے کر بولا۔ ”سارا مسئلہ اسی کا ہے۔“

”اب وہ مسئلہ بھی بتا ہی دیں؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”پولیس نے میرے بیٹے کو گرفتار کر لیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ خدا کا شکر تھا، احمد علی لائن پر آ گیا تھا۔ میں نے پیڈ پر نوٹ

کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”پولیس نے آپ کے بیٹے سلیم کو کیوں گرفتار کیا ہے؟ اس پر کیا الزام عائد کیا گیا ہے؟“

”کیا یہ بتانا بہت ضروری ہے؟“ اس نے احمقانہ انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ”بے حد ضروری!“ میرے لہجے میں قطعیت تھی۔ ”اس سے کیس کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے گا۔“

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد گویا ہوا۔ ”پولیس نے سلیم پر نہایت ہی گھٹیا اور بے ہودہ الزام لگایا ہے۔ میں جانتا ہوں، میرا بیٹا ایسا نہیں کر سکتا۔“

وہ ایک مرتبہ پھر پٹری سے اترنے لگا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”جناب! آپ اس چکر میں نہ پڑیں کہ الزام گھٹیا ہے یا بڑھیا! پولیس والے کسی شخص کو نماز پڑھنے یا حج ادا کرنے کے الزام میں نہیں اٹھاتے۔ گرفتاری کا جواز سنگین ہی ہوا کرتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں، پولیس نے سلیم کو گرفتار کرنے کا کیا جواز پیدا کیا ہے؟“

”وکیل صاحب! آپ ہمارے ملک کی پولیس کو تو جانتے ہی ہیں۔ یہ لوگ پیدا کرنے اور مارنے کے ماہر ہیں۔ اپنی مطلب براری کے لئے کوئی بھی جواز گھڑ سکتے ہیں اور کوئی بھی ثبوت تلف کر سکتے ہیں۔ بہرحال، میں آپ کو بتاتا ہوں!“

اتنا کہہ کر وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا۔ آخری جملہ ”امید افزا“ ادا کر کے اس نے میرے سوال کا راستہ روک دیا تھا۔ میں مستفسرانہ نگاہ سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”سلیم پر الزام ہے، وہ ایک نامحرم کے ساتھ فحش قسم کی حرکتیں کر رہا تھا۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ احمد علی نے خاصا خلافِ توقع جواب دیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر قائم رکھتے ہوئے پوچھا۔

”سلیم کس نامحرم کے ساتھ فحش حرکتیں کر رہا تھا؟“

”اس نے ایسا کچھ نہیں کیا جناب!“ وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔

میں نے جلدی سے وضاحت کر دی۔ ”میری مراد پولیس کے موقف سے ہے۔ اگر پولیس نے آپ کے بیٹے پر فحش اور نازیبا حرکات کا الزام لگایا ہے تو یقیناً اس کہانی میں کسی عورت یا لڑکی کا کردار بھی ہو گا؟“

”اس حرافہ کا نام نورین ہے!“ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

احمد علی کا انداز مجھے پسند نہ آیا۔ یہ ناپسندیدگی میرے چہرے سے بھی عیاں ہو گئی۔ میں نے معتدل لہجے میں پوچھا۔ ”پولیس نے سلیم اور نورین کو کہاں سے گرفتار کیا ہے؟“

”مزارِ قائد سے۔“ اس نے جواب دیا۔

اس زمانے میں آج کل کی طرح مذکورہ مقام پر ڈیٹ کے شائقین کے لئے آسانیاں حاصل نہیں تھیں۔ پولیس والے وردی میں اور بعض اوقات سادہ لباس میں چاروں طرف گھومتے رہتے تھے اور مشکوک جوڑے کو دیکھتے ہی اس کا انٹرویو شروع کر دیتے تھے۔ پولیس کا یہ عمل اصلاحِ معاشرہ سے زیادہ اپنی جیب گرم کرنے کا ایک وسیلہ ہوتا تھا۔ آپ اسے سادہ الفاظ میں خدمتِ خلق کی بجائے خدمتِ حلق بھی کہہ سکتے ہیں!

میں نے اپنے سامنے بیٹھے احمد علی سے ایک اہم سوال کیا۔ ”جب آپ کا بیٹا اتنا ہی پارسا اور بے قصور ہے تو پھر وہ نورین نامی اس لڑکی کے ساتھ وہاں کیا کر رہا تھا؟ آپ نے نورین کے لئے تھوڑی دیر پہلے جو نازیبا لفظ استعمال کیا ہے، اس کی رو سے تو وہ اچھے کردار کی لڑکی نہیں ہو سکتی!“

میں نے اپنے غصے کو الفاظ کے پہناوے میں ظاہر کر ہی دیا۔

وہ بولا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ نورین واقعی اچھے کردار کی لڑکی نہیں۔“

”یہ میں نہیں، آپ کہہ رہے ہیں احمد علی!“ میں نے تنبیہی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کے ادا کئے ہوئے لفظ ”حرافہ“ کا مفہوم بیان کیا ہے۔“

اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، کھسیاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”دراصل میں آپ کو یہ بتا رہا تھا، سلیم اس لائن کا بندہ نہیں۔ نورین ہی اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا، یہ لوگ چھپ کر باہر بھی ملتے ہیں۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ سامنے آ گیا ہے۔“

والدین کی نظر میں ان کی اولاد عموماً بے قصور ہوتی ہے۔ بہت ہی کم ماں باپ ایسے ہوں گے جو حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اولاد کی غلطیوں کو تسلیم کریں۔ احمد علی کا شمار ان معدودے چند میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے غیر ضروری بحث و تمحیص سے اجتناب برتا۔ اپنی اولاد کے بارے میں کسی کی رائے کو بدلنا آسان نہیں ہوتا اور میں اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا لہٰذا اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں احمد علی صاحب؟“

”آپ میرے بیٹے کو پولیس کے چنگل سے نکال لیں۔“ اس نے کہا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ معاملہ اتنا سنگین نہیں تھا۔ اگر احمد علی پولیس والوں کی مٹھی گرم کر دیتا تو وہ وکیل کی بھاری فیس اور عدالتی خرچے سے بچ سکتا تھا۔ راشی اور مرتشی والا معاملہ اس کیس پر اور اسی نوعیت کے دوسرے کیسوں پر لاگو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر پولیس کسی بے گناہ کو اٹھا کر تھانے میں بند کر دے اور اس کی رہائی کے لئے کچھ رقم کا مطالبہ بطور رشوت کرے تو اس صحت کی رشوت کو صحیح المفہوم رشوت کے برابر نہیں کھڑا کیا جا سکتا۔ یہ تو ایک طرح سے تاوان ہو گا جس کی ادائیگی ایک ”مغوی“ کی رہائی کے لئے کی جائے گی۔ یہ رقم حاصل کرنے والا تو یقیناً گنہگار ہو گا،

البتہ جان بچانے کی خاطر رقم مہیا کرنے والا بے قصور ہوگا کیونکہ جان بچانے کا حکم ہر حال میں ہے اور اس کوشش کے لئے حرام شے کے بھی استعمال کی اجازت ہے۔ ویسے نیتوں کا حال تو وہی قادرِ مطلق جانتا ہے۔

میں نے اسی تناظر میں احمد علی سے پوچھا۔ ''کیا آپ پولیس والوں سے اس سلسلے میں کوئی بات کر چکے ہیں؟''

''ہاں، میں سلیم سے ملنے تھانے گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے قسمیں کھا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ میرا بیٹا بے گناہ ہے اس لئے وہ سلیم کو چھوڑ دیں لیکن وہ تو کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے، ہر باپ اپنی اولاد کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتا ہے۔ انہوں نے سلیم کو اگر پکڑا ہے تو کچھ دیکھ کر ہی پکڑا ہے۔ مجرم اور بے گناہ کا فیصلہ عدالت کرے گی۔'' وہ سانس لینے کی خاطر ایک لمحے کو رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جب میں نے بہت زیادہ ضد کی......اور شور مچایا تو ایک کانسٹیبل مجھے تنہا گوشے میں لے گیا اور کہا کہ اگر میں صبح سے پہلے ایک لاکھ روپے کا بندوبست کر دوں تو وہ سلیم کو چھوڑ دیں گے۔''

''ہیں، لاکھ روپے!'' میں نے حیرت سے دہرایا۔ ''کیا واقعی انہوں نے اتنی بڑی رقم رشوت میں مانگی ہے؟''

اس زمانے میں ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی تھی۔ احمد علی نے پُریقین انداز میں بتایا۔

''جی وکیل صاحب! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ ایک روپیہ کم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے دھمکی دی ہے، اگر میں نے ان کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ کل سلیم کو عدالت میں پیش کر دیں گے۔ وہ اتنا مضبوط کیس بنائیں گے کہ سلیم کو اگر سنگسار کی سزا نہ بھی ملی تو اتنے کوڑے ضرور پڑیں گے کہ وہ اس چابک کاری کے دوران ہی میں انا للہ ہو جائے۔''

''بکواس کرتے ہیں وہ۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''جو صورتِ حال آپ نے بتائی ہے اس پر حدود آرڈیننس کا اطلاق نہیں ہوتا اور یہ کہ اس قسم کے کیسوں میں سزا کسی ایک فریق کو تو نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے محض آپ کو ڈرانے اور رقم بٹورنے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ آپ کب تھانے گئے تھے؟''

میں احمد علی سے سوال و جواب تو کر رہا تھا لیکن میرا ذہن پولیس کے بھاری رشوتی مطالبے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''میں یہاں آنے سے پہلے تھانے گیا تھا۔ تقریباً سات بجے شام۔''

''اور ان دونوں کو کتنے بجے گرفتار کیا گیا ہے؟''

''دوپہر دو بجے کے قریب۔''

''بھری دوپہر میں!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

میں بے ساختہ یہ مختصر سا جملہ بول کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ستمبر کی آٹھ تاریخ تھی۔ ستمبر کا مہینہ کراچی کے موسم کے اعتبار سے گرم ترین مہینہ شمار ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جائے وقوعہ پر سائے میں نشست جمانے کا کوئی معقول ''ذریعہ'' نہیں تھا۔ آج کل حالات خاصے بدلے ہوئے ہیں! وہ دونوں کسی جھاڑی کی آڑ میں چھپ کر راز و نیاز میں مصروف ہوں گے کہ پولیس نے انہیں دھر لیا۔ وقت اور حالات واقعی ان دونوں کی مخالفت میں خاصے سازگار ثابت ہوئے تھے۔ عام طور پر ایسے جوڑوں کو گھیرنے والے پولیس اہلکار مُک مُکا کر کے انہیں چھوڑ دیتے تھے۔ ایک لاکھ روپے والی کہانی مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ میں تیزی سے اس کے پس منظر میں جھانکنے کے لئے بے چین ہو گیا۔

جو شے ہضم نہ ہو یا آسانی سے ہضم نہ ہو، وہ ہمیشہ الجھن اور انتشار کا باعث بنتی ہے۔ میری سوچ میں خاصا الجھاؤ اور ذہن میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اصل صورتِ حالات تو تھانے جا کر ہی کھل سکتی تھی۔ میں نے احمد علی سے کہا۔

''اس کے علاوہ آپ اور کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''بس میرا بیٹا چھوٹ جائے۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''احمد علی! پولیس نے آپ کے بیٹے کے ساتھ نورین نامی اس لڑکی کو بھی اٹھایا ہے۔ کیا نورین بھی تھانے میں بند ہے؟''

''جی ہاں، میں نے حوالات میں اسے بھی دیکھا ہے۔''

''کیا وہ ایک ہی کمرے میں رکھے گئے ہیں؟''

''نہیں، دونوں الگ ہیں۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں دفتر سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے بیٹے سے، بلکہ دونوں گرفتار شدگان سے ملاقات کروں گا۔ انہیں ٹٹولنے کے بعد ہی اصل صورتِ حال سامنے آئے گی۔ انہیں کس تھانے کی حوالات میں بند کیا گیا ہے؟''

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کے بارے میں بتایا پھر قدرے متعجب لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''وکیل صاحب! سلیم سے ملاقات کی بات تو میری سمجھ میں آ رہی ہے کیونکہ میں آپ کو اس کا وکیل کر رہا ہوں مگر آپ نورین سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

میں نے افسوس ناک نظر سے اس کم سمجھ شخص کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا پولیس نے صرف آپ کے بیٹے کو گرفتار کیا ہے؟''

''گرفتار تو دونوں کو کیا ہے وکیل صاحب!'' وہ سرسری انداز میں بولا۔

''آپ کے خیال میں مقدمہ صرف سلیم پر ہی چلے گا؟'' میں نے استفسار کیا۔

"دونوں کو پکڑا ہے تو مقدمہ بھی دونوں پر چلے گا۔"

"اسی لئے دونوں سے ملاقات ضروری ہے۔"

وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "اس طرح تو سلیم کے ساتھ نورین بھی چھوٹ جائے گی!"

"تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب! کچھ ایسا کریں، میرا بیٹا تو اس مصیبت سے نکل آئے مگر وہ لڑکی پولیس کے چکر میں پھنسی رہے۔ میں آپ کو منہ مانگی رقم دوں گا۔"

اس کی نامعقول خواہش نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا۔ میں نے قدرے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کے پاس اتنی ہی زیادہ دولت ہے تو پولیس والوں کا مطالبہ پورا کر کے بیٹے کو گھر کیوں نہیں لے جاتے؟"

"وہ جناب! ایک لاکھ تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ وہ پانچ دس ہزار مانگتے تو کوئی بات بھی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی آپ مجھے جو منہ مانگی رقم کی پیشکش کر رہے ہیں اس کے بارے میں آپ کتنے فیصد سنجیدہ ہیں۔ اگر میں نے لاکھ سے اوپر مانگ لئے تو آپ کیا جواب دیں گے؟"

وہ ہکا بکا ہو کر میری صورت دیکھنے لگا۔

ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں آیا کہ اس سے معذرت کر کے چلتا بنا دوں۔ وہ منفی سوچ کا حامل تھا اور میرے پاس خدانخواستہ کیسوں کی کمی نہیں تھی جو کسی مجبوری میں ہاتھ آئے کلائنٹ پر گرفت مضبوط کر لیتا۔ میں نے اصولوں پر کبھی سودا نہیں کیا لہٰذا اسے ایک موقع دینا ضروری سمجھا۔ اگر اس کے بعد بھی اس کی سوچ میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی تو پھر میں اسے اپنے دفتر سے رخصت کر دیتا۔

میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ "احمد علی! شاید آپ کو اس کیس کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ اگر ہم نے لڑکی کو مائنس کر دیا تو ہماری پوزیشن بہت کمزور ہو جائے گی۔ پولیس نے ان دونوں کو ایک ہی الزام میں پکڑا ہے۔ گویا ہماری حریف پارٹی پولیس ہے...... یعنی قانون ہے! جس طرح لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے بالکل ویسے ہی قانون کا مقابلہ قانونی داؤ پیچ سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ لڑکی اور لڑکے کو ایک فریق کی حیثیت پولیس یعنی استغاثہ کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں، میں ان دونوں کی مدد کروں گا۔ میرا تو یہی مشورہ ہے، اس نازک موقع پر لڑکی اور اس کے لواحقین سے الحاق کر لو۔ مقدمہ جیتنے کے بعد آپ ان لوگوں کے بارے میں جو جی چاہے سوچتے رہنا۔"

وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک تو معاملہ پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر انہوں نے گرفتار شدگان کو عدالت کی سیر کرا دی تو صورت سنگین ہو جائے گی۔ میں تھانے جا کر ان دونوں سے ملتا ہوں...... اور صورت حالات

جاننے کی کوشش کرتا ہوں، ممکن ہے بہتری کی کوئی راہ نکل آئے۔ آپ اس دوران میں ایک کام کرو۔"

اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ لڑکی کے ورثا سے ملاقات کرو اور انہیں کسی طرح میرے پاس لانے کی کوشش کرو۔ مجھے امید ہے پولیس نے لڑکی والوں سے بھی کسی بھاری رقم کا مطالبہ کیا ہوگا۔ کیا آپ جانتے ہیں، کچھ اس بارے میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"کیا لڑکی والوں نے پولیس سے کوئی رابطہ کیا ہے؟"

"مجھے علم نہیں ہے وکیل صاحب!"

میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "بس تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ لڑکی کے لواحقین سے رابطہ کر کے انہیں ادھر کی راہ دکھائیں۔ گرفتار شدگان کا وکیل کسی ایک ہی شخص کو ہونا چاہئے۔ اگر نورین کے ورثا نے کوئی دوسرا وکیل کر لیا تو یہ کیس چوں چوں کا مربا بن کر رہ جائے گا۔ وہ لوگ میرے پاس آئیں تو میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے سوال کیا۔ "کیا نورین کے والدین صاحب حیثیت ہیں؟"

"وہ سونے والے ہیں وکیل صاحب!" وہ بیزاری سے بولا۔

"سونے والے...... کیا مطلب؟" میں چونکا۔

وہ جلدی سے بولا۔ "میرا مطلب ہے، نورین کا باپ عبدالکریم سونے کا بزنس کرتا ہے۔ ادھر کھارادر میں اس کی میکنگ فیکٹری ہے۔ اس کے علاوہ دو دکانیں جیولری کی خرید و فروخت کی ہیں۔ ایک دکان صدر کے علاقے میں ہے، دوسری طارق روڈ پر۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے، پولیس کو ہر صورت میں گھٹنے ٹیکنا ہوں گے۔ عبدالکریم ان کا "مطالبہ" پورا کرنے کی بھی استطاعت رکھتا ہے اور مقدمہ لڑنے کا حوصلہ بھی۔ میرا خیال ہے احمد علی! آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا برآمد کر لیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! آپ اپنی فیس تو لے ہی لیں، باقی باتیں بعد میں دیکھیں گے۔ میں نے سنا ہے، آپ فیس ایڈوانس لیتے ہیں۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "لیکن میرا مشورہ ایک مرتبہ پھر یہی ہوگا، آپ عبدالکریم کو میرے پاس لے آئیں۔ اس طرح آپ کی جیب پر زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا اور آپ کے لئے......"

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ کے کہنے پر میں کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ ویسے مجھے امید نہیں، عبدالکریم میری بات ماننے پر تیار ہو۔ وہ بڑا الٹے دماغ کا بندہ ہے۔“

میں نے ایک بات واضح طور پر محسوس کی اور وہ یہ کہ احمد علی، عبدالکریم کے لئے اپنے دل میں کوئی گنجائش نہیں رکھتا تھا۔ شاید اسی تنگ قلبی کے نتیجے میں اس نے نورین کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے۔ میں نے اس سے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فیصلہ کیا، عبدالکریم سے جب ملاقات ہوگی تو اسے سمجھانے اور قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے، وہ احمد علی کی رائے کے برعکس سیدھے دماغ کا بندہ ثابت ہو!

احمد علی نے ایک مرتبہ پھر مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ ”آپ اپنی فیس وصول کر لیتے تو مجھے اطمینان ہو جاتا بیگ صاحب!“

میں نے پُرسوچ نظر سے اسے دیکھا۔ کلائنٹ کو مطمئن کرنا میرے فرض کا حصہ ہے۔ میں نے احمد علی کے اطمینان کی خاطر فیس وصول کر کے رسید اس کے حوالے کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

✿✿✿

ٹھیک نو بجے رات میں نے اپنی گاڑی تھانے کی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور کی رِنگ کو انگلی میں گھماتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت تھانے میں خاصی چہل پہل تھی لیکن تھانہ انچارج اپنی کرسی پر موجود نہیں تھا۔ میں نے ایک ذمے دار اہلکار سے پوچھا۔

”انچارج صاحب کہاں گئے ہیں؟“

اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”آپ کو ان سے کیا کام ہے؟“

”کام مجھے ان سے نہیں بلکہ تم سے ہے!“

”مجھ سے؟“ اس نے بڑی رعونت سے کہا۔ ”بولیں جی، کیا کام ہے؟“

میں نے نیچی آواز میں رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ”سنا ہے، آج دوپہر میں آپ نے لیلیٰ مجنوں کو پکڑا ہے!“

”ہاں پکڑا تو ہے۔“ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

”مجھے اسی جوڑے سے ملاقات کرنا ہے۔“ میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

”آپ کون ہیں؟“ اس نے تیز نظر میں مجھے تولنے کی کوشش کی۔

میں نے بتایا۔ ”میں ان کا خیر خواہ ہوں۔ آپ ملاقات کرا دو، آپ کی خیر خواہی بھی کر دوں گا۔“

میرا انداز ایسا تھا کہ وہ پلک جھپکتے میں بات کی تہ میں اتر گیا اور حریصانہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کی اوقات کے مطابق ”سلوک“ کیا تو وہ مکاری سے بولا۔

”اس میں تو صرف ایک سے ملاقات ہو سکتی ہے!“

”میں پہلی اور آخری مرتبہ یہاں نہیں آیا ہوں۔“ میں نے بھی ایک چال چلی اور پھر ارد گرد نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”میری جس بندے سے ڈیلنگ ہے وہ نظر نہیں آ رہا۔ لگتا ہے، مجھے اسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

یہ گویا اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھنے کے مترادف تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔ آؤ، میں آپ کی ملاقات کرواتا ہوں۔“

میں اس پولیس اہلکار کے ساتھ حوالات کی طرف بڑھ گیا۔ میری معلومات کے مطابق نورین اور سلیم کو حوالات کے دو مختلف کمروں میں رکھا گیا تھا۔ میں نے پہلے نورین سے ملنے کا قصد کیا اور اپنے ساتھ آنے والے پولیس اہلکار سے کہا۔

”تم اب جا سکتے ہو۔ میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

”آپ پندرہ چھوڑ، بیس منٹ لگائیں، میں یہیں کھڑا ہوں۔“

”میں ان لوگوں سے تنہائی میں بات کروں گا۔“

”کیا بات کریں گے؟“ وہ بدکا۔

”اگر بات بتانے کی ہوتی یا تمہارے سامنے کرنے کی ہوتی تو پھر تنہائی والی بخ کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے قدرے ناراضی سے کہا تو وہ خاموشی سے ٹل گیا۔

میں نورین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس لڑکی کی عمر ستائیس کے قریب ہو گی۔ رنگ گندمی، چہرہ پُرکشش اور قد و قامت مناسب تھی۔ البتہ وہ فربہی میں خاصی ترقی یافتہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کا وزن کسی بھی طور اسی کے جی سے کم نہیں ہو گا، زیادہ ہونے کے امکانات ایک سو ایک فیصد تھے۔

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”نورین! مجھے پتا چلا ہے، آج پولیس نے تم دونوں کو ناحق پکڑ کر تھانے میں بند کر دیا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو، میں تم دونوں کی مدد کروں گا۔ مجھے بتاؤ، قصہ کیا ہے؟“

اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ اس حیرت میں ایک عجیب سا کھوج شامل تھا، پھر اس کے لب وا ہوئے۔ ”پہلے تو آپ اپنے بارے میں بتائیں۔ آپ کون ہیں اور کس حیثیت سے مجھ سے ملنے آئے ہیں؟ میں کسی اجنبی سے اپنے ذاتی معاملات شیئر نہیں کر سکتی۔“

وہ اپنی باتوں سے پڑھی لکھی اور سمجھ دار لگتی تھی۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں سلیم کا وکیل ہوں۔ آپ چاہیں گی تو آپ کا وکیل بھی بن جاؤں گا۔ مجھے مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کہتے ہیں۔“

”سلیم!“ اس نے برا سا منہ بنایا پھر سپاٹ آواز میں بولی۔ ”سوری بیگ صاحب! مجھے کسی

وکیل کی ضرورت نہیں۔"

اس کا رویہ خلافِ توقع اور میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ پولیس نے ان دونوں کو ایک جگہ سے پکڑا تھا اور ان پر کم و بیش ایک جیسا الزام تھا مگر نورین کا اعتماد بتا رہا تھا، در پردہ کچھ اور کہانی ہے۔ سلیم کا نام اس نے ناپسندیدگی سے لیا تھا۔ یہ بھی ایک تعجب خیز بات تھی حالانکہ وہ دونوں اپنی مرضی سے وہاں پہنچے ہوں گے جہاں سے انہیں گرفتار کیا گیا۔ یہ لاتعلقانہ انداز بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "جب کوئی انسان پولیس والوں کے ہتھے چڑھتا ہے تو لامحالہ اسے کسی وکیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ سلیم کے باپ نے مجھے اس کا وکیل مقرر کیا ہے۔ آپ دونوں کا مشترکہ معاملہ ہے لہٰذا آپ کو بھی ایک وکیل کی ضرورت ہے...... اور وکیل آپ دونوں کا کوئی ایک شخص ہی ہو تو زیادہ مفید ثابت ہوگا......!"

اس نے میری بات کو پوری توجہ سے سنا اور حتمی لہجے میں بولی۔ "پہلی بات تو یہ اپنے ذہن میں بٹھا لیں کہ یہ ہمارا مشترکہ معاملہ نہیں ہے۔ آپ کو میرے سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈیڈی نے میری رہائی کا بندوبست کر لیا ہے۔"

اس کی بات سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ وہ بڑی صفائی سے اس معاملے سے الگ ہو رہی تھی اور انداز نہایت ہی ٹھوس اور پُراعتماد تھا۔ اس لڑکی نے صحیح معنوں میں مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ میں نے اپنی تسلی کی خاطر اسے کریدنا چاہا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ کے ڈیڈی نے کس قسم کا بندوبست کر لیا ہے؟"

"پلیز! میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"میں آپ کے ڈیڈی سے ضرور ملوں گا۔" میں نے کہا۔ "لگتا ہے وہ کیس کو بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

یہ بات میں نے خواہ مخواہ ہی کہہ دی تھی۔ اسے میری بے ساختگی سمجھ لیں ورنہ میں مطلق نہیں جانتا تھا، نورین کے والد عبدالکریم نے اپنی بیٹی کی رہائی کے لئے کسی نوعیت کی پیش قدمی کی ہو گی۔

نورین نے درشتی سے کہا۔ "وہ میرے ڈیڈی ہیں، میرے خیر خواہ ہیں۔ انہوں نے میری رہائی کے سلسلے میں جو بھی اقدام کیا ہو گا، بہت سوچ سمجھ کر کیا ہو گا۔ آپ اپنے موکل کی وکالت کے بارے میں سوچیں۔"

نورین کے پاس مزید رکنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے تمام تر روکھے پن کے باوجود بھی مجھے اس کا رویہ بھایا۔ وہ اپنے باپ پر اعتماد کرتی تھی اور اسے اپنا سچا خیر خواہ سمجھتی تھی۔ کسی بھی باپ کے لئے اولاد کی طرف سے ایسا ردِعمل قابلِ فخر ہے۔ اس لحاظ سے عبدالکریم خاصا

خوش قسمت نظر آتا تھا ورنہ آج کل کی اولاد کا تو اللہ ہی حافظ ہے...... معدودے چند کو چھوڑ کر!

میں نورین کے پاس سے ہٹ گیا اور سلیم کی طرف آ گیا۔ نورین کے رویے کی گونج میرے دماغ میں موجود تھی۔ احمد علی نے ان دونوں کی گرفتاری کی جو کہانی مجھے سنائی تھی اس کے مطابق تو نورین کو سلیم سے زیادہ پریشان دکھائی دینا چاہئے تھا۔ نورین کا اعتماد اور حوصلگی مجھے الجھا رہی تھی۔ میں اس الجھن سے الجھتے ہوئے سلیم کے پاس پہنچ گیا۔

سلیم کو دیکھ کر مجھے ایک اور حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ نورین کے مقابلے میں مجھے خاصا کم کم نظر آیا۔ کم عمر، کم وزن اور کم رو۔ اس کی عمر تئیس چوبیس سال رہی ہو گی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور واجبی سی صورت شکل کا مالک تھا۔ وزن اس کا پچپن کلوگرام سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر وہ "جوڑا" تھا تو بہت ہی بے میل اور بے ڈھنگا جوڑا تھا۔

سلیم نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا تو میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میں مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہوں۔ تمہارے والد نے مجھے تمہاری رہائی کے لئے مقرر کیا ہے۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔"

رہائی کے لفظ نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ "وکیل صاحب! ایک بار آپ مجھے اس کیس سے نکال دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں، زندگی بھر اس بھینس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔ میں نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔"

نورین کو بھینس وہ اس کی جسامت اور وزن کی مناسبت سے کہہ رہا تھا۔ نورین کے برعکس وہ خاصا ڈرا سہما اور پریشان نظر آیا۔ میں نے اسے کریدا۔

"یہ تم کیا بات کر رہے ہو سلیم۔ جس لڑکی سے تم محبت کرتے ہو، زندگی بھر اس کی صورت نہ دیکھنے کا عہد کر رہے ہو؟"

"وہ اس قابل نہیں کہ اس کا خیال کیا جائے۔" وہ نفرت سے بولا۔ "میں اس کی وجہ سے آج اس مصیبت میں پھنسا ہوں اور وہ مجھے لفٹ ہی نہیں کروا رہی۔"

"لفٹ نہیں کروا رہی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھیں نا وکیل صاحب!" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "ہم دونوں کو ایک جیسے الزام میں پکڑ کر یہاں بند کیا گیا ہے، کل یہ لوگ ہمیں عدالت میں پیش کریں گے۔ اس موقع پر ہمیں اتفاق سے رہنا چاہئے۔ رہنا چاہئے یا نہیں؟"

اس نے مجھے منصف بنانے کی کوشش کی تو میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔ "ظاہر ہے، اتفاق میں برکت ہے۔" پھر استفسار کیا۔ "نورین کیا نااتفاقی کر رہی ہے بیچ اس معاملے کے؟"

"وہ کہتی ہے، تمہارا معاملہ تم جانو۔ میرا معاملہ ڈیڈی سیٹ کر دیں گے۔" سلیم نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "پتا نہیں، وہ بے وقوف اپنے ڈیڈی کو کیا سمجھتی ہے۔"

میں نے کہا۔ ''میں ابھی نورین سے مل کر آرہا ہوں۔ اس نے مجھ سے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کی ہیں لیکن وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بس اور کوئی بات نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا اس کا باپ ملنے کے لئے تھانے آیا تھا؟''

''آیا ہی ہوگا جی، مجھے پتا نہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا نہیں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''سلیم! ایک بات تو بتاؤ'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا، نورین بالکل مختلف خیالات کا اظہار کر رہی ہے۔ کیا تھانے آنے کے بعد تمہاری اس سے ملاقات ہوئی تھی؟'' پھر میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں تو حوالات کے دو الگ کمروں میں رکھا گیا ہے!''

وہ ایک لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''وکیل صاحب! پہلے ہم ایک ہی جگہ پر بند تھے۔ اس وقت تک نورین بڑی نارمل اور مفاہمت کی باتیں کر رہی تھی۔ ہم دونوں ہی پریشان تھے اور اس مصیبت سے نجات کے بارے میں سوچ رہے تھے۔'' وہ ذرا متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا۔

''پھر ایک کانسٹیبل نورین کو اپنے ساتھ لے گیا، بولا انچارج صاحب نے بلایا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس کا یہ روپ میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے رویے پر سخت حیرت ہوئی۔ میں نے جو نا اتفاقی اور لفٹ نہ کرانے کی بات کی ہے نا، وہ اسی وقت ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنے معاملے کی نزاکت اور اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر وہ سمجھنے کے موڈ میں ہی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے اس کی کھوپڑی میں دماغ بدل گیا ہو۔ کچھ دیر کے بعد نورین کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔''

سلیم کا انکشاف سنسنی خیز اور قابلِ غور تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''میری معلومات کے مطابق آپ دونوں کو لگ بھگ دو بجے دوپہر گرفتار کیا گیا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، نورین کو تھانہ انچارج نے کب اپنے پاس بلایا تھا؟''

''میرا خیال ہے، چار بجے کے قریب۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''نورین کو دوسرے کمرے میں کب بھیجا گیا؟''

''کوئی ایک گھنٹے بعد......یعنی پانچ بجے۔''

احمد علی نے مجھے بتایا تھا، وہ شام سات بجے سلیم سے مل کر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا، اس وقت تک ''لیلیٰ مجنوں'' کو الگ کر دیا گیا تھا۔ میں نے رشوت کے حوالے سے اس سے استفسار کیا۔

''یہ ایک لاکھ روپے کی کیا کہانی ہے بھئی؟''

''پولیس والے مجھ سے رشوت طلب کر رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ان کا کہنا ہے، اگر میں

ایک لاکھ روپے کا انتظام کر دوں تو وہ مجھے چھوڑ دیں گے۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''رشوت کی بات انہوں نے کب کی ہے؟''

اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا، شاید وہ میرے سوال کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ میں نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا اور کہا۔ ''کیا انہوں نے تھانے پہنچتے ہی رشوت کا مطالبہ کر دیا تھا یا یہ بات بعد میں کی ہے؟''

''بہت بعد میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پاپا کے آنے کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے۔ پاپا نے انہیں میری بے گناہی کا یقین دلانا چاہا تھا اور نتیجے میں انہوں نے مجھے چھوڑنے کے عوض ایک لاکھ روپے مانگ لئے۔''

میں نے کہا۔ ''احمد علی لگ بھگ سات بجے تم سے ملنے آیا تھا۔ اس کا مطلب ہے، اس وقت تک انہیں رشوت کا خیال نہیں آیا تھا۔''

''یہ ساری گڑبڑ نورین کے تھانہ انچارج کے پاس جانے کے بعد ہوئی ہے۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے نورین اس بارے میں بہت کچھ جانتی ہوگی۔''

''مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''اسی لئے اس نے مجھ سے کھل کر بات نہیں کی۔ وہ خاصی پُر اعتماد اور پُر عزم نظر آ رہی ہے۔''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، اس لڑکی کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، وہ اتنی جلدی بدل جائے گی۔''

''ہو سکتا ہے، پولیس والوں نے نورین کے ڈیڈی سے بھی بھاری رشوت طلب کی ہو۔'' میں نے قیاس آرائی کی۔ ''اور عبدالکریم نے ان کا مطالبہ پورا کرنے کی حامی بھر دی ہو۔''

وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''ایسا ناممکن تو نہیں۔ عبدالکریم اپنی بیٹی کے چھٹکارے کے لئے ایک لاکھ خرچ کر سکتا ہے۔ سونے میں ملاوٹ کر کے اس نے کروڑوں کمائے ہیں۔ مصیبت پڑنے پر پیسہ کام نہ آئے تو پھر کس کام کا۔ مگر ایک بات مجھے الجھا رہی ہے۔''

وہ یہاں تک پہنچ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے لئے کون سی بات الجھن کا باعث بن رہی ہے؟''

''اگر عبدالکریم پولیس والوں کا مطالبہ تسلیم کرنے پر تیار ہو گیا ہے تو نورین حوالات میں کیوں بند ہے؟'' اس نے ایک نکتہ اٹھایا۔

اس کے نکتے میں اچھی خاصی جان تھی۔ تاہم میں نے کہا۔ ''ممکن ہے، عبدالکریم رقم کا بندوبست کرنے گیا ہو۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ میں تو نہیں ہوتی۔ بینک تو کل صبح ہی کھلیں گے۔ وہ ادھر اُدھر سے رقم اکٹھی کر رہا ہوگا۔''

''پتا نہیں، وہ کیا کر رہا ہوگا!'' سلیم نے مایوسی سے کہا اور حوالات کے فرش کو گھورنے لگا۔

ایک لاکھ روپے بطور رشوت اور وہ بھی معمولی نوعیت کے الزام میں! یہ مسٹری میرے ذہن کے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ تاہم میں تھانے آنے سے پہلے کی بہ نسبت اب اچھا خاصا معلومات یافتہ ہو چکا تھا۔ نورین کا تھانہ انچارج کے پاس جانا، اس کا علیحدہ حوالات میں بند ہونا، اس کا اعتماد اور دعویٰ کہ اس کا ڈیڈی اس کی رہائی کا بندوبست کر چکا ہے اور ان سارے معاملات کے بعد سلیم سے پولیس کا ایک لاکھ روپے مانگنا خالی از علت نہیں تھا۔ یہ مجھے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس راز پر سے صرف دو افراد ہی پردہ اٹھا سکتے تھے اور مجھے امید نہیں تھی، ان میں سے کوئی بھی میرے سامنے زبان کھولے۔ اول تھانہ انچارج اور دوم نورین کا باپ عبدالکریم!

سلیم کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا، وہ بڑی پریشانی میں تھا۔ میں نے اس کا کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مزید پوچھ گچھ سے قبل میں نے اس سے وکالت نامے پر دستخط کروا لئے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا، ملاقات کی آسانی فراہم کرنے والا وہ پولیس اہلکار کب آ دھمکتا! ضروری کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے سلیم سے اس کی کہانی سنی۔ سلیم اور نورین کے باہمی روابط کی کہانی۔ آپ اسے محبت کی کہانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں اس داستان میں سے غیر ضروری باتوں اور واقعات کو حذف کر کے مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ ان دونوں کے پس منظر سے بخوبی آگاہ ہو جائیں۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں، اس میں سے بہت سے اہم پوائنٹ مجھے بعد میں پتا چلے تھے لیکن میں نے واقعات کی ترتیب اور تسلسل کی خاطر انہیں یکجا کر دیا ہے۔

✿✿✿

کسی زمانے میں، احمد علی اور عبدالکریم میں دوستی ہوا کرتی تھی۔ وہ کراچی کے ایک پرانے علاقے میٹھادر میں رہتے تھے اور پیشے کے اعتبار سے سونے کی میکنگ سے وابستہ تھے۔ میکنگ کا کارخانہ کھارادر میں واقع تھا، وہی کارخانہ جس کا بلاشرکت غیرے اب عبدالکریم مالک تھا۔

سونے کے کاروبار کے سلسلے میں ان دونوں کا دعویٰ خاصا مختلف تھا۔ عبدالکریم کا کہنا تھا، احمد علی کسی بھی حوالے سے اس بزنس میں حصے دار نہیں تھا، ہاں وہ اس کا ایک غریب دوست ضرور تھا جس کی مالی مدد کی خاطر اس نے اپنے ساتھ لگا لیا۔ البتہ اس کے ساتھ رویہ دوستانہ ہی رہا جس کا فائدہ اٹھا کر احمد علی نے دوسروں پر یہ ثابت کرنا شروع کر دیا کہ وہ عبدالکریم کا بزنس پارٹنر ہے۔ حالانکہ عبدالکریم کے نزدیک اس کی حیثیت حقیقی معنوں میں ایک ملازم...... اچھے ملازم کی سی تھی جس پر مکمل بھروسا اور اندھا اعتماد کرتا تھا لیکن جب احمد علی نے اس کے اعتبار کو بٹا لگانا شروع کیا اور سرزنش کے باوجود بھی وہ سدھرنے کا نام لینے کو تیار نہ ہوا تو عبدالکریم نے اسے اپنی دوستی اور کاروبار سے الگ کر دیا۔

اس علیحدگی پر احمد علی نے بہت واویلا مچایا۔ اس کا دعویٰ تھا، سونے کے بزنس میں وہ عبدالکریم

سے برابر کا حصے دار تھا۔ دوستی کی وجہ سے اس نے کسی لکھت پڑھت کی ضرورت محسوس نہ کی اور کام کو دیانت داری سے چلانے کی کوشش کی لیکن جب کاروبار چمک اٹھا اور عبدالکریم نے محسوس کیا کہ اب احمد علی کی زیادہ ضرورت نہیں رہی تو اس نے دوستی کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ احمد علی کے مطابق گولڈ میکنگ کے اس بزنس کے پھلنے پھولنے میں خالصتاً اس کی حکمت عملی اور محنت کا ہاتھ تھا لیکن عبدالکریم کی نیت میں کھوٹ آ گئی اور اس نے احمد علی کو قانونی مار ماری۔ کاش! اس نے بزنس پارٹنرشپ کے سلسلے میں کوئی دستاویز تیار کروا لی ہوتی تو وہ برا دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ عبدالکریم نے گراؤنڈ ہموار کرنے کے لئے بہت پہلے اس پر بدعنوانی کا الزام لگایا پھر اسی بات کو ایشو بنا کر اچھالا اور احمد علی کو خود سے، اپنے کاروبار سے الگ کر دیا۔

اس موقع پر دونوں ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے اور اس الزام کی زد میں ان کی دوستی آ رہی تھی۔ یہ دوستی بڑی عجیب وغریب شے...... محبت سے بھی زیادہ رُلانے والی چیز! محبت تو بغیر سوچے سمجھے ہو جاتی ہے لیکن دوستی ہمیشہ دیکھ بھال کر کی جاتی ہے لہٰذا اس میں ناکامیابی روح کا آزار ثابت ہوتی ہے۔ اس میں رکیک اور گری ہوئی حرکت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور بعض اوقات برسوں کی دوستی کسی ایک معمولی سی بات یا واقعے کے طفیل مٹی میں مل کر رہ جاتی ہے۔ زبان کا گھاؤ اس تعلق کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ایک ریچھ اور انسان کی کہانی بہت مشہور ہے۔ نصیحت آموز اور خاصی دلچسپ ہے۔ اس لئے پیش خدمت ہے۔

ایک شخص روزانہ جنگل میں لکڑی کی تلاش میں جاتا تھا۔ یہی اس کا روزگار تھا۔ ایک دن اس نے ایک ریچھ کو ایک درخت کے تنے میں الجھے دیکھا۔ وہ ریچھ کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا، اس چرے ہوئے تنے میں ریچھ کا ہاتھ پھنسا ہوا ہے۔ کسی شکاری نے شاید شکار کی غرض سے وہ تنا خصوصاً چیر رکھا تھا۔ اس درخت پر شہد کا ذخیرہ تھا اور ریچھ اس نعمتِ خداوندی کو بڑی رغبت سے کھاتا ہے۔ اس کی بے پناہ طاقت اور موسموں کی سختی کے خلاف برداشت کا راز بھی یہی شہد خورانی ہے۔ خالص اور اصل شے ہی کو دوام ہے، چنانچہ اصلی شہد کا کوئی نعم البدل نہیں!

الغرض، اس شخص نے ریچھ کو مصیبت میں دیکھا تو اس کے دل میں اس کی مدد کا خیال آیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے درخت کا تنا کاٹا اور ریچھ کو اس مصیبت سے نجات دلا دی۔ اس کا ہاتھ آزاد ہوا تو اس نے تشکر آمیز نگاہ سے اپنے دستگیر کو دیکھا اور جنگل کے ایک گوشے میں غائب ہو گیا۔

اگلے روز سے ایک عجیب معمول ہو گیا۔ وہ ریچھ شہد سے بھرا ہوا ایک برتن اپنے نجات دہندہ کے لئے لانے لگا۔ اس کے بدلے وہ شخص گھر سے ریچھ کے لئے روٹی پکوا لاتا۔ چند ہی روز میں ان دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔

اس شخص کی بیوی کے دل میں کھد بد جاری تھی کہ آخر اس کے شوہر کا ایسا کون سا دوست ہے جو روزانہ شہد کا برتن بھر لاتا ہے اور یہ بندۂ خدا اس کے لئے روٹیاں پکوا کر لے جاتا ہے۔ اس نے شوہر سے ایک دو مرتبہ اس سلسلے میں استفسار کیا تو اس نے "ایک دوست" کہہ کر ٹال دیا۔ ریچھ کا کہیں تذکرہ نہ کیا۔ اس جواب سے بیوی کی تسلی نہ ہوئی اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ایک دن شوہر کے تعاقب کی ٹھانی۔ جب اس کا شوہر لکڑیاں کاٹنے جنگل کی طرف روانہ ہوا تو وہ بھی نظر بچا کر اس کا پیچھا کرتے ہوئے جنگل میں پہنچ گئی۔ پھر اس کی آنکھوں نے جو نظارہ دیکھا تو چودہ طبق یک لخت گل ہو گئے۔ اس کا شوہر ایک ریچھ کے ساتھ بیٹھا خوش اداؤں میں مصروف تھا اور وہ ریچھ بڑے مزے سے روٹیوں پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

بیوی کو شوہر کی اس حرکت پر شدید غصہ آیا۔ اس نے یہ فرض کر لیا کہ شوہر نے اسے بے وقوف بنانے کے لئے شہد کی کہانی تراشی ہے ورنہ وہ اس منحوس ریچھ کی شکم پروری کے لئے دھوکے سے اس سے روٹیاں بنواتا ہے اور شہد وہ بازار سے خرید کر لے جاتا ہوگا۔

وہ طیش کے عالم میں درخت کی اوٹ سے نکل آئی اور شوہر کے ساتھ ساتھ اس ریچھ کو بھی بے نقط سنا ڈالیں۔ شوہر منع ہی کرتا رہ گیا مگر بیوی کی گز بھر زبان نے اس روز اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ نتیجے میں شوہر نے اسے دو چار کرارے ہاتھ دکھائے اور وہ ان دونوں کو کوستے ہوئے واپس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد اس شخص نے اپنے دوست سے، بیوی کے رویے پر بہت معذرت کی لیکن ریچھ کی سنجیدگی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی اور دوست کی صفائی کے اختتام پر اس نے کہا۔

"میں نے تمہارے گھر کا بہت نمک کھایا ہے اور تمہاری بیوی کو میری خاطر بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں۔ میری تم سے ایک درخواست ہے، تمہیں میرا یہ کام ہر صورت میں کرنا ہوگا!"

اس شخص نے سوالیہ نظر سے ریچھ کو دیکھا۔ انداز میں ندامت بھری ہوئی تھی۔ ریچھ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ہاتھ میں تیز دھار والی کلہاڑی ہے۔ تم نے ایک مرتبہ اس کی خطرناک ضربوں سے میرے پھنسے ہوئے ہاتھ کو نجات دلائی تھی۔ میں تم سے منت کرتا ہوں کہ میرے کندھے پر اسی کلہاڑی سے ایک وار کرو۔

اس شخص نے بے یقینی سے ریچھ کو دیکھا۔ ریچھ کے مطالبے میں قطعیت شامل تھی۔ پھر جب خوفناک غراہٹ بھی شامل ہونے لگی تو اس شخص کو ریچھ کی بات ماننا پڑی۔ اس واقعے کے بعد ریچھ اس سے جدا ہو گیا۔ اس شخص نے گھر آ کر اپنی بیوی کو بہت برا بھلا کہا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

چند روز کے بعد ایک دن وہ ریچھ اچانک گھنے جنگل سے نکل کر سامنے آ گیا اور کندھے کا وہ حصہ اسے دکھایا جہاں اس نے کلہاڑی سے ایک خطرناک فرمائشی وار کیا تھا۔ کندھے کا زخم مندمل

ہو چکا تھا۔ ریچھ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"تمہاری کلہاڑی سے لگا ہوا زخم تو بھر گیا لیکن تمہاری بیوی کی زبان نے میرے دل پر جو گھاؤ ڈالے ہیں وہ کبھی نہیں بھر پائیں گے۔ لہٰذا ہمیشہ کے لئے خدا حافظ! تم دوستی کے قابل نہیں ہو!

کہانی تو محض کہانی ہوتی ہے۔ یہ سوچنے کی ضرورت نہیں، ریچھ اور انسان میں کس طرح مکالمہ بازی ہوئی ہو گی۔ نصیحت اور سبق اس کہانی سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ دوستی سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔ کیونکہ دوستی دو+ستی کا نام ہے! اس کے لئے سینے میں چیتے کا دل اور ہاتھ میں حاتم کی سخاوت ہونا چاہئے!

عبدالکریم اور احمد علی نے دوستی کے خاتمے پر اپنی اپنی بساط کے مطابق موشگافیاں کیں، البتہ ہر صورت احمد علی نقصان میں رہا۔ اس کا روزگار چھوٹ گیا۔ کچھ دن بعد وہ میٹھادر کو خیر باد کہہ کر گارڈن ویسٹ کے علاقے میں آ بسا۔ سال بھر بعد عبدالکریم نے بھی میٹھادر کا علاقہ چھوڑ دیا اور گارڈن ایسٹ کے ایک بنگلے میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ پہلے بھی صاحب حیثیت تھا، اب اس کی حیثیت کچھ اور بڑھ گئی۔

گارڈن کا ایسٹ اور ویسٹ دنیا کے ایسٹ اور ویسٹ کے متضاد ہے۔ احمد علی نے اپنی بساط کے لحاظ سے سولجر بازار میں کاسمیٹکس کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لی جواب پھول پھل کر ایک بڑے اسٹور کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ دونوں دوست بظاہر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے لیکن ان کی اولادیں ایک نئی کہانی رقم کرنے پر تل گئیں۔ گارڈن میں شفٹ ہونے کے بعد نورین اور سلیم میں ایک تعلق خاص پیدا ہو گیا۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا، ان کے باپ ایک دوسرے کے لئے اپنے دل میں گہری رنجش رکھتے ہیں۔

نورین نے انگلش میں ماسٹرز کر رکھا تھا اور ایک مانٹیسوری اسکول میں پڑھاتی تھی۔ ٹیچنگ اس کا شوق اور ضد تھی ورنہ اسے کسی شے کی کمی نہیں تھی۔ وہ ایک نہایت ہی مہنگے ٹریننگ سنٹر سے انٹرنیشنل لیول کا مانٹیسوری ٹیچنگ کورس بھی کر رہی تھی۔ مستقبل میں مغرب میں جا کر کسی اچھے اسکول میں پڑھانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

عبدالکریم بہت ہی پریکٹیکل آدمی تھا۔ وہ اپنی اولاد کو قدموں پر کھڑا ہونے کی تلقین کرتا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی بیٹے کو اس نے اپنے ساتھ لگا لیا۔ نورین بھی مثبت اور تعمیری انداز میں اپنا شوق پورا کر رہی تھی اس لئے وہ اس کی تعلیم کا خرچا اٹھا رہا تھا۔

احمد علی کی امیدوں کا واحد سہارا اس کا اکلوتا بیٹا سلیم تھا۔ وہ گریجویشن سے فارغ ہونے کے بعد باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ان کا کاسمیٹکس سٹور صبح گیارہ سے رات بارہ بجے تک کھلا رہتا۔ اسٹور سلیم ہی کھولتا تھا۔ ایک بجے دوپہر احمد علی اسٹور پر آ جاتا۔ ایک سے تین تک سلیم کی چھٹی ہوتی پھر تین سے رات بارہ بجے تک وہ دکان میں جتا رہتا۔ احمد علی دوپہر ایک بجے سے شام سات بجے

تک اسٹور پر رہتا۔ اس کے علاوہ ایک کل وقتی ملازم بھی وہاں کام کرتا تھا۔

سلیم کے پاس دوپہر میں صرف دو گھنٹے تھے۔ ایک سے تین بجے تک۔ وہ نورین سے اسی دوران میں ملاقات کرتا۔ نورین کا اسکول بارہ بجے آف ہو جاتا۔ نو سے بارہ تک وہ ننھے منے بچوں کو زندگی کے ابتدائی ڈھنگ سے روشناس کراتی۔ گھر پہنچ کر وہ تھوڑا آرام کرتی پھر ٹریننگ سینٹر کے لئے روانہ ہو جاتی۔ مذکورہ سینٹر میں دو بجے سے شام پانچ بجے تک کلاس ہوتی۔ جب ان کی ملاقات طے ہوتی تو نورین کو اس روز کلاس چھوڑنا پڑتی۔ سلیم کے پاس ایک سے تین تک کا وقت فری ہوتا، گویا نقصان نورین ہی کا ہوتا تھا۔

وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق مختلف مقامات پر ملتے۔ جب کچھ پہلے سے طے نہ ہوتا تو پھر کسی پارک میں جا بیٹھتے۔ جیسا کہ وقوعہ کے روز ہوا۔

میں پوری توجہ سے سلیم کی داستان سن چکا تو ایک سوال کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''سلیم! ایک بات تو بتاؤ جب تم لوگوں میں اتنا زیادہ ربط ضبط تھا، انڈر اسٹینڈنگ تھی تو پھر اچانک نورین کو کیا ہو گیا؟ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بدل کیسے گئی؟ یہ کیسی محبت تھی؟''

''محبت!'' وہ یک دم بے حد افسردہ نظر آنے لگا۔ ''پتا نہیں، نورین کو مجھ سے محبت تھی بھی کہ نہیں!''

''عجیب آدمی ہو تم بھی، تمہیں اتنا بھی اندازہ نہیں؟''

''مجھے واقعی کچھ اندازہ نہیں وکیل صاحب!''

میں تھوڑی دیر تک بے یقینی سے اسے تکتا رہا پھر پوچھا۔ ''تم لوگ کتنے عرصے سے مل رہے ہو؟''

''کم و بیش ایک سال ہو گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''تم دونوں کے والدین میں، ماضی میں ایک بہت بڑا اختلاف ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود بھی تم نورین کی طرف بڑھے اور......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں کیا بات ہے وکیل صاحب! میں نورین کے لئے بے اختیار ہو جاتا ہوں۔ لگتا ہے، جیسے اس نے مجھ پر کوئی جادو وغیرہ کر دیا ہو۔ یہ سچ ہے، اس نے مجھے کبھی لفٹ نہیں کرائی تھی۔ میں ہی ہمیشہ اس کی طرف لپکا۔ اسے دوسروں ہی سے فرصت نہیں تھی۔ شاید وہ مجھے خود سے کم تر سمجھتی تھی لیکن سال سوا سال پہلے اچانک نورین میں ایک مثبت تبدیلی آئی اور وہ میری جانب توجہ دینے لگی۔''

اس نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔ میں احمد علی کے کہے ہوئے اس جملے پر غور کرنے لگا کہ نورین ہی اس کے بیٹے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے ورنہ سلیم تو اس لائن کا نہیں۔

وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''میں تو یہی سمجھ رہا تھا، خدا نے میری سن لی جو نورین نے میری طرف رخ

کیا لیکن اب پھر معاملہ گڑبڑ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اس کا حالیہ رویہ خاصا تکلیف دہ ہے میرے لئے۔''

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان باتوں سے تو لگتا ہے، تمہیں نورین سے محبت ہے اور وہ محض تم سے تفریح لے رہی ہے۔ اگر وہ بھی سنجیدہ ہوتی تو پھر اس نوعیت کے ردِ عمل کا مظاہرہ نہ کرتی۔ اس موقع پر تو تم دونوں کو باہمی اتفاق سے کام لے کر پولیس والوں کو ناکامیاب بنانا چاہئے۔''

''ہو سکتا ہے، یہ نورین کا وقتی ردِ عمل ہو۔'' وہ اپنے دل میں نورین کے لئے خاصی گنجائش رکھتا تھا۔ ''وہ اپنے باپ کے بھڑکانے میں آ گئی ہو۔ بعد میں جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو تو وہ مجھ سے آ ملے۔''

یہ ایک طرح سے سلیم کی خوش فہمی بھی ہو سکتی تھی لیکن میں اس کی توقعات کو سرے سے رد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ایسا ممکن بھی تھا۔ تاہم جب تک مجھے دوسری طرف کی کہانی معلوم نہ ہو جاتی، میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

میں نے سلیم کو تسلی دی کہ اس کی ضمانت کروانے کی پوری کوشش کروں گا۔ پھر مزید چند باتوں کے بعد میں نے اسے کچھ ہدایات دیں اور اس کے پاس واپس آ گیا۔ اس وقت تک تھانہ انچارج واپس آ چکا تھا۔ میں نے سوچا، اس سے بھی تھوڑی ''علیک سلیک'' ہو جائے۔ میں اس کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ دیکھتے ہی با آواز بلند بولا۔ ''آئیں بیگ صاحب! آج کیسے راستہ بھول گئے خیریت تو ہے نا؟''

اس کی باتوں سے اندازہ ہوا، وہ میری وہاں موجودگی سے واقف نہیں تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا میں ابھی ابھی باہر سے آیا ہوں۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کو سلام کرتا چلوں۔''

''میں نہیں مان سکتا، آپ نے صرف سلام کرنے کے لئے یہ زحمت کی ہو۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ تو بہت مصروف وکیل ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''خیر، بتائیں ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟''

''نہ ٹھنڈا اور نہ ہی گرم۔ شکریہ۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ویسے آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں بہت مصروف وکیل ہوں اور آپ کے پاس کسی خاص مقصد ہی سے آیا تھا۔''

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور محتاط نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میرا موکل آپ کے تھانے کی حوالات میں بند ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا اس سے ملنے آیا تھا۔''

"آپ اپنے کس موکل کی بات کر رہے ہو؟" وہ تیز نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے کہا۔ "میرے موکل کا نام سلیم ہے۔"

"اچھا اچھا، آپ اس نوجوان کی بات کر رہے ہیں جسے ہم نے ایک سنگین جرم میں بند کر رکھا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں گردن کو ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہ بابا نہ، آپ اس سے نہیں مل سکتے۔ کل ہم اسے عدالت میں پیش کر دیں گے۔ یہ شوق آپ وہاں آ کر پورا کر سکتے ہیں۔ وہ جگہ آپ کی دیکھی بھالی ہے!"

اس نے بات کے اختتام پر چوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تھانے دار صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک کہا، وہ جگہ میرے لئے نئی نہیں لیکن آپ میرے موکل پر جو سنگین الزام عائد کر رہے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور...... جہاں تک سوال ہے اس سے ملنے یا نہ ملنے کا تو یہ کام میں کر چکا ہوں۔ ابھی میں حوالات کی طرف سے آیا ہوں۔ سلیم سے میں نے پیشہ ورانہ ملاقات کر لی ہے البتہ نورین آپ کی پٹی پر بڑی شدت سے کاربند ہے۔"

اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات نمودار ہوئے اور منہ برا سا بن گیا۔ اسے یہ بات قطعاً اچھی نہیں لگی تھی کہ میں سلیم سے مل چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے جانے کے بعد اپنے عملے پر خوب گرجے برسے گا اور یہ سراغ لگانے کی کوشش کرے گا کہ یہ "ملاقات" کس نے کروائی!

اس نے قدرے برہمی سے کہا۔ "آپ کس پٹی کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہی جو آپ نے نورین کو پڑھائی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے کیا ضرورت تھی ایسی کسی کوشش کی!"

میں نے کہا۔ "آپ نے نورین کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں بلایا تھا، اس کے بعد ہی اس نے اپنا انداز بدل لیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے باپ سے کوئی سیٹنگ کر لی ہے۔ کیا عبدالکریم آپ سے ملنے آیا تھا؟"

"اول تو یہ کہ آپ کی "سیٹنگ" والی بات میں کوئی حقیقت نہیں۔" وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "دوم میں آپ کو یہ بتانے کا پابند نہیں کہ مجھ سے ملنے کون آیا تھا اور کون نہیں آیا تھا۔"

"آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔" میں نے اُسی کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو آپ کے رشوتی مطالبے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔"

"رشوتی مطالبہ!" وہ ایک دم اچھل پڑا۔

میں نے کہا۔ "کیا میں نے کوئی ان ہونی بات کر دی؟"

وہ غصیلے انداز میں بولا۔ "آپ مجھ پر رشوت طلب کرنے کا الزام لگا رہے ہیں؟"

"یہ خوب ہے جناب! آپ نے اپنے لئے تو لفظ "الزام" استعمال کیا اور میرے موکل کے لئے "جرم" کا استعمال ہو رہا ہے۔ بہر حال میرا مطلب رشوت ہی تھا۔ کیا آپ نے سلیم کے باپ احمد علی سے ایک لاکھ روپے طلب نہیں کئے، اس کی رہائی کے بدلے؟"

وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، عبدالکریم سے آپ کی کوئی ڈیل ہو گئی ہے؟"

"پتا نہیں، آپ کیسی بے سروپا باتیں کر رہے ہیں۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! جہنم میں ڈالیں رشوت کو۔ کیونکہ راشی اور مرتشی دونوں کو وہیں جانا ہے۔ آپ یہ بتائیں، آپ نے میرے موکل پر دفعہ کون سی عائد کی ہے؟"

"اس بات کا جواب آپ کو عدالت میں مل جائے گا۔" وہ برہمی سے بولا۔ "اور اب آپ جائیں یہاں سے۔ ہمیں اور بھی بہت سارے کام ہوتے ہیں۔"

پھر وہ بے انتہا مصروف نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں سمجھ گیا اب وہ سیدھے منہ یا کام کی کوئی بات نہیں کرے گا لہٰذا میں اس کے کمرے سے نکل آیا۔ وہاں مزید رُک کر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

✿✿✿

اگلے روز جب میں عدالت پہنچا تو سلیم اور نورین پولیس کی نگرانی میں وہاں موجود تھے۔ مجھے ایک بات پر حیرت تھی کہ عبدالکریم کی پولیس کے ساتھ کوئی ڈیل ہو گئی تھی تو پھر نورین کو عدالت میں کیوں گھسیٹا گیا۔ پولیس چاہتی تو مکھن میں سے بال کی طرح اس کیس میں سے اسے نکال سکتی تھی۔

پولیس کی چالیں بعض اوقات بہت پیچیدہ اور مبہم ہوتی ہیں۔ ان کے عقب میں جھانکنے کے لئے خاصی ذہنی مشقت سے گزرنا پڑتا ہے۔ تفتیشی افسر نے عبوری چالان پیش کر کے ایک ہفتے کا ریمانڈ حاصل کرنے کی درخواست کی تو مجھے اور زیادہ حیرت ہوئی۔ ایک ایسا معاملہ جیسے بڑی آسانی سے رفع دفع کیا جا سکتا تھا، اسے خواہ مخواہ اچھالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

مجسٹریٹ نے عبوری چالان کا بہ غور جائزہ لیا اور گہری نظر سے میرے موکل کو گھورنے لگا۔ اس کے بعد اس نے سلیم پر عائد الزام کی وضاحت کی۔ میرے ساتھ ساتھ ایک مرتبہ پھر سلیم کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ پولیس نے نورین کی حمایت اور سلیم کی مخالفت میں ایک عجیب و غریب چالان پیش کیا تھا۔

میں نے سلیم کی درخواست ضمانت دائر کی اور مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میرے موکل کے خلاف پیش کیا جانے والا چالان ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے جب کہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔"

پولیس نے میرے موکل پر الزام لگایا تھا کہ اس نے دھوکا دے کر نورین کو جائے وقوعہ پر بلایا پھر اس سے دست درازی کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں قریب ہی موجود کسی پولیس اہل کار کی ان پر نظر پڑ گئی لہٰذا ان دونوں کو گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیا گیا۔ پولیس نے نورین کو سراسر بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

وکیل استغاثہ نے طنزیہ نظر سے مجھے دیکھا اور اونچی آواز میں بولا۔ ”اگر حقیقت کچھ اور ہے تو اسے عدالت میں پیش کیا جائے۔“

میں نے مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر! میرا موکل اور نورین ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں کہ وہ باہر ملے ہوں۔ میں آپ کو......“

”آبجیکشن یور آنر!“ وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”نورین صاحبہ ملزم کے ساتھ کسی قسم کا کوئی سنجیدہ تعلق نہیں رکھتیں۔ وکیل صفائی اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں کر کے اس کی عزت کو متاثر کر رہے ہیں۔ باہر ملنے والی بات میں بھی کوئی حقیقت نہیں۔“

مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں خفیف سا مسکرایا اور وکیل استغاثہ کی طرف معنی خیز انداز میں تکنے کے بعد منصف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اپنی بات مکمل کر لوں۔ ممکن ہے وکیل استغاثہ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے۔“

”آپ اپنی بات مکمل کر لیں بیگ صاحب!“ مجسٹریٹ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہنے لگا۔ ”جنابِ عالی! معزز عدالت کے سامنے حقائق کو بے نقاب کرنے یا اجاگر کرنے سے کسی کی عزت متاثر ہو رہی ہو تو اس بات کی پروا نہیں کی جاتی۔ جب تک حقیقت کھل کر منظر پر نہیں آئے گی، انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔“ میں نے ذرا توقف کر کے حاضرین عدالت کو دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”یور آنر! میں نے تھوڑی دیر پہلے عرض کیا ہے کہ نورین اور میرے موکل کے درمیان ایک سنجیدہ تعلق موجود تھا۔ اس تعلق کو پسندیدگی یا محبت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ نورین اپنی مرضی اور منشا سے ملزم کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچی تھی۔ اس میں میرے موکل کے کسی فریب یا دھوکے کو دخل نہیں۔ پولیس کا ریکارڈ اس سلسلے میں ڈھکا چھپا نہیں کہ یہ پیدا کے چکر میں عوام کو پریشان کرتے ہیں۔ تفریحی مقامات پر خصوصاً پارکس اور ساحلِ سمندر پر ان کی چاندی ہوتی ہے۔ جہاں کہیں کوئی جوڑا دیکھا، یہ گھیرنے پہنچ جاتے ہیں۔ بعض اوقات نو بیاہتا جوڑوں کو بھی کچھ دے دلا کر اپنی جان چھڑانا پڑتی ہے۔ اگر کوئی ان سے کہے کہ ہم میاں بیوی ہیں تو یہ لوگ فوراً نکاح نامہ طلب کرتے ہیں۔ اب بتائیے بھلا نکاح نامہ جیب میں رکھ کر کون گھومتا ہے!“

”آپ کا مطلب ہے، چوری چھپے ملنے والے جوڑوں کو کھلی چھوٹ دے دینا چاہیے؟“ وکیل استغاثہ نے نکیلے لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”میرے فاضل دوست! ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آپ نے پھر مداخلت کر دی۔ بہرحال میں پہلے آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں پھر آگے بڑھوں گا تاکہ آپ اطمینان سے میری بات سن سکیں۔“ پھر ایک لمحے کا وقفہ کر کے میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”ہم ایک آزاد ملک کے باشندے ہیں۔ عاقل اور بالغ لوگ پختہ سمجھ اور شعور رکھتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکی اور لڑکا یا مرد اور عورت کسی مقام پر ایک ساتھ پائے جاتے ہیں اور وہ کسی قسم کے اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی جرم میں ملوث نظر نہ آئیں تو پولیس والوں کو ان کے ٹینڈر سے دست بردار رہنا چاہیے۔ وہ لوگ اپنا اچھا برا خوب سمجھتے ہیں یا پھر ان کے ورثا کو ان کے بارے میں کسی قسم کی تشویش ہونا چاہیے۔ پولیس کا فرض قانون کی بالادستی قائم رکھنا ہے۔ اگر کوئی شہری قانون شکنی کا مرتکب نہیں ہوتا تو پولیس کو یہ حق نہیں پہنچتا وہ لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑ جائے۔“

وکیل استغاثہ نے گھور کر مجھے دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”گویا آپ نامحرموں کے آزادانہ ملنے جلنے کی حمایت کر رہے ہیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”کان ادھر سے پکڑیں یا اُدھر سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے درحقیقت نامحرم افراد کے ملنے کی مخالفت نہیں کی۔ آپ اسے ان کے ملنے کی حمایت بھی کہہ سکتے ہیں۔“

وہ جوش میں آ گیا۔ ”آپ کو معلوم ہے ہم مسلمان ہیں اور پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ اسلام نے نامحرم کے تنہائی میں ملنے پر قدغن لگائی ہے۔ کیونکہ ان لمحات میں ان کے بیچ شیطان موجود ہوتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ معزز عدالت کو بتائیں گے، آپ تعزیراتِ پاکستان کی کس دفعہ کے تحت نامحرموں کے آزادانہ میل جول کی حمایت کر رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”قانون کی ضخیم کتابوں میں ایسی بھی کوئی دفعہ موجود نہیں جو اس نوعیت کے میل جول کی مخالفت یا ممانعت کرتی ہو۔“

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ”لیکن اسلام میں......“

میں نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ”میرے فاضل دوست! کیا آپ مسلمان ہیں؟“

”الحمدللہ!“ اس نے باآواز بلند کہا۔

میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”پھر تو آپ کو کسی نامحرم سے نہیں ملنا چاہیے۔ جبکہ میں جانتا ہوں، آپ نے ایک خوب رو سیکریٹری رکھی ہوئی ہے۔ گاہے بہ گاہے ضروری کام کے لئے آپ اسے چیمبر میں بھی بلاتے ہیں...... اس کے علاوہ آپ کے کلائنٹس میں خواتین...... نامحرم خواتین کی بھی

اچھی خاصی تعداد ہے جو تنہائی میں آپ سے اپنے سیکرٹ ڈسکس کرتی ہیں۔ آپ کس قسم کے مسلمان ہیں جو اپنی ہی بیان کردہ تعریف پر پورے نہیں اترتے؟“

میری بات ختم ہوئی تو عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگوں کی اکثریت مضحکہ خیز نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی خفت دور کرنے کی خاطر جلدی سے بولا۔

”یہ تو مجبوری ہوئی نا...... پیشہ ورانہ مجبوری۔ ایسے تو بیش تر دفتروں میں مرد و زن شانے سے شانہ ملا کر کام کرتے ہیں۔“

میں نے اس کی کھسیاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی تو اتنی دیر سے آپ کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، میں جانتا ہوں میرا موکل اور نورین ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہیں۔ اگر وہ کسی پبلک پلیس پر ایک ساتھ نظر آتے ہیں تو ان کی مجبوری کو سمجھنا چاہئے۔ بلاوجہ ان پر فحش حرکات کا الزام عائد کر کے انہیں حوالات میں بند نہیں کر دینا چاہئے۔“

”آپ شاید ایک بات بھول رہے ہیں میرے فاضل دوست!“ وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”نورین صاحبہ اپنی مرضی سے وہاں نہیں گئی تھی بلکہ ملزم نے دھوکے میں رکھ کر اسے بلایا تھا۔ بعد میں ملزم نے جب اس سے دست درازی کی کوشش کی تو مجبوراً پولیس کو مداخلت کرنا پڑی۔“

مجسٹریٹ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے دریافت کیا۔ ”بیگ صاحب! یہ کیا قصہ ہے۔ آپ کا موقف ہے، ملزم اور نورین ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور معمول کی ایک ملاقات کے تحت وہ جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ جبکہ استغاثہ کا دعویٰ ہے ملزم نے دھوکے سے نورین کو وہاں بلایا اور ازاں بعد اس سے بدتمیزی کی کوشش کی؟“

میں نے باآواز کہا۔ ”جناب عالی! میں اپنے موقف پر قائم ہوں، یہ وضاحت تو وکیل استغاثہ کریں گے، میرے موکل نے کس فریب کے تحت نورین صاحبہ کو جائے وقوعہ پر بلایا تھا...... اور جہاں تک بدتمیزی یا دست درازی کا تعلق ہے میرے خیال میں کسی پبلک پلیس پر اس کا جواز نہیں بنتا۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اکثر باہر ملتے ہیں۔ پولیس نے ابتدائی طور پر ان دونوں پر فحش اور نازیبا حرکات کا الزام لگایا۔ پھر یہ الزام میرے موکل کی دست درازی تک محدود ہو کر رہ گیا۔“

مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا، وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب عالی! ملزم نے نورین صاحبہ سے رابطہ کر کے دھمکی دی تھی کہ اس کے پاس کچھ ایسے خطوط ہیں اگر وہ منظر عام پر آ گئے تو اس کے کردار کو ٹھیس پہنچے گی لہٰذا وہ جائے وقوعہ پر جا کر اس سے وہ خط حاصل کر لے۔ جب نورین وہاں پہنچی تو ملزم نے خطوط اس کے حوالے کرنے کی بجائے بدتمیزی شروع کر دی اور الٹی سیدھی دھمکیاں دینے لگا۔“

وکیل استغاثہ نے ایک لوز بال میری طرف پھینکی تھی لہٰذا ایک جان دار شاٹ لگانا ضروری ہو گیا۔ میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ذرا ان خطوط کی وضاحت بھی کر دیں؟“

”خطوط ملزم نے دیئے ہی نہیں۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ”میرے فاضل دوست! اس کیس میں آپ نورین صاحبہ کی وکالت کر رہے ہیں۔ گویا آپ اس کے وکیل ہوئے۔ میں اسی حیثیت سے آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

وہ پوری توجہ سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”اگر میرے موکل نے آپ کی موکل کو مذکورہ خط نہیں دیئے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کی موکل کا خطوط حاصل کرنے کے لئے جائے وقوعہ پر پہنچنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خطوط وجود رکھتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے، آپ کی موکل نے آپ کو ان خطوط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ چلو کوئی بات نہیں۔“ اتنا کہہ کر میں چند لمحات کے لئے خاموش ہوا۔ وکیل استغاثہ جز بز ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”آپ کی موکل نورین صاحبہ اس وقت عدالت میں موجود ہیں۔ یہ بات ان سے بھی پوچھی جا سکتی ہے!“

میں نورین کو بار بار اس کی موکل کہہ کر اسے زچ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اندھیر نگری تھی کہ ان دونوں کو ایک الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ازاں بعد پولیس نے ایسا چکر چلایا کہ سارا ملبہ میرے موکل پر گرا دیا اور نورین کو ایک مظلوم کی حیثیت سے اجاگر کیا جانے لگا۔ میں یہ بات تو بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ اس کایا پلٹ کے پیچھے عبدالکریم کی دولت نے ہاتھ دکھایا ہو گا، لیکن کس طرح؟ اس کی وضاحت نہیں ہو سکی تھی۔

میری تجویز انتہائی معقول اور فوری طور پر قابل عمل تھی۔ لیکن وکیل استغاثہ کے ذہن میں چونکہ چور چھپا بیٹھا تھا لہٰذا اس نے جلدی سے کہا۔

”نورین صاحبہ نے مجھے ساری تفصیل بتا دی ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ رکا پھر قدرے کمزور آواز میں بولا۔ ”کسی زمانے میں نورین صاحبہ، ملزم میں دلچسپی لینے لگی تھیں، اسی سلسلے میں اس نے ملزم کے نام چند خطوط لکھے تھے جن کی بنیاد پر ملزم اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نورین صاحبہ کی یہی مجبوری اسے جائے وقوعہ پر لے گئی تھی۔“

وکیل استغاثہ کی وضاحت کسی شارٹ پچ ڈلیوری سے کم نہیں تھی۔ میں نے ایک زبردست ہک شاٹ کھیلنا ضروری جانا اور تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”گویا وہ عشقیہ خطوط تھے!“

وکیل استغاثہ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ میں نے مجسٹریٹ کی جانب روئے سخن پھیرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! وکیل سرکار نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ میرے موکل اور نورین صاحبہ کے درمیان ایک سنجیدہ اور گہرا تعلق موجود ہے۔ آپ اسے پسندیدگی کہیں، محبت یا عشق اس

سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں کے باہر ملنے کا جواز سامنے آجاتا ہے اور......"

وکیل استغاثہ نے مخالفت ضروری سمجھی اور میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مداخلت کر دی۔

"آبجیکشن یور آنر! میں وکیل استغاثہ کے کہے ہوئے الفاظ میں تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔"

مجسٹریٹ اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا۔ "جناب عالی! یہ درست ہے، کسی زمانے میں نورین صاحبہ اس شخص کی باتوں میں آگئی تھیں اور نادانی میں اسے کچھ تحریریں بھی بھیج دی تھیں جیسا کہ اس نوعیت کے معاملات میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ زمانہ گزشتہ کا قصہ ہے، ملزم کی اصلیت کھل جانے کے بعد میری موکل نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اب یہ بھی بتا دیں، اس قطع تعلق کی مدت کیا ہے؟ آپ تو زمانہ گزشتہ کا یوں ذکر کر رہے ہیں جیسے یہ صدیوں پہلے کا واقعہ ہو۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "لگ بھگ ایک سال پہلے۔"

"اس کا مطلب ہے، ان کا تعلق قائم ہوتے ہی ختم ہو گیا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کم و بیش اتنا عرصہ پہلے ہی ان میں تعلق قائم ہوا تھا۔"

"تو اس میں ایسی اعتراض والی کون سی بات ہے۔" وکیل استغاثہ نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ "جب ملزم کی حقیقت نورین پر کھلی تو وہ اس سے متنفر ہو گئی۔ اسے اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ اس نے ایک غلط آدمی سے دل لگا لیا تھا۔ بہر حال اس وقت تک وہ ملزم کو چند خطوط ارسال کر چکی تھی۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ ملزم کس وقت بلیک میلنگ پر اتر آئے اور بالآخر ملزم نے یہ حرکت کر ہی ڈالی۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میرے موکل نے یہ حرکت بہت جلدی نہیں کر دی؟"

میرے ان ریمارکس پر حاضرین عدالت میں سے بعض کی ہنسی نکل گئی۔ میں نے اپنے لہجے میں کاٹ کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "اسے چاہئے تھا کہ کم از کم ایک دو صدی تو انتظار کر لیتا۔ ہو سکتا ہے، نورین کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا اور وہ اس کی طرف لوٹ آتی!"

"وہ ملزم کا جو بھیانک روپ دیکھ چکی تھی اس کے بعد واپسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" وکیل استغاثہ نے ہٹ دھرمی جاری رکھی۔

میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کی موکل کو میرے موکل میں ایسی کیا خرابی نظر آ گئی تھی؟"

اس نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے عبدالکریم اور احمد علی کا پس منظر واضح کیا پھر اس قصے کے اختتام پر کہا۔ "نورین صاحبہ کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ ملزم اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ وہ پیار محبت کا ڈھونگ رچا کر اس کے والد کو تباہ کرنا چاہتا تھا تاکہ دیرینہ رنجش کا انتقام لے سکے۔ ملزم کے خطرناک عزائم سے واقف ہوتے ہی وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔"

"بہت خوبصورت کہانی ہے۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "واقعی دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے!"

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں بیگ صاحب؟" مجسٹریٹ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "جناب عالی! نورین کوئی ننھی بچی نہیں جو میرے موکل کی باتوں میں آ کر اس سے دل لگا بیٹھی ہو۔ اور اس کے عزائم کو بھانپتے ہی الگ ہو گئی۔ وہ ایک پڑھی لکھی، باشعور اور ماضی نافراموش لڑکی ہے۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ کئی سال پہلے اس کے اور ملزم کے والد کے درمیان کیا جھگڑا ہوا تھا۔ اس تناظر میں کسی بھی صورت اسے ملزم کے قریب نہیں آنا چاہئے تھا۔ جو اس کے باپ کا دشمن تھا، وہ اس کا دوست کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ میرے موکل کے ساتھ تعلق بڑھانے کے لئے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔ یعنی سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے وہ ملزم سے محبت کرنے لگی اور ایک روز پہلے تک یہ محبت قائم و دائم تھی لیکن دولت کی طاقت نے سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ میں اس موقع پر یہ کہوں گا، نورین کی محبت ایک خوب صورت ڈھونگ تھی۔ فریبی میرا موکل نہیں بلکہ نورین ہے جس کی چاہت مشکلات کی دھوپ میں کسی برف کے ٹکڑے کی مانند پگھل کر پانی ہو گئی بلکہ پانی سے بھی ہوا بن کر اڑ گئی۔ میرے موکل نے اس لڑکی کے ہاتھوں ایک خوبصورت دھوکا کھایا ہے۔ کاش! یہ اس لڑکی کو پہلے پہچان گیا ہوتا۔ دولت کی طاقت نے وہ رنگ دکھایا کہ نورین ایک سال پرانے تعلق کو فراموش کر بیٹھی۔"

"آپ بار بار دولت کی طاقت کا ذکر کر رہے ہیں بیگ صاحب!" مجسٹریٹ نے بھویں سکیڑ کر کہا۔ "ذرا اس راز سے بھی پردہ اٹھا دیں؟"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جناب عالی! میرے موکل اور نورین کو پکڑ کر تھانے لایا گیا تو انہیں ایک ہی حوالات میں رکھا گیا تھا۔ گرفتاری کا عمل لگ بھگ دو بجے پیش آیا۔ پانچ بجے تک یہ دونوں حوالات کے ایک کمرے میں بند رہے اور ان دونوں میں وہ محبت بھی موجود تھی جس کا آغاز ایک سال پہلے ہوا تھا۔"

میں نے چند لمحات کا توقف کر کے حاضرینِ عدالت کو دیکھا اور دوبارہ مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ "جناب عالی! کم و بیش چار بجے سہ پہر نورین کو یہ کہہ کر حوالات سے باہر نکالا گیا کہ انچارج صاحب نے اسے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔ دس منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اب وہ پہلے والی نورین باقی نہیں رہی تھی۔ وہ کسی بھی صورت میرے موکل سے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تھی بلکہ اس نے قطع تعلقی جیسا رویہ اپنا لیا۔ پھر پانچ بجے کسی مصلحت کی بنا پر نورین کو ملزم سے الگ کر دیا گیا۔ یعنی اسے حوالات کے دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ایک عجیب و غریب سچویشن ہے۔ اپنے موکل سے ملاقات سے پہلے میں نورین سے ملا لیکن اس نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ

اگر وہ دونوں مجھے اعتماد میں لے کر سب کچھ سچ سچ بتا دیں گے تو میں انہیں پولیس کے چنگل سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا مگر نورین نے یہ کہہ کر گفتگو کا دروازہ بند کر دیا کہ اس کے ڈیڈی نے اس کی رہائی کا بندوبست کر لیا ہے۔ میں اپنے موکل کی فکر کروں۔" میں نے ایک لمحے کو رک کر سانس درست کی پھر مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جناب عالی! نورین اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی رہائی کے حوالے سے اتنی بڑی اور پُر یقین بات کس بنا پر کی تھی؟ اسی بنا کے نیچے دولت کی طاقت کا راز پنہاں ہے!"

مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے نورین کو دیکھا اور کہا۔ "بی بی! تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو؟"

"میں نے وکیل صاحب سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

اس کی دروغ گوئی پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا اور قدرے سخت لہجے میں اس سے استفسار کیا۔ "کیا آپ اس بات سے بھی انکار کریں گی کہ چار بجے دس منٹ کے لئے آپ کو انچارج صاحب کے کمرے میں بلایا گیا تھا؟"

وہ قدرے تامل کرتے ہوئے بولی۔ "یہ بات تو درست ہے۔"

"اس مختصر طلبی کا سبب کیا تھا؟"

وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولی۔ "میرے ڈیڈی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ تھانے دار کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہاں میرے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں ہو رہا۔ چند منٹ بعد مجھے واپس حوالات میں بھیج دیا گیا۔"

"دیئر از پوائنٹ یور آنر!" میں نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "عام طور پر پولیس والے حوالاتیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے اور اگر ورثا پر یہ مہربانی کرتے بھی ہیں تو اس حد تک کہ کسی پولیس اہلکار کی نگرانی میں حوالات کے اندر ہی ملزم سے مختصر ملاقات کروائی جاتی ہے۔ نورین صاحبہ سے امتیازی سلوک کسی گڑبڑ کی نشان دہی کرتا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ نورین صاحبہ کی حیثیت کسی ملزمہ جیسی نہیں تھی اس لئے اگر اسے تھانہ انچارج کے کمرے میں اس کے ڈیڈی سے ملوا دیا گیا تو اس میں حیرت والی کون سی بات ہے؟ یہ امتیازی سلوک تو نہ ہوا!"

"بہت خوب میرے فاضل دوست!" میں نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کی منطق بڑی نرالی ہے۔ میں کھلے دل سے آپ کو اس کارکردگی پر داد دیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر میں رکا اور مجسٹریٹ کی جانب معنی خیز نظر سے دیکھا پھر روئے سخن وکیل استغاثہ کی طرف پھیرتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میرے فاضل دوست! آپ کا اب تک کا زورِ خطابت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کی موکل بے قصور اور میرا موکل سراسر قصور وار ہے۔ اب آپ

ہی اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ اگر نورین صاحبہ اس معاملے میں کسی بھی طور پر ڈیفالٹر نہیں ہیں تو انہیں حوالات میں کیوں بند کیا گیا۔ نہ صرف بند کیا گیا بلکہ پوری رات تھانے میں رکھنے کے بعد آج عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس سوال کا جواب ہے آپ کے پاس؟"

اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا۔ میں نے مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! استغاثہ جھوٹ کا پلندا اور میرے موکل کے خلاف ایک منظم سازش ہے۔ پولیس نے اگر انہیں گرفتار کر کے حوالات میں ڈال ہی دیا تھا تو تھوڑی باز پرس اور سرزنش کے بعد انہیں چھوڑا جا سکتا تھا لیکن میرے موکل کے باپ سے جو مطالبہ کیا گیا وہ حیرت ناک ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پیچیدہ بھی ہے۔ پیچیدہ ان معنوں میں کہ اس کی تہ میں کسی سازش کا سراغ ملتا ہے۔ پولیس والے کسی خاص وجہ سے نورین کو کور کر کے میرے موکل کو اس معاملے میں الجھانا چاہتے ہیں جو کہ ایک زیادتی ہے۔ لہٰذا میں معزز عالت سے استدعا کرتا ہوں، میرے موکل کی ضمانت قبول کی جائے۔"

مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔ "پولیس نے آپ کے موکل کے باپ سے کیا مطالبہ کیا تھا؟"

مذکورہ منصف خاصا سمجھدار اور موقع شناس تھا۔ اس نے میرے بیان میں سے نہایت ہی اہم نکتہ اٹھا لیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو خود بھی اس کی وضاحت کر سکتا تھا لیکن میری یہ خواہش تھی، سوال دوسری طرف سے آئے تاکہ مجھے اپنا موقف بیان کرنے میں زیادہ آسانی رہے اور اس کی تاثیر میں بھی اضافہ ہو جائے۔

میں نے مجسٹریٹ کے سوال کے جواب میں کہا۔ "یور آنر! یہ مطالبہ بہت ہی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ شام پانچ بجے نورین اور میرے موکل کو الگ کر دیا گیا تھا۔ لگ بھگ سات بجے ملزم کا باپ احمد علی تھانے میں اس سے ملاقات کرنے گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کی بے گناہی ان پر ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن اس داد فریاد سے پولیس والوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی بلکہ جب احمد علی نے زیادہ زور مارا تو اسے بیٹے کی رہائی کے لئے ایک راہ دکھائی گئی۔ نہایت ہی رازداری کے ساتھ اس سے کہا گیا، اگر وہ صبح سے پہلے ایک لاکھ روپے کا بندوبست کر لے تو اس کے بیٹے کو چھوڑ دیا جائے گا، بہ صورت دیگر اسے حوالہ عدالت کر کے سخت سے سخت ترین سزا دلوائی جائے گی۔"

ایک لاکھ روپے والی بات پر مجسٹریٹ نے چونک کر پہلے وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر اس کی نگاہ تفتیشی افسر کی طرف اٹھ گئی۔ وکیل استغاثہ نے معاملات سنبھالنے کی کوشش کی اور جلدی سے کہا۔

"جناب عالی! وکیل صفائی ایک گھسی پٹی چال چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پولیس والوں کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ بڑی بڑی رقمیں بٹور کر ملزمان کو چھوڑ دیتے ہیں یا پھر

ان کے چالان تیار کرتے ہوئے ہلکی دفعات کا استعمال کرتے ہیں۔ میرے فاضل دوست اسی بھیڑ چال فارمولے کا ذکر کر رہے ہیں اور اس ذکر میں بیان کی گئی رقم ہی ان کے جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لئے کافی ہے۔"

اس نے ذرا توقف کر کے فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھا اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اگر بات پانچ دس ہزار کی ہوتی تو سمجھ میں آ جاتی مگر ایک لاکھ روپے! خدا کی پناہ۔" اس نے دونوں ہاتھوں کو اپنے کانوں تک پہنچایا اور بولا۔ "پولیس تو کسی قتل کے ملزم سے بھی اتنی بھاری رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔"

"چہ...... خوب میرے فاضل دوست!" میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "آپ کو پولیس والوں کی رشوت کے اسکیلو ازبر ہیں۔ میں آپ کی یادداشت کو سلام کرتا ہوں۔" پھر میں مجسٹریٹ کی جانب گھوم گیا اور کہا۔

"جناب عالی! ایک لاکھ روپے رشوت مانگنے والی بات میرے جھوٹ کی قلعی نہیں کھولتی۔ کیونکہ اس صداقت میں شمہ برابر ملاوٹ نہیں۔ البتہ!" میں نے ڈرامائی انداز میں وقفہ دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"البتہ وکیل استغاثہ کی پانچ دس ہزار والی بات میرے سچ کی گواہی دیتی ہے۔ سب لوگ بشمول عدالت اس بات سے آگاہ ہے کہ ملزم کے والد احمد علی کی مالی حیثیت کیا ہے۔ وہ ایک بڑے چلتے ہوئے کاسمیٹکس اسٹور کا مالک ہے جہاں باپ بیٹے کے علاوہ ایک ملازم بھی کام کرتا ہے۔ اسٹور کی روزانہ کی سیل ہزار سے اوپر ہوتی ہے۔ اگر پولیس والے احمد علی سے پانچ دس ہزار روپے مانگ لیتے تو ظاہر ہے، وہ بیٹے کی رہائی کے لئے یہ قربانی دینے پر تیار ہو جاتا مگر ایک لاکھ کا مطالبہ اسے چکرانے کے لئے کافی تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ بیٹے کو باعزت بری کروانے کے لئے دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔"

میں سانس لینے کے لئے ذرا متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! وکیل استغاثہ یہ عقدہ حل کریں گے کہ نورین اور سلیم کو جب ایک جگہ سے ایک الزام کے تحت پکڑا گیا تو پھر دونوں میں فرق کیسے ہو گیا اور یہ تفریق بھی نورین کے والد کی تھانے میں آمد کے بعد پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے ان دونوں کو ایک ہی الزام میں ایک ہی جگہ رکھا گیا تھا۔ ان حقائق سے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نورین کے والد اور پولیس کے بیچ کوئی مُک مُکا ہو گیا ہو گا جس کے نتیجے میں اس کی بیٹی کو اس معاملے سے الگ کر دیا گیا اور سارا وبال میرے موکل کے سر آ گیا۔ نورین کا والد پولیس والوں کا بڑے سے بڑا مطالبہ قبول کر سکتا ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔" میں اتنا کہہ کر چند لمحات کے لئے خاموش ہو گیا۔

"اور وہ وجوہات کیا ہیں بیگ صاحب؟" مجسٹریٹ نے مجھ سے استفسار کیا۔

میں نے نہایت ہی مضبوط لہجے میں وضاحت کر دی۔ "جناب عالی! اول تو نورین کے والد کی مالی حیثیت اتنی مستحکم ہے کہ وہ ایک لاکھ روپے بہ آسانی ادا کر سکتا ہے۔" عدالت کے کمرے میں نورین کا ڈیڈی عبدالکریم بھی موجود تھا۔ اس نے نفرت آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس کی پروا کئے بغیر اپنا بیان جاری رکھا۔

"یور آنر! دوم، عبدالکریم صاحب کے لئے بیٹی کا معاملہ تھا جو ظاہر ہے بیٹے کے معاملے سے زیادہ حساس اور سنگین ہوتا ہے۔ اس لئے بھی اس نے پولیس والوں کی بات مان لی ہو گی۔"

وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض اٹھایا۔ "اگر ایسا ہوا تو پھر نورین کو تھانے میں رات کیوں گزارنا پڑی؟"

"میرے فاضل دوست! لگتا ہے آپ نے اس کیس کو اچھی طرح اسٹڈی نہیں کیا۔ آپ کا یہ اعتراض کسی پھندے سے کم نہیں اور پھندا بھی آپ کے پاؤں کا۔ یہی سوال میں آپ سے کر چکا ہوں کہ جب نورین کسی بھی طرح قصور وار نہیں تو پھر اسے تھانے میں کیوں رکھا گیا؟ اسے اس کے باپ کے ساتھ رخصت کر دیا جانا چاہئے تھا۔ آپ نے تو میرے سوال کا جواب نہیں دیا کیونکہ آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہو ہی نہیں سکتا مگر میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔"

میں نے تھوڑا توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی مدبرانہ انداز میں کہا۔ "میرے فاضل دوست! آپ نے سوال کرنے میں بہت جلدی دکھائی ہے۔ اگر تحمل سے میرے بیان کے پورا ہونے کا انتظار کر لیتے تو آپ کی تشفی ہو جاتی۔ میں جو وجوہات معزز عدالت کے علم میں لا رہا تھا، اس کی آخری وجہ میں آپ کے سوال کا جواب موجود تھا۔ خیر، آپ توجہ سے سنیں۔"

میں ایک مرتبہ پھر مجسٹریٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "جناب عالی! تاخیر کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل سرکاری وکیل کے اعتراضات کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ تو جناب! میں عرض کر رہا تھا، عبدالکریم صاحب کئی وجوہات کی روشنی میں پولیس والوں کا مطالبہ قبول کر سکتے ہیں۔ دو اہم وجوہ میں نے پیش کر دیں۔ تیسری اور آخری وجہ بھی سن لیں۔" میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دونوں خاندانوں کے ماضی کا ایک جائزہ پیش کیا۔ اس میں سے بیش تر باتیں وکیل استغاثہ پہلے ہی عدالت کے علم میں لا چکا تھا۔

"جناب عالی!" میں نے موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "دیرینہ رنجش راکھ میں دبی ہوئی کسی چنگاری کی مانند ہوتی ہے جو بجھتی نہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شعلہ افشانی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے بزرگ راکھ کریدنے سے منع فرماتے ہیں۔ لیکن وقت کی سلاخ نے ایک اتفاق کے نتیجے میں اس راکھ کو اڑا کے رکھ دیا جس کے نتیجے میں عبدالکریم کے دل میں دفن احمد علی کے لئے شدید نفرت ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس نے احمد علی

اور اس کے بیٹے سلیم کو سزا دینے کے لئے یہ چال چلی۔ پولیس کی مٹھی گرم کر کے کیس کا رخ موڑ دیا۔ جو طوفان ان دونوں کی طرف آرہا تھا وہ اب میرے موکل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس انتقامی کارروائی کے لئے چند نئے جھوٹوں کا سہارا بھی لینا پڑا، مثلاً عشقیہ خطوط کی فرضی کہانی کو اس اسکرپٹ میں شامل کیا گیا حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے...... اور یہ حقیقت میں اپنے موقف کی ابتدا میں بیان کر چکا ہوں۔"

تھوڑی دیر رک کر میں نے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور بیان کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے پولیس کی زبردست چال بازی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عبدالکریم کے ساتھ معاملہ پٹ جانے کے بعد انہوں نے ملزم کے باپ احمد علی کو گھسنا چاہا۔ اگر وہ ان کا ایک لاکھ والا مطالبہ پورا کر دیتا تو گرفتار شدگان کو آزاد کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا جاتا۔ پولیس کی ہر صورت میں چاندی ہی چاندی تھی اور مجھے شک ہے، پولیس نے احمد علی سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ عبدالکریم کے ایما پر کیا ہوگا۔"

"اتنی بڑی بات آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟" وکیل استغاثہ نے مجھ سے پوچھا۔ "کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے معنی خیز نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرے فاضل دوست! حالات و واقعات کی روشنی میں کوئی بھی ذی ہوش اور معاملہ فہم آدمی یہ اندازہ قائم کر سکتا ہے...... جو نتیجہ میں نے اخذ کیا ہے اور میری نظر میں یہ بہت سامنے کی بات ہے جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں جب کہ آپ نے ایک بڑی بات کسی بنیاد کے بغیر ہی بڑے معلق انداز میں کہہ ڈالی؟"

"کون سی بات؟" وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "میرے موکل پر الزام تراشی والی بات۔ آپ نے دعویٰ کیا ہے، جائے وقوعہ پر میرے موکل نے آپ کی موکل سے بدتمیزی اور دست درازی کی تھی۔ آپ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس شہادت پیش کر سکتے ہیں؟ جائے وقوعہ ایک پبلک پلیس ہے۔ اگر پولیس اہلکار میرے موکل کی اس "حرکت" پر متوجہ ہو سکتے ہیں تو پھر یقیناً وہاں موجود دیگر افراد نے بھی اس بدتمیزی سے دست درازی کا مظاہرہ دیکھا ہوگا؟"

میرا یہ سوال کسی خطرناک یارکر سے کم نہیں تھا۔ اُسے کلین بولڈ ہونا پڑا۔ لیکن اپنی عادت کے مطابق اس نے مبہم انداز میں کہا۔ "اگر معزز عدالت ضرورت محسوس کرے گی تو اس سلسلے میں پیش رفت کی جا سکتی ہے۔"

"الفاظ "پیش رفت" کا استعمال آپ نے بڑے محتاط انداز میں کیا ہے۔" میں نے نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک لبادہ ہے "جھوٹی شہادت" کا۔ اگر عدالت کی طرف سے آپ کو حکم دیا

جائے تو آپ ایک دو جھوٹے گواہ پکڑ کر لے آئیں گے جو بڑی بڑی قسمیں کھا کر حلفیہ کہیں گے کہ انہوں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے ملزم کو بدتمیزی، دست درازی اور نہ جانے کیا کیا کرتے دیکھا تھا۔ لیکن شاید آپ نے میری بات پر غور نہیں کیا!" میں چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے پوچھا تھا، میرے موکل کی بدتمیزی اور دست درازی کی کوئی ٹھوس شہادت ہے آپ کے پاس؟ اگر آپ نے جائے وقوعہ پر چند لوگوں کے بیانات لئے ہوتے تو انہیں معزز عدالت میں پیش کر سکتے تھے لیکن حقیقت چونکہ آپ کے موقف کے برعکس ہے اس لئے اب آپ بھرتی کے گواہوں کا بندوبست کر لیں گے۔ یہ بات میرے اور آپ کے علاوہ بہت سے لوگ بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ عدالت کے باہر جھوٹے گواہ بہ آسانی دستیاب ہو جاتے ہیں جو پانچ دس روپے میں ہمہ وقت اپنا ایمان اور ضمیر فروخت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔"

اس زمانے میں واقعی پانچ دس روپے میں جھوٹے گواہ فراوانی سے مل جاتے تھے۔ آج کل ان کا "ہدیہ نذرانہ" دو تین سو روپے تک جا پہنچا ہے۔ یہ حقیقت ہے......اور حقیقت ہمیشہ تلخ ہی ہوا کرتی ہے!

میری بات کے اختتام پر وکیل استغاثہ نے میرے موکل کی ضمانت رکوانے کے لئے چند دلائل دیئے۔ اس میں پہلے کہی گئی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور میں ان اعتراضات اور الزامات کی بھرپور تردید پیش کر چکا تھا۔ میں نے مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت مودبانہ لہجے میں کہا۔

"جناب عالی! میں پچھلی باتوں کو دہرا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔ پہلے ہی ضمانت کی کارروائی خاصی طوالت اختیار کر چکی ہے۔ اب میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا اور میرا یہ کہنا ایک استدعا ہے کہ میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت عدالت میں گھسیٹا جا رہا ہے ورنہ اس کیس کی جو اصل روح ہے اس کو تھانے ہی میں نمٹایا جا سکتا تھا مگر ذاتی رنجش، دیرینہ چپقلش اور انا کی بقا کاری اس کیس میں شامل ہو چکی ہے اور یہ بات کوئی ڈھکی چھپی بھی نہیں۔ میرے متعدد سوالات کے جوابات وصول نہیں ہوئے۔ استغاثہ نے یا تو بہانے بازی سے کام لیا ہے یا پھر سرے سے جواب دینے ہی سے احتراز برتا ہے۔ لہٰذا میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے میرے موکل کی ضمانت منظور کی جائے۔ ملزم سلیم ایک مصروف دکان دار ہے اور کاسمیٹکس کی وہ دکان ہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہے۔ اگر ملزم زیادہ دنوں تک عدالتی چکروں میں جکڑا رہا تو اس کا کاروبار تباہ ہو کر رہ جائے گا جو انسانیت کے منافی ہوگا۔"

اس موقع پر وکیل استغاثہ نے ایک مرتبہ پھر ضمانت کی مخالفت میں زبان درازی شروع کی تو مجسٹریٹ نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "یہ سب کچھ آپ پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں۔ کوئی نئی

بات ہوتو سامنے لائیں!''

وکیل استغاثہ نئی بات کے ظہور کے لئے ایک بار پھر گڑے مردے اکھاڑنے بیٹھ گیا۔اس دفعہ مجسٹریٹ نے قدرے سخت الفاظ کا استعمال کیا اور تنبیہی انداز میں کہا۔

''میں آپ کو ایک پیشی کا موقع دیتا ہوں۔آئندہ تاریخ پر آپ ان تمام سوالات کے جوابات پیش کریں گے جو بیگ صاحب نے اٹھائے ہیں اور جہاں جہاں ٹھوس شہادتوں کی ضرورت ہے، وہ ثبوت بھی مہیا کریں گے۔اگر آپ نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور مذکورہ ثبوت عدالت میں پیش نہ کر سکے تو معزز عدالت یہ کیس خارج کر دے گی۔''

پھر مجسٹریٹ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''بیگ صاحب! عدالت آپ کے موکل کی عبوری ضمانت منظور کرتی ہے لیکن آئندہ پیشی پر اسے عدالت میں حاضر کرنا آپ کی ذمے داری ہو گی۔''

''تھینکس یور آنر!'' میں نے گردن کو خم کرتے ہوئے کہا۔''میں اپنے فرائض کا خیال رکھوں گا۔انشاءاللہ عدالت کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

اس کے بعد مجسٹریٹ نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو سلیم کا باپ احمد علی بہت خوش تھا۔ضمانت کے سلسلے میں تھوڑی عدالتی کارروائی باقی تھی لہٰذا فوری طور پر ہم جا نہیں سکتے تھے۔میں احمد علی کو لے کر ایک طرف برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔اس نے تشکر سے لبریز لہجے میں کہا۔

''بیگ صاحب! میں آپ کے دلائل سے بہت متاثر ہوا ہوں۔''

''احمد علی صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔یہ بھی بھلا کوئی دلائل تھے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔''آپ نے قتل کے کیسز کی عدالتی کارروائی ملاحظہ نہیں کی ہو گی۔دلائل تو وہاں کے دیکھنے والے ہوتے ہیں۔یہ تو نہایت ہی معمولی نوعیت کا کیس تھا جو پولیس اور عبدالکریم کی ملی بھگت سے پیچیدگی اختیار کر گیا۔میرے خیال میں تو اس معاملے کو تھانے ہی میں رفع دفع ہو جانا چاہئے تھا۔''

وہ چونک کر تعریفی نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر پوچھ بیٹھا۔''آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ عبدالکریم نے پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے انہیں سلیم کے خلاف کر دیا تھا تاکہ میں تباہ و برباد ہو سکوں؟ خدا کی قسم! میرا تو اس طرف دھیان بھی نہیں گیا تھا!''

''وہ اس لئے کہ آپ مثبت طرزِ فکر کے آدمی ہیں جب کہ عبدالکریم منفی سوچ کا حامل ثابت ہو رہا ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''اس بدبخت نے یہ بھی نہ سوچا کہ اپنے انتقام کی خاطر وہ بیٹی کو چارے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔انا پرستی اور خود پسندی انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔''

وہ تائیدی انداز میں بولا۔''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

میں جانتا تھا، وہ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہ رہا تھا لیکن چند لمحات کے لئے میں انجان بن گیا اور اس سے پوچھا۔''آپ نے مجھ سے کیا سوال کیا تھا؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''میں یہ جاننا چاہتا ہوں، آپ کو کیسے پتا چلا، عبدالکریم نے تھانہ انچارج کو اپنی مرضی کے مطابق عمل پر مجبور کیا ہے؟''

سچی بات تو یہ ہے کہ میرا وہ اقدام حالات و واقعات کی روشنی میں قائم کیا جانے والا ایک اندازہ درست تھا۔لیکن یہ بات میں احمد علی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔اس طرح میرے بارے میں اس کا تاثر خراب ہو جاتا۔میں نے معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ میں عبدالکریم کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا، وہ ایک منتقم المزاج اور کینہ پرور شخص ہے۔پھر تمہاری بیان کردہ کہانی میرے ذہن میں تھی۔اس کے علاوہ حوالات میں، میں نے نورین سے جو مختصر ملاقات کی تھی اس میں، میں نے غیر محسوس طریقے سے اس کی زبان سے حقیقت اگلوالی تھی۔'' میں نے سچ اور جھوٹ کی آمیزش سے کام لیتے ہوئے کہا پھر احمد کی نفسیات کے عین مطابق کہا۔''نورین اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتی ہے لیکن میں نے اس کی چالاکی کو خاک میں ملا دیا۔وہ تصور بھی نہیں کر سکتی، میں نے اس کے ساتھ کیا ہنر دکھایا ہے۔''

''وہ چالاک ہی نہیں، بہت عیار اور مکار بھی ہے۔'' وہ نفرت سے لبریز لہجے میں بولا۔''اس نے میرے بیٹے کو پہلے اپنی چال میں پھنسایا۔وہ اس کے پیچھے دُم ہلانے لگا۔اس کا دم بھرنے لگا اور جب مصیبت کی گھڑی میں اس کے ساتھ اور تعاون کی ضرورت پیش آئی تو اس نے رخ پھیر لیا۔مجھے تو لگتا ہے بیگ صاحب! نورین نے اپنے باپ کے ایما پر ہی سلیم سے راہ و رسم بڑھائی ہو گی۔وہ بے غیرت لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں احمد صاحب!'' میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''میں عبدالکریم کی تمام چالوں کو بے نقاب کر دوں گا۔وہ بھی مدتوں یاد رکھے گا، اس کا پالا کس وکیل سے پڑا تھا!''

یہ گویا اس کے زخمی جگر پر ہمدردی اور خلوص کا مرہم رکھنے کے مترادف تھا۔وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔''بیگ صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''

''میں اپنے موکل کو انصاف دلانے کی کوشش کرتا ہوں، اس میں احسان والی کوئی بات نہیں ہوتی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔''یہ آپ کا بڑا پن ہے۔''

''ساری بڑائی اس ذات پاک کے لئے ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''میں ذاتی طور پر عبدالکریم کے خلاف کسی قسم کی انتقامی

کارروائی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگر میں نے ایسا کرنا ہوتا تو اس وقت کوئی قدم اٹھاتا جب اس نے مجھے بزنس سے الگ کر کے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ ان لمحات میں مجھے اُکسانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اگر میں جوش میں آ کر ہوش کا دامن ہاتھ سے جانے دیتا تو اچھی خاصی خون ریزی بھی ہو سکتی تھی۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''میں صرف یہ چاہتا ہوں، سلیم اس مصیبت سے باہر آ جائے۔ نورین اور اس کا باپ جائیں جہنم میں۔''

یہ اس کی مثبت سوچ کا ایک اور پہلو تھا۔ پہلی ملاقات میں اس نے مجھ پر جو تاثر چھوڑا تھا، اب وہ اس سے خاصا مختلف نظر آ رہا تھا۔ شاید اس وقت وہ نورین کی وجہ سے خاصا تپا ہوا تھا اس لئے بڑھ چڑھ کر بول گیا۔ وہ اپنے بیٹے کو پیش آنے والی پریشانی کا سبب نورین کو سمجھتا تھا۔

میں نے اس کی دل جوئی اور حقائق کی روشنی میں کہا۔ ''احمد صاحب! مجھے پوری امید ہے، اگلی پیشی پر عدالت اس مقدمے کو خارج کر دے گی کیونکہ وکیل استغاثہ مبینہ مطلوبہ ثبوت مہیا نہیں کر سکے گا۔ اگر استغاثہ کی جانب سے جعلی گواہ عدالت میں پیش کئے گئے تو میں ان کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دوں گا۔ استغاثہ کے پاس پسپائی کے سوا کوئی راستہ نہیں بچے گا۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔'' وہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ حوصلہ رکھیں۔ ویسے آج کی کارروائی بھی خاصی نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہے۔ آپ اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ لے کر گھر جائیں گے۔''

وہ مجھے دعائیں دینے لگا۔

❂❂❂
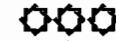
آئندہ پیشی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ یہ اگرچہ کوئی لمبا چوڑا عرصہ نہیں تھا لیکن ان چند دنوں میں اچھے خاصے اہم واقعات پیش آ گئے۔ اسی شام میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ میری سیکرٹری نے انٹرکام پر اطلاع دی۔

''سر! کوئی عبدالکریم صاحب آپ سے ضروری ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

عبدالکریم کے نام پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے سیکرٹری سے کہا۔ ''مجھ سے سب ضروری ملاقات کے لئے ہی آتے ہیں۔ تم انہیں انتظار گاہ میں بٹھاؤ اور اصول کے مطابق نمبر آنے پر انہیں میرے پاس بھیج دینا۔''

''اوکے سر۔'' سیکرٹری نے یہ کہتے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔

میں عبدالکریم کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا یہاں آنا خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس کا مخالف وکیل تھا۔ اگر وہ مجھ سے ملنے آیا تھا تو کوئی خاص بات ہی ہو سکتی تھی۔ میں اپنے کلائنٹس کو حسب معمول نمٹاتا رہا۔ پھر عبدالکریم کی باری پر میری سیکرٹری نے اسے کمرے میں بھیج دیا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے کرسی کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ میرے پیشے کے تقاضے ہیں۔ مجھ سے ملنے کے لئے آنے والے کے ذہن میں کیا ہے، یہ تو بعد میں کھلتا ہے۔

''جی کریم صاحب! آپ کیسے تشریف لائے؟'' میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

وہ چند لمحے گہری اور سنجیدہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ بڑے زبردست وکیل ہیں بیگ صاحب!''

''جی بہت بہت شکریہ۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

وہ ایک مرتبہ پھر چند لمحے خاموش رہا اس کے بعد خالصتاً کاروباری انداز میں بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کیس سے الگ ہو جائیں۔ اس نیکی کے لئے میں آپ کو آپ کی من پسند رقم دینے کو تیار ہوں۔''

اس کی پیش کش سے مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ''گویا آپ مجھے خریدنے آئے ہیں؟''

''آپ غلط سمجھے۔'' وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ ''یہ دراصل ایک بزنس ڈیل ہو گی۔ آخر کو آپ نے احمد علی سے بھی تو ایک مخصوص رقم وصول کی ہو گی!''

اس کا نامعقول اندازِ گفتگو کوفت میں مبتلا کرنے والا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''احمد علی میرا کلائنٹ ہے اور میں نے اس سے جو رقم وصول کی ہے وہ میری فیس ہے۔ اس فیس کے عوض میں اسے انصاف دلانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''چلیں آپ ناراض نہ ہوں، میں بھی اسے فیس ہی کا نام دے دیتا ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اب بتائیں اگر میں آپ کو اپنا وکیل کروں تو آپ کتنی فیس لیں گے؟''

''میں اس وقت آپ کی مخالف پارٹی کا وکیل ہوں۔'' میں نے یاددہانی والے انداز میں کہا۔

وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں پارٹی بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ہمارے سیاست داں اس کام کے ماہر ہیں۔ آپ کو بھلا میں کیا بتاؤں گا۔ آپ بھی تھوڑی دیر کے لئے پارٹی بدل لیں...... اور اگر چاہیں تو پارٹی بدلنے کا اعلان کئے بغیر بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ آپ سلیم ہی کے وکیل رہیں لیکن کام میرے حسب منشا کریں۔ اس کے لئے میں آپ کو منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوں۔''

اس کی باتیں سن کر مجھے شدید غصہ آیا تاہم میں نے ضبط کا مظاہرہ کیا ورنہ جی تو چاہ رہا تھا، اسے دھکے مار کر اپنے دفتر سے نکال دوں۔ میں نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔

"میں ڈبل گیم کھیلنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"سوچ لیں، میں تو آپ ہی کے فائدے کی بات کر رہا تھا۔"

"میں اپنا فائدہ نقصان خوب سمجھتا ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا۔

وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "آپ تو ناراض ہو گئے بیگ صاحب، میں تو ایک سیدھی سادی آفر لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔ اگر آپ در پر دستک دینے والی لکشمی کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ ویسے میری یہ پیش کش آئندہ تاریخ تک برقرار رہے گی۔ اگر موڈ بن جائے تو مجھ سے رابطہ کر لیں۔" پھر اس نے اپنا بزنس کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

عبدالکریم کی خباثت اور کمینگی کھل کر سامنے آ گئی تو میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال ابھرا۔ سطح سے گرے ہوئے شخص سے ایک کھیل کھیلنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں اسے گھس کر بہت سی مفید باتیں اُگلوا سکتا تھا۔

میں نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات سجا لئے جیسے اس کی پیش کش پر غور کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی الفاظ کی اداکاری بھی شروع کر دی۔ الجھے ہوئے انداز میں، میں نے اس سے کہا۔

"کریم صاحب! میری سمجھ میں نہیں آ رہا آپ میری خدمات حاصل کرنے میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں جب کہ آپ کا اصل مقصد تو پورا ہو چکا۔ آپ اپنی بیٹی کو گھر لے جا چکے ہیں۔ اب سلیم کے ساتھ عدالت کیا کرتی ہے اس سے آپ کو کیا غرض؟"

وہ زور دیتے ہوئے بولا۔ "غرض ہے نا وکیل صاحب! وہ میرے دیرینہ دشمن کا بیٹا ہے۔ اس کے ساتھ اگر برا ہو گا تو گویا اس کے باپ کے ساتھ برا ہو گا...... اور اس سے مجھے تسکین پہنچے گی۔"

میرا اندازہ صد فی صد درست ثابت ہو رہا تھا۔ وہ برسوں پہلے کے ایک تلخ واقعے کو اس کیس میں گھسیٹ لایا تھا۔ اس بات سے غرض نہیں کہ اس وقت قصور وار کون تھا؟ احمد علی یا کریم لیکن دونوں کے حالیہ رویوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا، عبدالکریم ہی سراسر غلطی پر ہو گا۔ وہ اب احمد علی سے کھلی دشمنی پر اتر آیا تھا۔

اس کے دل کا حال جب اسی کی زبان سے کھلنے لگا تو میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "کیا تھانے دار کو سیٹ کر لینا کافی ثابت نہیں ہوا جو آپ مجھے اپنے ساتھ ملانے کی تگ و دو کے لئے نکلے ہیں؟"

میری دلچسپی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہو گئی۔ وہ خاصا پرانا اور تجربہ کار کھلاڑی معلوم ہوتا تھا لیکن اتفاق سے اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں کتنا بڑا اداکار ہوں۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"بیگ صاحب! پولیس کا کام تھانے تک ہوتا ہے۔ اب معاملہ عدالت میں لگا ہوا ہے اس وقت آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ بجا فرماتے ہیں۔ پولیس کا عملی کام تھانے تک ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ لی ہوئی موٹی رقم کو حلال کرنے کی نیت رکھتے ہوں تو عدالت میں بھی کافی آسانیاں فراہم کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ عدالت میں ان کی پیش کی ہوئی رپورٹ پر ہی کیس کو اٹھایا جاتا ہے لیکن لگتا ہے......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا۔ "گڑے مردے اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"تو آپ نئے مردے گاڑنا چاہتے ہیں!" میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

"ایسی بات نہیں بیگ صاحب!" وہ جھینپ گیا۔ "میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا، تھانے دار کا معاملہ تھانے ہی میں ختم سمجھیں۔ اب تو آپ سے ڈیل ہو گی۔"

میں نے اپنے انداز سے اسے اتنی امید دلا دی کہ وہ دوبارہ اس موضوع پر روانی سے بات کرنے لگا مگر میں تو ایک خاص مقصد کی خاطر یہ کھیل کھیل رہا تھا۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں محسوس کر رہا ہوں، تھانہ انچارج نے آپ کو مایوس کیا ہے!"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔ نتیجہ تو آپ کے سامنے ہی ہے۔"

"کتنی رقم خرچ کی تھی آپ نے؟"

وہ رازداری کا انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "آپ جس طرح دوستانہ انداز میں بات کر رہے ہیں اس میں پردہ داری کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں آپ سے اگر کچھ چھپاؤں گا تو آپ بہتر انداز میں میری مدد نہیں کر سکیں گے۔ تھانہ انچارج نے مجھ سے ایک لاکھ روپے وصول کئے ہیں۔"

"اوہ! اتنی بڑی رقم!" میں نے بے ساختگی کی ایکٹنگ کی۔

"وہ تو دو لاکھ روپے مانگ رہا تھا۔"

"پھر کمی کیسے کر دی؟"

"میرا آئیڈیا اسے پسند آ گیا تھا۔" اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ "کیسا آئیڈیا کریم صاحب؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے تھانے دار کے مطالبے میں کمی کرانے کے لئے اسے ایک تجویز دی تھی۔ میں نے اس سے کہا، ایک لاکھ میں دیتا ہوں، ایک لاکھ وہ احمد علی سے وصول کرے لیکن شرط یہ ہے کہ میرا کام ہونا چاہئے اور احمد علی کو ٹرخا دیا جائے۔"

"میرے خیال میں آپ اچھے کاروباری آدمی نہیں ہیں کریم صاحب!" میں نے اسے گھسنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب دونوں پارٹیاں مساوی رقم پیش کریں گی تو پھر وہ ایک کے ساتھ امتیازی سلوک کیوں کریں گے؟"

وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "میں آپ کے اعتراض سے اتفاق کرتا ہوں لیکن یہ نتیجہ تو اس

صورت میں آنا چاہئے تھا اگر احمد علی سے بھی وہ ایک لاکھ وصول کر لیتے۔ ریکارڈ کے مطابق احمد علی نے پولیس کو ایک پیسہ رشوت کے نام پر نہیں دیا۔ میرا پلڑا پھر بھی بھاری رہا مگر پولیس نے میرے پلے میں چھید ڈال دیئے۔

میں نے اس کے تازہ زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کا تو فرض ہے مدد آپ کی...... اور جو لوگ پولیس سے تعاون پر آمادہ ہوتے ہیں، ان کی وہ بڑی اسپیشل مدد کرتی ہے، جیسا کہ آپ کے ساتھ ہوا!''

وہ میرے ترش الفاظ کو کوئی زود اثر مفید میڈیسن کی طرح نگل گیا اور خیال افروز لہجے میں بولا۔ ''اگر میں تھانے دار کا مطالبہ من وعن پورا کر دیتا تو ہو سکتا ہے، حالات مختلف ہوتے۔ وہ وہی کرتا جو میں چاہتا تھا۔''

''آپ کا خیال سراسر غلط ہے۔'' میں نے اس کی آنکھیں کھولنا ضروری سمجھا۔ ''پولیس دو لاکھ روپے وصول کر کے بھی آپ کی خاطر خواہ مدد نہیں کر سکتی تھی۔ وہ آپ کی فیور میں رپورٹ تیار کر بھی دیتی تو میں اس رپورٹ کی دھجیاں بکھیر دیتا۔ ہر وکیل ایک سا نہیں ہوتا۔ ہاں کچھ وکیل ایسے بھی ہوتے ہیں جو عدالت میں ''منمنانے'' کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ وہ استغاثہ سے اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ اپنے موکل کو بیچ منجدھار چھوڑ کر تنگ گلی سے نکل لیتے ہیں۔''

''اسی لئے تو میں اب آپ کے پاس آیا ہوں۔'' وہ متاثر کن انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

اس نے چند لمحے سوچا پھر واشگاف الفاظ میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آئندہ پیشی پر آپ کوئی ایسا چکر چلائیں کہ سلیم پھنس کر رہ جائے، میں اسے چھوٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔''

اس کے دل کی کدورت الفاظ کا روپ دھار کر زبان سے پھسل رہی تھی۔ میں چوں کہ اس کے ساتھ کھیل رہا تھا اس لئے قدرے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''اس کے چھوٹنے کا بندوبست تو میں کر چکا ہوں۔ البتہ آپ وکیل استغاثہ کی مدد کرتے ہوئے اسے ٹھوس ثبوت فراہم کر دیں تو بات بن سکتی ہے۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آئندہ پیشی پر......''

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''وکیل استغاثہ کو چولہے میں ڈالیں۔ میں اس کی منحوس شکل دیکھنے کو تیار نہیں۔ اس نے پولیس کے ساتھ مل کر مجھے ڈبونے کی پوری کوشش کی ہے۔''

وہ اپنے وکیل کی مخالفت میں بول رہا تھا حالانکہ حقیقت یہ تھی وکیل استغاثہ نے اپنے تئیں پوری کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات کہ میں نے اس کی سعی بار آور نہیں ہونے دی۔

''کریم صاحب!'' میں نے نورین کے والد کو مخاطب کیا۔ ''وکیل استغاثہ نے تو خاصا زور لگایا

ہے۔ آپ اس کی طرف سے اتنے بدگمان کیوں ہیں؟''

وہ نفرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''جس روز کا وعدہ کیا گیا تھا وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ میرے ساتھ کھلی بے ایمانی کی گئی ہے۔ میرے ایک لاکھ بھی گئے اور کچھ حاصل بھی نہیں ہوا۔''

''آپ کس روز کے وعدے کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا لہٰذا وضاحت ضروری تھی۔

وہ ہٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''رات گئے میری تھانے دار سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی اور اس نے وعدہ کیا تھا وہ وکیل استغاثہ کو اچھی طرح سمجھا دے گا۔ اس نے مجھے وکیل استغاثہ کے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے دس ہزار مزید بٹور لئے کہ یہ رقم وکیل صاحب کے کھاتے میں جائے گی۔''

''ایک بات پر میں نے بہت غور کیا کریم صاحب لیکن پھر بھی سمجھ میں نہیں آسکی۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''آپ ہی میری الجھن کو دور کر سکتے ہیں۔''

''میں نہیں جانتا، آپ مجھ سے کیا پوچھنے کا ارادہ رکھتے ہیں!''

''میں بتاتا ہوں۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''جب آپ نے لگ بھگ ایک لاکھ دس ہزار کی بھاری رقم خرچ کی تو پھر آپ کی بیٹی رات بھر حوالات میں کیوں رہی؟''

''آپ کا الجھنا بے سبب نہیں لیکن اس کی ایک خاص وجہ ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار تو رات ہی کو مجھے اجازت دے رہا تھا کہ میں نورین کو اپنے ساتھ لے جاؤں مگر یہ اجازت مشروط تھی لہٰذا نورین کو رات حوالات میں گزارنا پڑی۔''

''مشروط اجازت سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''تھانے دار کا کہنا تھا، پہلے میں رقم کا بندوبست کروں۔ نورین اس کے بعد ہی جا سکے گی۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ آپ پر بھروسا نہیں کر رہا تھا۔''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔''

''اور حالات سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے، آپ رات میں رقم کا بندوبست نہیں کر سکے تھے۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہی حقیقت ہے۔ بس میرے ساتھ کچھ ایسی مجبوری تھی کہ میں فوری طور پر اتنی بڑی رقم کا انتظام نہ کر سکا۔ بینک صبح سے پہلے کھل نہیں سکتا تھا اور جو صاحب حیثیت افراد مجھے راتوں رات یہ رقم فراہم کر سکتے تھے، میں انہیں اس راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا......''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر ذرا متوقف ہوا، ایک گہری سانس کھینچی اور بتانے لگا۔

''...... اس لئے میں رات میں نورین کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکا۔ ابھی عدالت آنے سے

پہلے میں نے وہ رقم بینک سے نکلوا کر تھانے دار کو پہنچائی ہے۔ البتہ وکیل استغاثہ والے دس ہزار میں نے رات ہی میں ادا کر دیئے تھے جس کے بدلے میں میری بیٹی نے حوالات میں یہ رات بہت آرام وسکون سے گزاری ہے۔ کہنے کو وہ حوالات کا کمرا تھا لیکن وہاں ہر سہولت مہیا کر دی گئی تھی۔ فوم والے میٹرس سے لے کر ٹھنڈے پانی تک سب کچھ تھانے دار نے فراہم کر دیا۔''

اس کی بات کے اختتام پر میں نے کہا۔ ''اسے آپ سے ایک لاکھ روپے ملنے کی امید تھی اور یہ امید قطعاً غلط نہیں تھی۔ آپ نے حسب وعدہ اور اس کی حسب توقع یہ رقم فراہم بھی کر دی۔ تھانے دار اسی لئے آپ کی بیٹی کو آسانیاں فراہم کر رہا تھا بلکہ مجھے یقین ہے، اگر آپ ٹیلی فون کی فرمائش کرتے تو وہ بھی فراہم کرنے میں تھانے دار کوئی حیل وحجت نہ کرتا۔ جیل اور تھانہ دو ایسے مقامات ہیں جو صرف غریبوں کے لئے خوف ناک اور تکلیف دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ صاحب ثروت افراد اگر اتفاق سے ان مقامات پر قیام پذیر ہو بھی جائیں تو ان کے آرام وآسائش میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں بڑا آزادانہ اور کمفرٹ ایبل ماحول مہیا کر دیا جاتا ہے۔ جیل میں مقیم بعض صاحب ثروت شوقین افراد کے متعلق تو یہاں تک سننے میں آتا ہے کہ ان کی فرمائش پر وہاں مجرا بھی منعقد کرایا جاتا ہے جس میں شہر کی چھوٹی رقاصائیں شمولیت کو باعث افتخار سمجھتی ہیں اور دوڑ دوڑ کر ان مہمانوں کی دل لبھائی کا سامان کرتی ہیں۔ خیر......'' میں نے ایک طویل سانس کھینچی اور بات کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو یقین ہے، وکیل استغاثہ کے نام پر لئے گئے دس ہزار بھی تھانے دار کی جیب میں گئے ہوں گے۔''

''اب لعنت بھیج دی ہے میں نے ان لوگوں پر اور اس رقم پر۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''جیب سے نکلا ہوا پیسہ کبھی واپس نہیں آتا اور خاص طور پر ایسی ادائیگی جس کا کوئی ثبوت، کوئی رسید بھی ہاتھ میں نہ ہو، اس کی واپسی کی توقع کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں لیکن......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ ''اگرچہ ایک لاکھ دس ہزار کوئی معمولی رقم نہیں ہے لیکن میں اسے ہاتھوں کا میل سمجھتا ہوں۔ میرے ہاتھ سلامت اور مضبوط رہیں گے تو میں اس سے کئی گنا کما لوں گا...... اور میرے ان ہاتھوں کو مضبوطی آپ دیں گے۔''

''وہ کیسے کریم صاحب؟'' میں نے میز پر پھیلے ہوئے اس کے ہاتھوں کو حیرت سے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''آپ آئندہ پیشی پر اس کیس کو میرے حسب منشا ٹوئسٹ دیں گے۔''

''آپ کی فرمائش خاصی مشکل ہے اور تقریباً ناممکن بھی......'' میں نے کمزور اور اجتناب کی اداکاری کی۔

وہ اپنی جیب سے ایک معروف بینک کی چیک بک نکالنے کے بعد بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ آپ ایک ذہین اور تجربہ کار وکیل ہیں۔'' وہ

بھرپور قسم کی بٹرنگ کے موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ ''ذہین لوگوں کی ڈکشنری میں ناممکن کا لفظ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذہانت کو استعمال میں لا کر ناممکن کو ممکن کر دکھاتے ہیں۔ مجھے تو قوی یقین ہے......''

اس نے رک کر میری آنکھوں میں دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ ذاتی طور پر میری فرمائش کے حوالے سے اس کیس میں دلچسپی لیں تو کیس کا پاسا پلٹنا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا۔''

پھر وہ گردن جھکا کر چیک بک میں کچھ لکھنے لگا۔ میں اس خود فریب شخص کے بارے میں سوچتے ہوئے افسوس کرنے لگا۔ میرے خیال میں وہ ایک غلط جگہ پر آ گیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور لالچی وکیل ہوتا تو نتیجے کی پروا کئے بغیر یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ جس طرح ایک ہاتھ کی تمام انگلیاں برابر نہیں ہوتیں بالکل اسی طرح کسی بھی پیشے سے منسلک تمام افراد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ وکالت کے شعبے میں بھی بعض ایسے وکیلوں کا ثبوت ملتا ہے جو انصاف اور اس کے تقاضوں سے بے پروا صرف اور صرف اپنی تجوری بھرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان کے موکل کے ساتھ کیا پیش آ رہا ہے۔ وہ بعض اوقات کسی تگڑے فائدے کے لئے مخالف پارٹی سے مل کر اپنے موکل کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ شاید عبدالکریم بھی مجھے کوئی ایسا ہی وکیل سمجھ رہا تھا۔ لیکن میں اسے جو ہاتھ دکھانے والا تھا وہ اسے مدتوں فراموش نہ کر پاتا۔

اس نے چیک بک پر کارروائی مکمل کی اور ایک چیک اس میں سے پھاڑ کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! میں نے چیک کی دونوں جانب دستخط کر دیئے ہیں لیکن رقم کا اندراج نہیں کیا۔ یہ ایک بلینک چیک ہے آپ اپنی مرضی سے اس میں رقم بھر سکتے ہیں۔ ویسے اتنا بتا دوں میرے اس اکاؤنٹ میں کم وبیش پانچ لاکھ روپے موجود ہوں گے۔ اگر آپ نے میرے حسب منشا کام کر دیا تو یہ ہماری دوستی کی ابتدا بھی ہوگی۔ آپ ہمیشہ میری دوستی پر فخر کریں گے بیگ صاحب!''

میں نے بڑی توجہ سے اس کے چہرے پر جامد تاثرات کا جائزہ لیا پھر اس کے ہاتھ سے چیک لے لیا۔ وہ واقعی ایک دستخط شدہ بلینک چیک تھا۔ میں نے اپنی اداکاری کو آخری ٹچ دیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے وہ چیک اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا۔ پھر اس کی تسلی بہ الفاظ دیگر خوش فہمی کی خاطر کہا۔

''میں آپ کے کام آنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''مجھے آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔''

''اللہ بہتر کرے گا!''

میں نے دانستہ اسے مبہم جوابات دیئے تھے تا کہ بعد میں پکڑ سے محفوظ رہوں۔ ظاہر ہے مجھے

اس کا کام تو کرنا ہی نہیں تھا لہٰذا وہ چیک میرے لئے کاغذ کے ایک پُرزے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

عبدالکریم اس کاغذ کے پُرزے کی جانب میری توجہ مبذول کراتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ اس قیمتی چیک کو کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیں۔ یوں کھلی دراز میں چھوڑنا مناسب نہیں۔ اگر کسی کے ہاتھ لگ گیا تو یہ رقم اس کی ہو جائے گی۔''

میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''آپ اس سلسلے میں بالکل پریشان نہ ہوں۔ آپ نے یہ چیک مجھے دیا ہے۔ ویسے اتنا بتا دوں کہ آج تک میرے چیمبر سے ایک پنسل تک غائب نہیں ہوئی، درازوں میں رکھی اشیاء تو بہت دور کی بات ہے۔ میں بہت ہی پُراعتماد فضا میں کام کرنے کا عادی ہوں۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

❂❂❂

جن لوگوں کے پاس بے تحاشا دولت ہوتی ہے، وہ ہر کام اسی طاقت کے بل پر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں جائز ناجائز کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ وہ اپنے فرائض سے یک سر غافل ہو جاتے ہیں۔ جب بھی ان کی کوتاہیوں کے طفیل کوئی مسئلہ سر اٹھا کر سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنی دولت کے اثر سے اس مسئلے کا سر کچلنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ منصف اعلیٰ تو کوئی اور ہے۔ ظلم اور زیادتی ایک حد تک ہی روا رکھے جا سکتے ہیں۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب آفاقی قانون حرکت میں آتا ہے تو دولت کے انبار حقیر ذروں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ انسان بہت سبق فراموش واقع ہوا ہے۔ وہ ماضی کے تلخ تجربات سے نصیحت پکڑنے کی بجائے نئے تجربات کرنا چاہتا ہے اور اسے خوش فہمی رہتی ہے کہ اب ایسا نہیں ہو گا۔ اگرچہ ویسا نہیں ہوتا مگر اس سے بھی کہیں زیادہ برا ہو جاتا ہے!

آئندہ پیشی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ اس دوران میں دو مرتبہ احمد علی مجھ سے ملنے آیا۔ ایک بار سلیم اس کے ساتھ تھا۔ وہ میرے بے حد شکر گزار تھے۔ میں نے ان سے ہر قسم کی بات کی مگر عبدالکریم کی ہینڈسم آفر کا مطلق ذکر نہ کیا۔ میں انہیں خوامخواہ کسی وہم میں مبتلا کر کے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے عبدالکریم اور اس کی آفر کو کنسیڈر ہی نہیں کرنا تھا پھر بے کار کے قصے کہانیوں کا کیا فائدہ!

وہ ایک سادہ اور آسان کیس تھا۔ اسے بار بار اسٹڈی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے پورا یقین تھا، آئندہ پیشی پر وکیل استغاثہ کو منہ کی کھانا پڑے گی اور مجسٹریٹ کیس خارج کر دے گا۔ میں خاصا مطمئن اور پُرامید تھا لہٰذا میں اپنے دیگر کیسوں پر توجہ دینے لگا۔

مقررہ دن میں ایک مرتبہ پھر عدالت میں موجود تھا۔ اس کیس سے متعلق تمام افراد بھی حاضر

تھے۔ گزشتہ پیشی پر مجسٹریٹ نے مجھے یہ فریضہ سونپا تھا کہ ملزم سلیم کو عدالت میں مجھے پیش کرنا ہو گا۔ میں نے اپنا یہ فرض نبھا دیا لیکن وکیل استغاثہ اس سلسلے میں ناکام رہا۔ مجسٹریٹ نے اسے جو ثبوت فراہم کرنے کی تاکید کی تھی وہ اس ضمن میں کوئی پیش رفت نہ کر سکا۔

اس موقع پر عبدالکریم بڑی امید بھری نظر سے مجھے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے تگڑے چیک کی قوت کا چمتکار دیکھنا چاہتا تھا۔ جب مجسٹریٹ وکیل استغاثہ سے مخاطب ہوا تو عبدالکریم بہت پریشانی میں گھرا نظر آنے لگا۔ یہ بہت ہی نازک اور اعصاب شکن مرحلہ تھا۔

مجسٹریٹ نے جذبات سے عاری لہجے میں وکیل استغاثہ سے کہا۔ ''اب آپ کیا فرماتے ہیں۔ موجودہ صورتِ حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ عدالت اس کیس کو ڈسمس کر دے۔ آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے کھمبا نوچنے کی کوشش کی۔ ''اگر معزز عدالت ایک ہفتے کی مزید مہلت دے دے تو اس سلسلے میں کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''گزشتہ ایک ہفتے میں آپ کی کارکردگی کیا رہی ہے؟'' مجسٹریٹ نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

وہ لنگڑا بہانہ بناتے ہوئے بولا۔ ''پولیس کو بعض اوقات کسی معاملے کی چھان بین کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اس لئے تاخیر ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ لہٰذا میں ایک مرتبہ پھر معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ کیس کو خارج کرنے کے سلسلے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔''

''جلد بازی!'' مجسٹریٹ نے برہمی سے کہا۔ ''آپ اسے جلد بازی کہہ رہے ہیں؟''

اس سوال کا وکیل استغاثہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بادِ مخالف کا اندازہ لگا چکا تھا۔ مجسٹریٹ کی ناراضی سب پر عیاں تھی لہٰذا اس نے مزید کوئی حربہ نہ آزمانے کا فیصلہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ یہ رویہ استغاثہ کے ہتھیار ڈالنے کے مترادف تھا۔

مجسٹریٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟''

''یور آنر! میں صرف اتنا کہوں گا کہ موجودہ حالات کی روشنی میں جائز فیصلہ کرتے ہوئے انصاف کے تقاضے پورے کئے جائیں۔ ایک ہفتے کی مزید مہلت تو کیا اگر یہ مہلت ایک سال پر بھی محیط ہو جائے تو نتائج میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔ سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے کے مصداق استغاثہ چاہے کتنا بھی زور لگا لے، اس کیس کو اپنے حق میں ثابت نہیں کر سکتا۔ میں استغاثہ کے موقف کا بھانڈا پھوڑ چکا ہوں۔ اب اس میں باقی کچھ نہیں بچا اور میرے فاضل دوست نے پولیس کو درپیش مسائل کا جو راگ الاپا ہے اس میں سُر ہے نہ ہی کوئی سنگیت!''

میں چند لمحات کے لئے خاموش ہوا۔ وکیل استغاثہ اور انکوائری افسر بڑی کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میری نظر عبدالکریم پر پڑی تو اس کا حال ان دنوں سے بھی زیادہ برا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات خیمہ زن تھے کہ وہ عدالت کے کمرے سے باہر نکلتے ہی مجھے شوٹ

کر دے گا۔ میں اس کی فرمائش کے خلاف مصروفِ عمل تھا۔ جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔

میں نے حاضرینِ عدالت پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور مجسٹریٹ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! وکیل استغاثہ نے فرمایا ہے بعض اوقات پولیس کو کسی معاملے کی چھان بین کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ اگر ہم ان کی بات پر صاد کر لیں تو پھر یہ بات بھی ماننا ہو گی کہ وہ جس پولیس کا ذکر کر رہے ہیں وہ ہرگز ہرگز یہ پولیس نہیں جس نے جائے وقوعہ سے نورین اور میرے موکل سلیم کو پکڑا تھا۔''

میں نے سانس لینے کی خاطر ذرا توقف کیا پھر اپنے دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! استغاثہ کی پشت پر جس پولیس کا ہاتھ ہے اس کی مستعدی تو مسلمہ ہے، اس نے اپنی کارکردگی کا بیّن ثبوت دیا ہے بلکہ نہایت ہی مختصر وقت میں اس نے ملزم سے متعلق بہت سی ایسی تحقیقات بھی کر لیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اب تو انہیں کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔ معزز عدالت نے تو پولیس کے دائر کردہ دعوؤں کے ٹھوس ثبوت مانگے تھے۔ اگر استغاثہ وہ ثبوت عدالت میں پیش نہیں کر سکا تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، اس کا دعویٰ جھوٹا اور مبنی بر سازش ہے۔ میرے موکل کو ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا۔ حوالات میں گزری ہوئی ایک رات ابھی تک اس کے حواس پر مسلط ہے۔ وہ بہت ٹینشن میں ہے۔ اس کے احساس کو پہنچنے والی تکلیف کا مداوا تو نہیں ہو سکتا لیکن اس کی عزت کو جس بری طرح عدالت کی نذر کر کے اچھالا گیا ہے وہ ہمدردی اور توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔''

مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔ ''معزز عدالت اس کیس کے ملزم سلیم کو باعزت بری کرتے ہوئے کیس کو خارج کرتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں معزز عدالت کے اس منصفانہ اور عادلانہ فیصلے کا خیر مقدم کرتا ہوں جناب۔'' میں نے احترام سے لبریز لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے ساتھ ہی فاضل عدالت سے ایک چھوٹی سی درخواست بھی کرنا چاہوں گا۔''

''کہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' مجسٹریٹ نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور گمبھیر آواز میں کہا۔ ''جناب عالی! میرے موکل کو گزشتہ ایک ہفتے کے دوران جس اذیت سے گزرنا پڑا اگرچہ اس کا صحیح ازالہ تو ممکن نہیں لیکن اس موقع پر میں چاہوں گا کہ استغاثہ اسے ایک مناسب ہرجانہ ادا کرے تا کہ اس کی اشک شوئی ہو سکے۔''

اتنا کہہ کر میں متوقف ہوا پھر ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''کسی شخص کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسی دوسرے شخص کی عزت پر حملہ کرے۔ عزت دار کے پاس سب سے قیمتی سرمایہ اس کی عزت ہی ہوتی ہے۔ میرے موکل کی عزتِ نفس کو بہت ٹھیس پہنچی

ہے۔ لہٰذا معزز عدالت کو چاہئے کہ وہ ملزم سلیم کو جائز ہرجانہ دلوائے۔''

مجسٹریٹ تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران میں، میں نے محسوس کیا، عبدالکریم مجھ سے بات کرنے کے لئے بہت بے قرار تھا لیکن ظاہر ہے وہ بھری عدالت میں اپنا دکھڑا رونے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی جو غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں ان کے ثمرات سامنے تھے۔ میں اسے کھولانے کے لئے مسلسل نظرانداز کر رہا تھا۔

مجسٹریٹ کیس کو خارج اور سلیم کو باعزت بری کرنے کا فیصلہ تو سنا چکا تھا، اب اس نے میری فرمائش بھی پوری کر دی اور یہ فرمائش سے زیادہ انصاف کا تقاضا تھا۔ اس نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ عدالت استغاثہ کو پابند کرتی ہے کہ وہ مسٹر سلیم کو پہنچنے والی ذہنی اذیت کے عوض بطور مبلغ دس ہزار روپے سکہ رائج الوقت حکومت پاکستان ادا کرے۔ ادائیگی کی یہ کارروائی عدالتی وقت کے خاتمے سے پہلے ہو جانا چاہئے۔''

ظاہر ہے رقم مذکور عبدالکریم کی جیب ہی سے نکلنا تھی۔ وہ پہلے ہی مجھ پر بہت ادھار کھائے بیٹا تھا۔ وکیل استغاثہ نے عبدالکریم سے نگاہوں کا تبادلہ کیا اور مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''جناب عالی! فوری طور پر تو رقم کا بندوبست کرنا ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں تھوڑی مہلت درکار ہو گی۔''

مجسٹریٹ نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی اور قدرے خفگی سے بولا۔ ''عدالت کا وقت ختم ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ عبدالکریم جیسے بزنس مین کے لئے یہ رقم فراہم کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ لہٰذا کسی مہلت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔''

مجسٹریٹ کے اس حتمی فیصلے کے بعد کسی اعتراض یا جواز کی جگہ نہیں بچی تھی۔ مخالف پارٹی کے تمام ارکان کے چہرے لٹک گئے۔ انہیں شکستِ فاش کا سامنا ہوا تھا۔ میں نے ایک ایک کی صورت دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرانا ضروری سمجھا۔

❂❂❂

ہرجانے کی ادائیگی میں عبدالکریم اس طرح مصروف ہوا کہ اسے مجھ سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس میں ایک ہاتھ میرے رویے کا بھی تھا۔ میں نے اس دوران میں اسے ایک ذرا لفٹ نہ کرائی۔ مگر شام کو وہ میرے دفتر میں موجود تھا اور خاصے خطرناک تیوروں کے ساتھ! میں نے اس کی آمد کی اطلاع پاتے ہی فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''مسٹر بیگ! تم نے یہ بہت غلط حرکت کی ہے۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

اس کا انداز توہین آمیز تھا تاہم میں نے تحمل کا مظاہرہ کیا اور اخلاقیات کا تقاضا نبھاتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔ ''آپ تشریف رکھیں اور بتائیں آپ کی برہمی کی وجہ کیا ہے؟''

"وجہ!" وہ پھنکارا تاہم ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ بھی گیا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں، آپ نے مجھے کتنا بڑا دھوکا دیا ہے؟"

میں نے معصومیت کی اداکاری کی اور سادگی سے کہا۔ "واقعی مجھے معلوم نہیں، آپ کس دھوکے اور حرکت کی بات کر رہے ہیں۔"

"اب اتنا انجان اور معصوم بننے کی بھی ضرورت نہیں۔" وہ خون خوار نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "آپ ایک فراڈ وکیل ہیں۔ میں نے جس مقصد کی خاطر آپ کو ایک بلینک چیک دیا تھا آپ نے اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کی...... بلکہ اس کے خلاف ہی عمل کیا ہے۔"

"اچھا اچھا......" میں نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ چیک کے حوالے سے اس کام کا ذکر کر رہے ہیں۔ دیکھو بھائی، یہ اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ آپ کا خیال بلکہ غلط فہمی یہ ہے کہ میں نے آپ کا کام کرنے کی کوشش نہیں کی جب کہ میں اس کے برخلاف رائے رکھتا ہوں۔ میں نے آپ سے کوشش کے وعدہ پر وہ چیک وصول کیا تھا اور اس وعدے کے مطابق میں نے اپنی بساط بھر کی کوشش کی ہے لیکن حقائق اظہر من الشمس ہیں۔ میں افسوس کے ساتھ کہوں گا کہ مجھے اس کوشش میں ناکامیابی ہوئی۔"

"میں آپ کی اس سادگی اور معصومیت سے متاثر ہونے والا نہیں۔" وہ دھاڑا۔ "آپ نے مجھے چیٹ کیا ہے۔ میں تم کو اس حرکت کا مزہ ضرور چکھاؤں گا۔"

وہ غصے کی شدت میں کبھی مجھے آپ اور کبھی تم سے مخاطب کر رہا تھا۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"کریم صاحب! آپ اتنا تاؤ کیوں کھا رہے ہیں۔ اگر آپ کا کام آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہو سکا تو اپنا چیک واپس لے جائیں۔ میں نے اس میں رقم بھری ہے اور نہ ہی اسے کیش کرانے کی کوشش کی ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ بات تو میں نے بینک سے معلوم کر لی ہے۔ میں وہ چیک واپس تو لے جاؤں گا لیکن اس فاؤل ڈیل کی سزا تمہیں ضرور دوں گا۔ تم نہیں جانتے عبدالکریم کی دشمنی کتنی سنگین ہے۔ تمہیں بہت جلد پچھتانا پڑے گا۔ میں اس واقعے کو بھولوں گا نہیں۔"

میں نے دراز میں سے بلینک چیک نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور اس کی روح فنا کرنے کی غرض سے کہا۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں...... ہاں تمہیں معلوم نہیں اس چیمبر کے ایک خفیہ گوشے میں، میں نے ایک حساس ٹیپ ریکارڈ چھپا رکھا ہے جس کے ریکارڈنگ مکینزم کو میں نے ایک سوئچ سے مربوط کر رکھا ہے اور وہ سوئچ میری میز کے نیچے نصب ہے۔ تم نے جیسے ہی دھمکی آمیز گفتگو شروع کی میں نے وہ سوئچ آن کر دیا تھا۔ تمہاری تمام باتیں ریکارڈ ہو چکی ہیں۔ اب تم خود اندازہ لگا لو، اگر کل

کلاں مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو تم کہاں کھڑے نظر آؤ گے؟" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد گمبھیر آواز میں دہرایا۔ "تھانے میں؟ کسی عدالت کے کٹہرے میں؟ یا پھر پھانسی کے تختے پر؟ میں یہ ٹیپ پہلی فرصت میں محفوظ ہاتھوں میں پہنچا دوں گا۔"

اس کا سارا غصہ اور تنتنا جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ اس نے اضطراری انداز میں اپنے ہاتھ کی پشت سے پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو صاف کیا پھر بلینک چیک کے پرزے پرزے کر کے میری طرف اچھال دیئے اور اٹھ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"تم سے نمٹنے کے لئے مجھے کوئی دوسرا ہی راستہ نکالنا ہوگا۔"

"تمہارا یہ جملہ بھی ریکارڈ پر آ چکا ہے مسٹر کریم!"

اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور پاؤں پٹختے ہوئے میرے دفتر سے نکل گیا۔

میں اس کی حالت پر اظہارِ افسوس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ ریکارڈنگ والی بات میں نے محض اسے ڈرانے کے لئے کہی تھی ورنہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے امید تھی جب اس کا غصہ اتر جائے گا اور گھر پہنچ کر وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے صورت حال پر غور کرے گا تو کسی قسم کی انتقامی کارروائی کے بارے میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کرے گا۔ جس طرح سانپ کو بے ضرر بنانے کے لئے اس کا زہر نکال لیا جاتا ہے بالکل اسی طرح میں نے عبدالکریم کو حدود میں رکھنے کے لئے وہ چال چلی تھی۔ گویا میں نے اسے کیل کر رکھ دیا تھا۔

ایک وکیل کے دفتر میں بیٹھ کر اسے خطرناک نتائج کی دھمکی دینا پھر اس دھمکی کا ریکارڈ ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ یہ بات تو صرف میں جانتا تھا کہ ریکارڈنگ والی بات محض ڈراوا تھی ورنہ عبدالکریم تو اسے ایک حقیقت ہی سمجھ رہا تھا اور اس کی بدھی میں اتنی عقل تو ضرور ہوگی کہ اس "حقیقت" کا ادراک ہونے کے بعد وہ کوئی غلط قدم اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

بہ ظاہر یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے لیکن چند روز بعد اس کا ایک نیا رخ سامنے آیا۔ عبدالکریم کا مجھ پر تو کوئی بس نہیں چل سکتا تھا لہٰذا اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کے لئے اس نے احمد علی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کے بھیجے ہوئے چند افراد نے احمد علی کے کاسمیٹکس اسٹور پر بلوا کر کے خوب توڑ پھوڑ مچائی۔

اس موقع پر سلیم اور اسٹور کے ملازم نے بہت ہمت دکھائی اور حملہ آوروں میں سے دو افراد کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ فوراً موقع پر پہنچ گئی۔ اس واقعے کے نصف درجن سے زیادہ عینی شاہد موجود تھے لہٰذا پولیس کے لئے کسی گڑبڑ کی گنجائش نہ رہی اور قابو آئے ہوئے دو افراد نے لات جوتا کھانے کے بعد عبدالکریم کا نام اگل دیا۔

عبدالکریم کو ایک مرتبہ پھر پولیس کا سامنا کرنا پڑا تاہم یہ معاملہ عدالت تک نہ پہنچ سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ احمد علی خود کسی نئی مقدمے بازی کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ ایک پُرامن اور صلح جو

انسان تھا۔ اس نے اس شرط پر اپنے مخالفین کو معاف کر دیا کہ آئندہ اس کے ساتھ کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری وجہ عبدالکریم کا ''پیسہ پھینک تماشا دیکھ'' والا کردار تھا۔ اسے ایک مرتبہ پھر پولیس والوں کی جیب کرنا پڑی چنانچہ پولیس نے خصوصی کردار ادا کر کے دونوں پارٹیوں میں صلح صفائی کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

اس دشمنی میں تمام تر نقصان عبدالکریم کو اٹھانا پڑا کیونکہ وہ منفی خیالات کا حامل تھا۔ اس کا لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ ضائع ہو گیا۔ کیونکہ کاسمیٹکس اسٹور کی توڑ پھوڑ کے سلسلے میں بھی اسے بھاری ہرجانہ ادا کرنا پڑا تھا۔ بے عزتی الگ ہوئی۔

ساری بات طرزِ فکر کی ہوتی ہے۔ تعمیری خیالات رکھنے والا انسان ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے جب کہ منفی اور تخریبی سوچ نقصان کا باعث بنتی ہے۔ اس جنگ میں عبدالکریم نے بہت کچھ جھونکا مگر حاصل جمع صفر کے برابر بلکہ مائنس میں ظاہر ہوا جب کہ احمد علی سراسر فائدے میں رہا۔ اس کی سوچ مثبت اور طرزِ عمل تعمیری تھا۔

یہ معمولی سا نکتہ انسان کی سمجھ میں آ جائے تو پھر کمی کس بات کی ہے!

✿✿✿

چلمن نشین

بعض لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ ان کے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے انہیں کسی کی پروا نہ ہو۔ ان کے انداز میں ایک قسم کی رعونت اور فرعونیت پائی جاتی ہے۔ ایسے افراد میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی شخصی عیب میں مبتلا ہوتے ہیں، گویا وہ ایک نفسیاتی پیچیدگی کے تحت دوسروں کو خود سے کم تر سمجھنے لگتے ہیں اور نظر اندازی کا رویہ اپنا لیتے ہیں۔ اس عورت کا شمار بھی متذکرہ بالا افراد ہی میں ہوتا تھا۔

سب چہرے اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ کہنا تو نہیں چاہئے تاہم اس عورت کی صورت واجبیت سے خاصی گری ہوئی تھی۔ دولت کی لیپا پوتی سے اس نے اپنی شخصیت کی خامی کو چھپانے کی پوری سعی کر رکھی تھی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں حاصل کر پائی تھی۔ اس کے صاحب ثروت ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ خوشبو میں لپٹی ہوئی میرے دفتر میں داخل ہوئی اور چاروں جانب ایک تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد پوچھا۔

''آپ کس قسم کے وکیل ہیں؟''

یہ ایک خلافِ معمول اور عجیب و غریب سوال تھا۔ اس خاتون نے رسمی علیک سلیک کو غیر ضروری جانتے ہوئے براہِ راست مجھے کمرۂ امتحان میں بٹھا دیا تھا۔ ظاہر ہے، اس کا یہ انداز کسی بھی طور مستحسن نہیں گردانا جا سکتا تھا لہٰذا مجھے بھی ناگوار محسوس ہوا۔ میں نے اسی کا لہجہ لوٹاتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کے نزدیک وکلا کی کتنی اقسام ہیں؟''

میرے الفاظ سے ہویدا برہمی کو اس نے فوراً محسوس کر لیا۔ ''اوہ!'' اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو برا مان گئے۔''

''کسی نارمل انسان کو اسی رویے کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بری بات پر برہم اور اچھی بات پر خوش ہونا عین فطری عمل ہے۔''

''آئی ایم رئیلی سوری!'' اس نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا جس میں خجالت دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔'' میں نے اپنے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔ ''اور مجھے بتائیں، آپ کو کس قسم کا وکیل درکار ہے؟''

وہ ایک قدم آگے بڑھی اور پیور لیدر اٹالین بیگ کو میز پر رکھنے کے بعد ایک کرسی سنبھال لی

پھر اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے آپ مجھ سے ناراض ہو گئے!“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔ ”مارکیٹ میں بیٹھا ہوں۔ پبلک ڈیلنگ سے واسطہ ہے، ہر قسم کے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”وکیل کے پاس لوگ وکالت کروانے آتے ہیں۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”مجھے بھی ایک کیس کے سلسلے میں آپ کی خدمات درکار ہیں۔“

”لیکن ابھی تک تو میری قسم کا تعین نہیں ہوا۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں دراصل یہ جاننا چاہتی تھی، آپ کس قسم کے کیس ڈیل کرتے ہیں۔ دیوانی یا فوج داری؟‘

”دونوں طرح کے۔“ میں نے کہا۔ ”خصوصاً فوج داری اور عموماً دیوانی۔“ آپ کے کیس کی نوعیت کیا ہے؟“

”فوج داری۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ ایک قتل کا کیس ہے جس میں پولیس نے ایک بے گناہ کو اندر کر رکھا ہے۔“

”اندر مطلب؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے، حوالات میں۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”اور اگر اس کی ضمانت کے لئے چارہ جوئی نہ کی گئی تو وہ جوڈیشل ریمانڈ پر سیدھا جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”کیس کی تفصیلات کیا ہیں؟“

اس نے کیس کی تفصیلات سے پہلے اپنے بارے میں بتانا ضروری سمجھا۔ اس عورت کا نام فیروزہ معلوم ہوا۔ عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہو گی۔ شکل و صورت کا بار بار ذکر کرنا مناسب نہیں۔ وہ سوسائٹی آفس کے نزدیک ایک بنگلے میں رہتی تھی۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ بوڑھی والدہ اور چھوٹا بھائی اس کے ساتھ رہتے تھے۔ ذرائع آمدنی میں دو فلیٹ تھے جن کا اچھا خاصا کرایہ آ جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اندرون سندھ میں اس کے والد کی چالیس ایکڑ زرعی زمین تھی جس میں فش فارم بھی بنا ہوا تھا۔ فارم اور زمین سے اچھی خاصی رقم آ جاتی تھی۔ اس کے انتظام و انصرام کے لئے اس نے ایک قابل اعتماد مزارع رکھا ہوا تھا جو ہر ماہ کراچی آ کر اپنی رپورٹ پیش کرتا۔ اپنے تعارف سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بتایا۔

”سعید بے گناہ ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں، یہ قتل اس نے نہیں کیا۔ وہ تو اتنا رقیق القلب ہے کہ ایک چیونٹی کو مارنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ فریدہ کا قتل کوئی اور ہی کہانی معلوم ہوتی ہے۔“

فریدہ نامی مقتول سعید کی گھریلو ملازمہ تھی جس کے قتل کے الزام میں وہ اس وقت تھانے میں

بند تھا۔ میں نے فیروزہ کی اس کیس میں دلچسپی کے پیش نظر کہا۔ ”آپ ملزم سعید کی کوئی قریبی رشتے دار ہیں؟“

اس نے نفی میں جواب دیا۔ ”سعید سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔“

”پھر آپ مقتول سے کوئی تعلق رکھتی ہوں گی!“

”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ اسے انسانی ہمدردی کہہ لیں۔ میں چاہتی ہوں، سعید اس کیس میں باعزت بری ہو جائے۔“

”انسانی ہمدردی آج کل عنقا ہوتی جا رہی ہے۔“ میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو دیکھ کر لگتا ہے، اس دنیا میں ابھی انسانیت باقی ہے۔ بہرحال......“ میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو یہ کیسے یقین ہے کہ ملزم سعید بے گناہ ہے؟“

”میرا دل اس کی گواہی دے رہا ہے۔“ فیروزہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”خاتون! عدالت دل کی آواز پر کان نہیں دھرتی۔ وہاں ملزم کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے ٹھوس دلائل اور ناقابل تردید ثبوت پیش کرنا پڑتے ہیں۔“

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اسی لئے تو میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ میں پیسہ خرچ کروں گی، آپ ثبوت اور دلائل تلاش کریں۔ اس طرح مل جل کر ہم سعید کو بچا لیں گے۔ میں آپ کی فیس کے ساتھ ساتھ تمام عدالتی اخراجات اٹھانے کو تیار ہوں۔“

”ظاہر ہے، یہ سب تو آپ کو کرنا ہی ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بات بتا دوں، میں اپنی فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔“

”ایڈوانس اور کیش ہی دوں گی۔“ وہ اپنا قیمتی بیگ کھولتے ہوئے بولی پھر میری فیس کے بارے میں استفسار کیا۔

میں نے اسے رقم بتائی۔ اس نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی میں سے کچھ رقم نکال کر میری جانب بڑھا دی اور کہا۔ ”آپ کی فیس کے علاوہ میں تین ہزار روپے اضافی دے رہی ہوں۔ یہ رقم عدالت کے ابتدائی اخراجات کے لئے ہے۔ مزید ضرورت پڑی تو مجھے بتا دیجئے گا۔“ وہ اتنا کہہ کر رکی پھر رقم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ گن لیں!“

میں اس کے ہاتھ ہی میں رقم کو گن چکا تھا لہٰذا میں نے ان نوٹوں کو اپنی میز کی دراز میں ڈالا اور فیس کی وصولی کی رسید لکھ کر فیروزہ کو دے دی۔

اس نے الجھن آمیز حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”آپ بہت ہوشیار وکیل ہیں۔ لگتا ہے، آپ اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیتے ہوں گے!“

اس کا اشارہ رقم کے شمار کی طرف تھا۔ میں نے کہا۔ ''چڑیا اُڑتی ہو یا بیٹھی ہوئی ہو، اس کے پروں کی تعداد میں کوئی فرق نہیں آتا اور جانوروں کا علم اتنی ترقی کر چکا ہے کہ ہر پرندے کے پروں کو شمار کیا جاسکتا ہے، تھوڑی کمی بیشی کے ساتھ۔'' میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ''بہرحال، جب آپ گڈی میں سے نکالنے سے قبل رقم کو گن رہی تھیں تو یہ نیک کام میں نے آپ کے ساتھ ہی کرلیا تھا۔''

وہ مجھ سے خاصی متاثر نظر آنے لگی۔ امید بھرے لہجے میں بولی۔ ''مجھے یقین ہے، آپ سعید کو ضرور رہا کروالیں گے۔ میں بالکل صحیح جگہ پر آئی ہوں۔''

''میں ہاتھ میں لئے ہوئے ہر کیس کو جیتنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''بیگ صاحب! اس کیس کے سلسلے میں آپ کو ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہوگا۔'' میں نے کچھ پوچھے بغیر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو اس نے کہا۔ ''میں بی ہائنڈ دی سین رہنا چاہتی ہوں۔ سعید کو کسی طرح معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں اس کی رہائی کے لئے کوئی چارہ جوئی کررہی ہوں۔''

''آپ اگر اس سے سچی ہمدردی کررہی ہیں تو سامنے آنے میں کیا قباحت ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ مجھ سے پوچھ سکتا ہے، میں کس کے ایما پر اس کی وکالت کررہا ہوں۔ اسے جواب دینا بلکہ مطمئن کرنا ضروری ہوگا۔''

''اس کے اطمینان کے لئے آپ کوئی بھی حربہ استعمال کرسکتے ہیں، کوئی محفوظ چال چل سکتے ہیں۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''آپ کسی رفاہی ادارے کا حوالہ دے سکتے ہیں جو انسانی ہمدردی کے ناتے لوگوں کو قانونی مدد فراہم کرتا ہو۔''

میں معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔ ''بیگ صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ کسی وقت سعید کے مالی حالات بہت اچھے تھے۔ وہ اپنے کیس کی پیروی کے لئے ایک چھوڑ دس وکیل کرنے کی استطاعت رکھتا تھا لیکن اب وقت بدل چکا ہے۔ مجھے یقین ہے، اس وقت وہ عدالت کے فراہم کردہ وکیل صفائی پر قناعت کرنے پر مجبور ہے۔ آپ جانتے ہیں، ایسا بودا سرکاری وکیل، وکیل استغاثہ کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا جس کے نتیجے میں سعید بے گناہ، بےقصور موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا!''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ عدالت کے فراہم کردہ تمام وکیل بودے اور پھس پھسے ہوتے ہیں۔''

''آپ وکیل ہیں اس لئے وکیلوں کی مخالفت برداشت نہیں کریں گے۔'' وہ معتدل لہجے میں بولی۔ ''سعید کو اپنی طرف سے بےخبر رکھنے میں ایک اور مصلحت بھی پوشیدہ ہے!''

میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''دراصل سعید بہت ہی حساس اور پکّی

آدمی ہے۔ اگر کسی طرح اسے معلوم ہوگیا کہ میں اس کی مدد کررہی ہوں تو وہ بدک جائے گا اس طرح سارا کیس گڑبڑ ہوجائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے، سعید آپ سے خفا ہے۔'' میں نے ایک منطقی بات کی۔ ''ورنہ برے وقت میں دوستوں کی مدد لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔''

وہ تفہیمی انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی بات کو میں پوری طرح رد نہیں کروں گی۔ تاہم یہ بھی کہوں گی، وہ مجھ سے ناراض نہیں۔ بس یوں سمجھ لیں، کافی عرصے سے ہمارے درمیان وہ تعلق نہیں رہا جو ماضی میں کبھی ہوا کرتا تھا۔ سعید انتہائی خوددار اور مضبوط ارادے کا مالک ہے۔ اگر اسے احساس ہوگیا کہ میں اس کی رہائی کے لئے لمبی چوڑی رقم خرچ کررہی ہوں تو معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔''

میں نے فیروزہ کو زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔ ''آپ لوگوں کے بیچ کیا معاملہ ہے مجھے اس سے زیادہ دلچسپی نہیں لیکن ایک بات کی وضاحت کردوں کہ اگر یہ ''معاملہ'' کسی بھی طور موجودہ کیس سے متعلق ہے تو ابھی بتا دیں۔ اپنے وکیل سے صاف گوئی کا مظاہرہ کرنے والے زیادہ فائدے میں رہتے ہیں۔''

''آپ اس سلسلے میں بالکل بےفکر رہیں۔ میں نے آپ سے کسی قسم کی کوئی غلط بیانی نہیں کی۔'' وہ پُروثوق لہجے میں بولی۔ ''ہمارے معاملے کے اثرات کسی بھی طرح اس کیس پر نہیں پڑیں گے۔ میں سعید کی سچی خیرخواہ ہوں۔ اگر اس موقع پر میں نے اس کی مدد نہ کی تو وہ اس مصیبت سے نکل نہیں پائے گا۔ سعید کو اگر سزا ہوگئی تو میں خود کو معاف نہیں کرسکوں گی۔ میرے پاس اور کوئی راہ نہیں ہے۔ میں درپردہ رہ کر ہی اس کی خیرخواہی کرسکتی ہوں۔ ویسے بھی میں نے سن رکھا ہے...... کسی کے کام اس طرح آؤ کہ ایک ہاتھ دے تو دوسرے کو خبر نہ ہو!''

''آپ نے بالکل درست سنا ہے اور یہی اعلیٰ ظرفی بھی ہے لیکن......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور کہا۔ ''اس کیس میں جو ابتدائی نازک مرحلہ آئے گا اس میں آپ خود کو کس طرح پوشیدہ رکھ سکیں گی؟''

''کون سا نازک مرحلہ؟'' اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''ملزم کی ضمانت کا مرحلہ۔''

وہ تشویش ناک انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزم کی ضمانت کے سلسلے میں آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ کی حیثیت اس کیس میں مدعی کی سی ہے۔ ضمانت یا ضامنی کا بندوبست آپ ہی کو کرنا ہوگا چنانچہ آپ کو سامنے آنا ہوگا۔''

''ضمانت یا ضامنی سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

"شخصی ضمانت کو ضمانتی یا ضامن بھی کہا جاتا ہے۔" میں نے رسانیت سے کہا۔ "جبکہ معتبر شخصی ضمانت نہ ہونے کی صورت میں سکہ رائج الوقت چلتا ہے۔ ضمانت کے ضمن میں عدالت ایک بھاری رقم کا بانڈ بھرواتی ہے۔ اگر آپ منظرِ عام پر نہیں آنا چاہتیں تو وہ رقم آپ کو فراہم کرنا ہو گی۔"

"یہ تو میں کر سکتی ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "لیکن اس صورت میں بھی سعید آپ سے سوال کر سکتا ہے!"

"ہاں، اس بات کے تو روشن امکانات ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "بس تو پھر یہ طے ہو گیا کہ اس مسئلے کا کوئی مناسب ساحل بھی آپ ہی نکالیں گے۔ میں آپ کی مطلوبہ رقم فراہم کر دوں گی۔ آپ کسی ڈمی کو سامنے رکھ کر عدالتی ضروری کارروائی نمٹا لیں گے۔ سعید کو یہی تاثر دیا جائے کہ کسی بہت بڑے فلاحی و رفاہی ادارے نے اسے سپورٹ کیا ہے۔ آپ کی ڈمی اس فرضی ادارے کے نمائندے کا کردار ادا کرے گی۔"

"یہ سب ہو جائے گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن......"

میں نے کچھ سوچ کر جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی۔ "آپ اس سلسلے میں فکرمند نہ ہوں۔ یہ آپ کا اضافی کام شمار ہو گا جس کے لئے میں علیحدہ سے ادائیگی کروں گی۔"

کہتے ہیں، خود اپنے قدموں سے چل کر آنے والے رزق کو لات نہیں مارنا چاہئے۔ میں ہرگز اضافی رقم کا مطالبہ کرنے والا نہیں تھا لیکن فیروزہ نے اپنی زبان سے پیشکش کر دی تو اسے ٹھکرانا بھی کفرانِ نعمت کے کھاتے میں جاتا لہٰذا میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کافی سمجھ دار خاتون ہیں۔" یہ ایک ایسا ریگولر اور ملٹی پرپز جملہ تھا جس سے کوئی بھی مفہوم اخذ کیا جا سکتا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "آپ آج ہی تھانے میں سعید سے ملاقات کر لیں۔ مجھے جو باتیں معلوم تھیں، وہ میں نے آپ کو بتا دی ہیں۔ باقی تفصیل سعید سے مل جائے گی۔ ریمانڈ کی مدت ختم ہونے کے بعد، پولیس عدالت میں چالان پیش کرے تو آپ کو ضمانت کے لئے پیش قدمی کرنا ہو گی۔ میں چاہتی ہوں، اس وقت تک آپ پوری طرح تیاری کر لیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ سے آئندہ ملاقات کب اور کیسے ہو گی؟"

"میں ایک دو روز میں آپ سے خود رابطہ کروں گی۔"

"اچھی بات ہے!" میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ "خدا حافظ" کہہ کر میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا انداز ہمدردی مجھے پوری طرح ہضم نہیں ہو سکا تھا۔ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہونے والی بات اپنی جگہ درست

ہے لیکن فیروزہ کے رویے اور باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ جیسا نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی، اس سے آگے بھی بہت کچھ تھی۔ اس کی ذات کے حوالے سے میرے ذہن میں اچھا خاصا تجسس جاگ اٹھا تھا اور جانے کیوں لاشعوری طور پر مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنے بارے میں کسی حد تک غلط بیانی سے کام لیا ہو گا۔ زرعی اراضی اور فش فارم والے قصے کی تصدیق میں نہیں کر سکتا تھا۔ دو فلیٹ سے حاصل ہونے والا کرایہ، سوسائٹی آفس کا بنگلا اور بوڑھی والدہ و چھوٹے بھائی کے ہمراہ زندگی گزارنا...... یہ سب ایسی باتیں تھیں جو درست بھی ہو سکتی تھیں اور عین ممکن تھا، اس میں ہیر پھیر بھی ہو!

یوں منفی انداز میں سوچنے کی ایک وجہ تھی اور وہ وجہ تھی فیروزہ کا پہلا تاثر۔ اسے دیکھ کر اور اس کے اولین رویے کا نظارہ کرنے کے بعد میں اندر سے تھوڑا کھنچ سا گیا تھا۔ آپ اسے محتاط روی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں حالانکہ بعد کی گفتگو میں فیروزہ نے کسی قسم کی رعونت یا اکڑ دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہمارے درمیان نارمل اور معمول کی بات چیت ہوئی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، وہ پہلا تاثر ابھی تک پوری طرح میرے ذہن سے زائل نہیں ہو سکا تھا۔

یہ بھی ہو سکتا تھا سرے سے ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں کسی قسم کے وہم میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مگر یہ بات طے تھی کہ اگر یہ میرا وہم نہیں تھا تو پھر جلد یا بدیر فیروزہ کی ذات میرے سامنے عیاں ہونے والی تھی۔ میرے ذہن میں اس کے حوالے سے ایک پھانس سی پیوست ہو گئی تھی جو شعوری اور لاشعوری طور پر اس کے بارے میں جاننے کے لئے اُکسا رہی تھی۔

میں نے فیروزہ کو ذہن سے جھٹکا اور اگلے ملاقاتی کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔

✿✿✿

فیروزہ کی زبانی ملزم سعید کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ خاص طور پر گھریلو ملازمہ مقتولہ فریدہ کے سلسلے میں اس نے زیادہ وضاحت نہیں کی تھی۔ وہ وقوعہ کے حوالے سے تفصیلاً زیادہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے بار بار اس بات پر زور دیا تھا کہ سعید بے گناہ ہے۔ اس نے فریدہ کو قتل نہیں کیا۔ اپنے اس موقف کے لئے اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں تھا۔ اگر ملزم قاتل نہیں تھا تو پھر فریدہ کو کس نے قتل کیا؟ یہ ایک اہم سوال تھا۔ سعید کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کوئی ایسا ٹارگٹ سامنے رکھنا ضروری تھا جو قاتل کی تعریف، تفصیل اور تاویل پر پورا اترتا ہو۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔

سعید بھاری تن و توش کا مالک اور خوب رو شخص تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ صنفِ مخالف کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا۔ اس وقت وہ حوالات کے ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھا قسمت کی ستم ظریفی پر ماتم کر رہا تھا۔ میں نے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کر کے اس تک رسائی حاصل کی۔

جب کانسٹیبل نے آ کر اسے بتایا کہ کوئی وکیل صاحب اس سے ملنے آئے ہیں تو اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اس نے پُرمعنی انداز میں کانسٹیبل کو دیکھا اور سر کی جنبش سے مخصوص اشارہ کیا، جس کا مطلب تھا، میں ملزم سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کانسٹیبل ''سمجھدار'' تھا لہٰذا وہاں سے ٹلنے سے قبل اس نے حریصانہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں اس کی نگاہ میں پوشیدہ مطلب سمجھ گیا۔

میں نے ہپ پاکٹ سے اپنا والٹ نکالا اور اس میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ برآمد کرنے کے بعد اسے کانسٹیبل کی جانب بڑھا دیا اور بڑی فراخ دلی سے کہا۔ ''جاؤ، تم بھی کیا یاد کرو گے۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور کچھ یاد کرنے کے بہانے وہاں سے چلا گیا۔

میں ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''سعید! میں تمہارا وکیل ہوں۔ تمہیں اس جھوٹے مقدمے سے نجات دلاؤں گا۔ تم وکالت نامے پر دستخط کر دو۔'' میں نے وکالت نامہ اور قلم اس کی جانب بڑھا دیئے۔

اس نے دستخط کرنے سے پہلے استفساریہ نگاہ سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا آپ سرکاری وکیل ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ ایک معروف رفاہی ادارے نے تمہارا کیس لڑنے کے لئے میری خدمات حاصل کی ہیں۔''

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ''کیا ہمارے یہاں کے فلاحی اور رفاہی ادارے ایسے بے لوث اور نیک کام بھی کرتے ہیں؟ میں نے تو سُن رکھا ہے، یہ صرف نام کے فلاحی ہوتے ہیں ورنہ ان کے کرتا دھرتا ایسے اداروں کی آڑ میں اپنا بزنس چمکاتے ہیں۔ وہ کسی کی فلاح و بہبود کی بجائے اپنا پیٹ اور گھر بھرتے ہیں۔ صاحبِ ثروت اور مخیّر حضرات سے ڈونیشن کے نام پر بڑی بڑی رقوم کے چیک وصول کئے جاتے ہیں اور خدمت خلق کی بجائے خدمت حلق پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے، کہیں ایسا بھی ہوتا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جس طرح پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں اسی طرح تمام فلاحی ادارے بھی یکساں نہیں ہوتے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''جناب! یہ ٹھیک ہے، پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں لیکن اگر انگوٹھا ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائے تو سب ایک جان نظر آتے ہیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ جو مالدار لوگ ایسے اداروں کی مالی معاونت کرتے ہیں، وہ ان رقوم کے بدلے اداروں سے غلط قسم کے مفاد بھی اٹھاتے ہیں، پھر وہ ''غلط قسم کے مفادات'' کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔

میں نے اس غیر متعلق اور ترش موضوع کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور دوٹوک لہجے میں کہا۔

''مسٹر سعید! میں جس رفاہی ادارے کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہوں، وہ ویسا نہیں جیسا تم نے سن رکھا ہے۔ ہم ایک ساتھ مل کر چلیں گے تو رفتہ رفتہ تمہیں میری بات کا یقین آ جائے گا۔''

وہ میری بات سے جزوی طور پر قائل دکھائی دینے لگا اور خاموشی سے وکالت نامے پر دستخط کرنے کے بعد بولا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں، کیس سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اس رفاہی ادارے کی جانب سے ایک لمبی چوڑی رقم کا بل بھیج دیا جائے و مجھے ایک مقررہ تاریخ تک ادا کرنا ہو؟''

سعید کی آنکھوں میں تشویش بھری پریشانی کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ تمہیں اس سلسلے میں چنداں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ادارہ تمہاری جو بھی مدد کرے گا وہ بے لوث ہوگی۔ ادارہ میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کے علاوہ تمہاری ضمانت کا بھی بندوبست کرے گا۔''

''کیا میں اس نیک مقاصد کے حامل ادارے کا نام جان سکتا ہوں؟'' اس کی فکر اور تشویش اب اطمینان میں بدل رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ ادارے کے اصول کے خلاف ہے۔ اس لئے سوری!''

وہ اثبات میں گردن ہلانے لگا۔

میں نے مزید کہا۔ ''اب تم تمام اندیشوں کو ذہن سے جھٹک کر مجھے اصل واقعے کے بارے میں بتاؤ، وقت بہت کم ہے۔ وہ کانسٹیبل کسی بھی لمحے اپنی حریص صورت کے ساتھ یہاں نمودار ہو جائے گا۔''

''یہ واقعہ بہت ہی سادہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے فریدہ کو قتل نہیں کیا۔''

''وہ تو مجھے بھی یقین ہے۔'' میں نے اس کے اعتماد میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے بتاؤ، وقوعہ کے روز کیا ہوا تھا؟''

وہ بتانے لگا۔ ''وقوعہ کے روز میں حسب معمول تیار ہو کر گھر سے نکل گیا تھا۔ میرا گھر محمود آباد میں ہے اور نوکری بندر روڈ پر۔ میں اسٹور پر پہنچا اور کام شروع کئے۔ ابھی پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ گھر سے فون آ گیا۔ فون گھر کی ملازمہ فریدہ نے کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میری بیوی نیلم کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے لہٰذا میں فوراً گھر پہنچوں۔ میں نے اسٹور کے مالک کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا اور بھاگم دوڑم گھر پہنچا...... اور یہاں آ کر ایک عجیب و غریب صورت حال سے واسطہ پڑا۔ فریدہ کی نیم برہنہ لاش ایک کمرے میں پڑی تھی اور گھر میں نیلم کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ فریدہ کا لباس کئی جگہ سے کھلا ہوا تھا اور اس کی حالت سے لگتا تھا زبردستی اسے برہنہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو کسی کے مذموم عزائم کی عکاس تھی۔ اس واہیات صورت حال نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ پہلے چند منٹ تک تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، حواس جیسے مختل اور عقل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ جب ہوش و حواس بجا ہوئے تو میں نے آس پڑوس والوں

سے نیلم کے بارے میں استفسار کیا۔ ایک پڑوسی کی بیوی نے بتایا کہ وہ میرے اسٹور پر گئی ہے۔ یہ سن کر مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے جب نیلم کے اسٹور جانے کا سبب جاننا چاہا تو کوئی معقول بات سامنے نہ آسکی۔ پڑوسن سے صرف یہی معلوم ہوا کہ نیلم کسی ایمرجنسی میں گھر سے نکلی تھی۔

سعید کے مطابق وہ بندر روڈ پر واقع ایک بڑے میڈیکل سٹور پر بہ حیثیت سیلز مین ملازمت کرتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی صبح گیارہ بجے سے رات نو بجے تک تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ چند ماہ پہلے اس کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ اس کے پاس ادویہ کی سپلائی کی ایک ایجنسی تھی۔ کاروبار خوب چمک رہا تھا لیکن پھر سب کچھ آناً فاناً تباہ و برباد ہو گیا۔ ٹھاٹ باٹ جاتے رہے اور وہ ایک میڈیکل اسٹور پر ملازمت کے لئے مجبور ہو گیا۔ سعید کے حالات کے بارے میں فیروزہ نے بھی مجھے کافی کچھ بتایا تھا۔ سعید نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا لیکن اس کے مالی اور کاروباری حالات میں تبدیلی کا موجودہ کیس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اس لئے میں اس کے ذکر سے اجتناب برتتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔ قارئین بس اتنا سمجھ لیں کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے زمین پر آگرا تھا۔ کاروبار کی دنیا میں اس نوعیت کے اپ سیٹ اور سیٹ اپ کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ بعض اوقات انسان راتوں رات ترقی کر کے بہت اوپر پہنچ جاتا ہے اور کبھی سعید کی طرح فلک کے منظر سے ٹوٹ کر زمین بوس ہو جاتا ہے۔

میرے استفسار پر سعید نے مزید بتایا کہ کچھ دیر بعد اس کی بیوی نیلم بھی واپس لوٹ آئی اور گھر میں ملازمہ کی برہنہ لاش دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اس واقعے کے بارے میں سعید سے الٹے سیدھے سوال پوچھنے لگی۔ ظاہر ہے سعید کے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ وہ اس بات پر ڈٹا رہا کہ وہ ملازمہ کے ایمرجنسی فون پر بھاگا بھاگا گھر پہنچا تھا اور نیلم مصر رہی کہ میڈیکل اسٹور ہی سے آنے والے فون پر وہ دوڑی دوڑی وہاں پہنچی تھی۔ دونوں کا موقف ایسا تھا کہ تکرار اور بحث کے درجنوں دروازے کھل گئے۔ گھر میں ایک لاش پڑی تھی اور وہ خود کو سچا اور دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے بساط بھر زور لگا رہے تھے۔ ان کی اسی گوہا چھی چھی کے دوران میں کسی نے پولیس اسٹیشن فون کر کے قتل کی اطلاع دے دی۔ کچھ دیر بعد پولیس والے جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ حالات و واقعات اور نیلم کی زبان درازی سے پولیس والوں نے پتا نہیں کیا نتیجہ اخذ کیا کہ سعید کو گھریلو ملازمہ فریدہ کے قتل کے الزام میں اٹھا کر تھانے لے گئے۔ پولیس کے مطابق ملزم سعید نے فون کے ذریعے اپنی بیوی نیلم کو گھر سے ہٹایا اور موقع غنیمت جانتے ہوئے فریدہ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ وہ جب ملزم کی خواہش کی تکمیل کے لئے تیار نہیں ہوئی تو ان میں ہاتھا پائی ہوئی ہو گی جس کے نتیجے میں مقتولہ کا لباس متعدد مقامات سے پھٹ گیا اور وہ نیم برہنہ ہو گئی۔ اسی دوران میں ملزم نے پڑوسیوں کے ڈر خوف کی وجہ سے فریدہ کو قتل کر دیا تا کہ وہ اس کی ناکام کوشش کا چرچا نہ کر سکے۔ وہ فریدہ کی زبان بند کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کی بیوی

بھی واپس آگئی اور پھر ان دونوں میں بخثم بحثی ہونے لگی۔ اسی وقت کسی پڑوسی نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔

یہ عجیب و غریب حالات و واقعات تھے۔ میں سعید کی کتھا سنتے ہوئے مسلسل اس کی آنکھوں میں تکتا رہا اور میں نے محسوس کیا، وہ کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا، وہ فریدہ کے فون پر اسٹور سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا تھا۔ وہ اپنی گھریلو ملازمہ کی آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسی ملازمہ کو سعید کے گھر پہنچنے سے قبل قتل کر دیا گیا۔ شواہد سے ظاہر ہوتا تھا، کسی نے فریدہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی کوشش بلکہ زبردستی کی تھی جس کے نتیجے میں اس کا لباس بری طرح مجروح ہوا تھا۔ یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ سعید کا گھر کسی جنگل بیابان میں واقع نہیں تھا کہ فریدہ کو اس طرح ہراساں کیا جاتا رہا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ ایک بھرے پرے محلے میں رہتا تھا۔ بیان شدہ صورت حالات میں فریدہ کو یقینی طور پر اپنے بچاؤ کے ساتھ ساتھ چیخنا چلانا چاہئے تھا، اپنے پڑوسیوں کی مدد حاصل کرنے کے لئے انہیں اپنی جانب متوجہ کرنا اس کا عین فطری ردِ عمل ہوتا لیکن...... ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، کیوں؟

اس ''کیوں'' کا جواب کڑی تحقیق کے بعد ہی سامنے آسکتا تھا۔ ابتدائی معلومات میں مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ فریدہ کی عزت محفوظ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کسی قسم کا جبر نہیں ہوا تھا اور...... یہ کہ اس کی موت سر کے عقبی حصے میں لگنے والی کسی گہری چوٹ کے سبب واقع ہوئی تھی۔ جائے واردات پر خون کے متعدد دھبے بھی دیکھنے کو ملے تھے جن کی حالت بتاتی تھی، وہ فریدہ کے سر کے عقبی حصے سے خارج ہونے والا خون ہی تھا۔

میں مزید کچھ دیر تک سعید سے کرید کرید کر اس واقعے کے گرد و پیش کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا لیکن کوئی کارآمد اور مفید بات سامنے نہ آسکی۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں اسے دوسری طرف لے آیا اور پوچھا۔

''پولیس والوں کا برتاؤ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟''

''ابھی تک تو ناصحانہ ہے۔'' وہ بددلی سے بولا۔

''ناصحانہ...... کیا مطلب؟''

اس نے بتایا۔ ''مجھے پیار محبت سے یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ میں اقبالِ جرم کر لوں۔ بہ صورت دیگر وہ سختی برتنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''اور سختی برت کر وہ تمہارا اقبالی بیان حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟'' میں نے کہا۔

میرا انداز چونکہ سوالیہ تھا اس لئے جواباً اس نے کہا۔ ''میں نے پولیس والوں کے تفتیشی طریقۂ کار کے بارے میں بہت سی رونگٹے کھڑے کرنے والی کہانیاں سن رکھی ہیں۔ کہا جاتا ہے، یہ لوگ

پتھر کو بھی بولنے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔"

میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ "تم نے کچھ زیادہ غلط بھی نہیں سن رکھا۔ پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"کس سلسلے میں جناب!" وہ الجھی ہوئی صورت سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "کس طرح اقرارِ جرم کرو گے، شرافت سے یا مار کھا کر؟"

"آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

"میں اس سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "جو تمہیں سہل لگے وہ راستہ اختیار کرنا۔ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان تو پیش کرنا ہی ہے۔ ان کی تفتیش کے نتیجے میں اگر تم ملزم نہیں ٹھہرو گے تو ان کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ اقبالِ جرم تو وہ تم سے ضرور کروائیں گے۔ اس سلسلے میں خود ساختہ اقبالی بیان پر تمہارے دستخط ہی کافی ہوں گے۔ پولیس کو اپنی ایفی شینسی دکھانے کے لئے ایک سوا ایک راستوں کا علم ہے۔"

اس نے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق پولیس کی تحویل میں دیا گیا کوئی بیان عدالتی سطح پر معتبر اور حتمی نہیں سمجھا جاتا۔ ملزم جج کے روبہ رو اس بیان سے انحراف کر سکتا ہے۔"

"تمہاری معلومات بالکل درست ہیں۔" میں نے کہا۔ "ملزم صحتِ جرم سے انکار کا حق رکھتا ہے۔ پولیس کسٹڈی میں دیئے گئے بیان کو عدالت کوئی اہمیت نہیں دیتی۔"

وہ مطمئن انداز میں گردن ہلانے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ فیروزہ نامی کسی عورت کو جانتا ہے تو ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے صاف انکار کر دیا۔

میں نے اس سے مزید دو چار سوالات کئے اور تھانے کے حوالاتی حصے سے باہر آ گیا۔ جب میں تھانہ انچارج کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگا تو خود بہ خود میرے پاؤں رک گئے۔

جب میں یہاں آیا تھا تو تھانے دار موجود نہیں تھا اور اب وہ اپنے کمرے میں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا دو چار باتیں اس سے بھی ہو جائیں۔ اس دوران میں اس کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی۔ لہٰذا میرے قدم اس کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

"آؤ آؤ وکیل صاحب! آج کیسے راستہ بھول گئے؟" تھانے دار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

بعد ازاں تھانہ انچارج کا نام اسلم رانا معلوم ہوا۔ میں نے کہا۔ "جناب! میں راستہ بھول کر نہیں بلکہ سمجھ سوچ کر یہاں پہنچا ہوں۔ آپ سنائیں، ملزم کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں؟"

"کون سا ملزم بھئی!" وہ بے پروائی سے بولا۔ "یہاں تو حوالات بھری رہتی ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں اپنے موکل کی بات کر رہا ہوں۔ سعید، جسے آپ نے گھریلو ملازمہ فریدہ کے قتل کے الزام میں اندر بند کر رکھا ہے۔"

"اچھا، تو وہ آپ کا موکل ہو گیا ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "بھئی بڑی ترقی کر لی آپ نے!"

"میری ترقی اور تنزلی کے بارے میں غور و فکر کرنے کی بجائے اگر آپ میرے سوال کا جواب دے دیں تو ہم دونوں کا وقت برباد نہیں ہو گا۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ "وکیل صاحب! ہم تو ہر ملزم کو بڑے آرام سے رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے موکل کا انٹرویو کر لیا ہو گا۔ دیگر حوالاتیوں سے بھی جا کر پوچھ لیں۔ آپ ہمارے سلوک کو روا اور تسلی بخش پائیں گے۔"

وہ بہت ہی گہرا بندہ تھا۔ مجھے یقین تھا، وہ میری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن مجھے زچ کرنے کے لئے وہ دانستہ مشرق کا جواب مغرب سے دے رہا تھا۔ اسے تھانے میں قدم رکھتے ہی نچلے عملے نے میری موجودگی اور عزائم کے بارے میں بتا دیا ہو گا۔ اب وہ بھولے بادشاہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "رانا صاحب! میں اس سلوک کی بات کر رہا ہوں جو آپ لوگ چالان کی صورت میں ملزم کے ساتھ کرتے ہیں۔ میرے موکل کو آپ عدالت میں کتنی بلندی پر ٹانگنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ایک تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ وکیل حضرات ہم پولیس والوں کے بارے میں اتنے بدگمان کیوں ہیں؟ بھئی، ہم خوامخواہ کسی بے گناہ کو نا ٹانگتے ہیں اور نہ ہی کسی مجرم کو اتارتے ہیں۔ عدالت کی طرح تھانہ بھی انصاف فراہم کرنے کا ایک مرکز ہے۔ ہم سب لوگ ایک ہی نوعیت کا کام کرتے ہیں۔ پھر ہم معطون اور آپ ممنون کیوں؟ ذرا اس کی تو وضاحت کر دیں؟"

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "رانا صاحب! جس بدگمانی کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، وہ ہم وکیل حضرات تک ہی محدود نہیں بلکہ عوام الناس بھی انہی خیالات اور نظریات کے حامل ہیں لہٰذا اصولی طور پر یہ بدگمانی کی صحت پر پورا نہیں اترتی بلکہ اسے تجزیہ یا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔"

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "آپ مطلب کی بات کریں؟"

میری طنز بھری ترش و تلخ باتیں اسے ناگوار گزری تھیں۔ میں نے اس کی حالت کو دلی طور پر انجوائے کرتے ہوئے کہا۔ "رانا صاحب! سچی اور مطلب کی بات تو یہ ہے کہ میں جاننا چاہتا ہوں، میرے بے گناہ موکل کے خلاف آپ کس قسم کا چالان تیار کرنا چاہتے ہیں؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے مجھے امید نہیں کہ اس سلسلے میں آپ زبان کو زحمت دیں گے۔"

"آپ تو کافی عقل مند وکیل ہیں۔ میں اس سلسلے میں مزید کیا کہہ سکتا ہوں؟" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔ "ویسے بھی یہ معاملہ میرے ہاتھ میں نہیں۔ اس کیس کی تفتیش

سب انسپکٹر کر رہا ہے۔ ظاہر ہے، چالان بھی وہی تیار کرے گا۔''

''آپ نے گویا اپنے سر سے اتار پھینکی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ ایک دم بہت مصروف نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ اب مجھے وہاں سے رخصت ہو جانا چاہئے۔

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''رانا صاحب! میرا موکل سراسر بے گناہ ہے۔ اس سے کوئی زیادتی کرتے ہوئے اس بات کو ضرور ذہن میں رکھئے گا۔''

''ان ملزموں کا بھی کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔'' وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ ''بالکل بے پیندے کے لوٹے کے مانند ہوتے ہیں۔ جب ہم تفتیش کرتے ہیں تو بڑی شرافت سے اقبال جرم کر لیتے ہیں لیکن بعد میں آپ وکیل حضرات اس طرح ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں کہ عدالت میں جا کر اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو جاتے ہیں۔''

''یہ ہمارے پیٹھ ٹھونکنے کا نتیجہ نہیں بلکہ آپ کے طریقۂ تفتیش کے ثمرات ہیں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''تفتیش کے نام پر ہونے والے تشدد کا خوف انہیں راہ دکھاتا ہے کہ یہ اقبال جرم کر کے اپنی جان بچا لیں اور جب ہم انہیں انصاف دلانے کا وعدہ کرتے ہیں تو عدالت میں جا کر یہ صحت جرم سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ آپ کی کسٹڈی سے نکلتے ہی یہ یوں محسوس کرتے ہیں جیسے بہت بڑے عذاب سے نجات مل گئی ہو۔''

وہ بڑبڑاہٹ کے انداز میں پتا نہیں، کیا کیا کہتا رہا۔ میں اس کی باتوں پر توجہ دیئے بغیر تھانے کی حدود سے باہر آ گیا۔ اس مغز ماری کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا اس لئے وقت ضائع کرنا مناسب نہ تھا۔ پولیس اور وکلا کا پھڈا ازلی ابدی ہے، سب جانتے ہیں۔

✿✿✿

آئندہ روز میں عدالتی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دفتر پہنچا تو فیروزہ کا فون آ گیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں ''ہیلو'' کہا تو دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''ہیلو بیگ صاحب! آپ نے مجھے پہچانا؟''

''جی، پہچان گیا۔'' میں نے پیشہ ورانہ خوش دلی سے کہا۔

رسمی علیک سلیک اور حال احوال کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گئی۔ ''آپ نے سعید سے تو ملاقات کر لی ہو گی؟''

اس کے لہجے سے خوش مزاجی ٹپکتی تھی۔ پچھلی ملاقات کے اختتام پر اس نے اس تاثر کو کافی حد تک زائل کر دیا تھا جو اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں قائم ہوا تھا۔ اس کا موجودہ انداز یہ ظاہر کرتا تھا، ابتدائی تاثر فیروزہ کی اداکاری کا رہین منت تھا۔ ورنہ وہ درحقیقت ایک زندہ دل اور خوش طبیعت عورت تھی۔ گویا پہلے وہ ایک خول میں تھی، جو اب ٹوٹ چکا تھا۔

میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''نہ صرف تفصیلی ملاقات ہو گئی بلکہ میں نے اس سے وکالت نامہ بھی سائن کروا لیا ہے۔''

وہ فروعی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل موضوع پر آ گئی۔ ''آپ اس کیس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

میں نے مبنی بر مصلحت الفاظ میں کہا۔ ''کیس تو اس وقت مکمل شکل اختیار کرے گا جب عدالت میں باقاعدہ استغاثہ دائر کیا جائے گا۔ ویسے سرِ دست میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ کیس ایسا آسان بھی نہیں جیسا نظر آ رہا ہے۔''

''بھئی بیگ صاحب!'' اس کا انداز بے تکلفانہ ہو گیا۔ ''اگر یہ کیس سیدھا سادا ہوتا تو پھر آپ جیسا مہنگا اور چوٹی کا وکیل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ظاہر ہے، آپ اس کیس کو آسان بنائیں گے۔'' ذرا رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''اور ہر قسم کی آسانی حاصل کرنے کے لئے رقم میں فراہم کروں گی۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بالکل ایسا ہی ہو گا۔ میں جانتا ہوں، مجھے کیا کرنا ہے؟''

''اٹس گڈ!'' وہ سراہنے والے انداز میں بولی پھر پوچھا۔ ''سعید نے اس بات پر کسی شک و شبے کا اظہار تو نہیں کیا کہ اس کے کیس کی پیروی کے لئے کسی فلاحی ادارے نے آپ کی خدمات حاصل کی ہیں؟''

''شک تو نہیں البتہ اس نے خاصی حیرانی اور بے یقینی ظاہر کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اس قسم کے اداروں اور مراکز کو فراڈ اور جرائم کی آڑ سمجھتا ہے۔ بہرحال، میں نے بڑے مستحکم انداز میں اسے باور کرا دیا ہے کہ یہ رفاہی ادارہ خالصتاً نیک نیتی کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولی۔ ''آئندہ بھی آپ نے اس رفاہی ادارے کو پروجیکٹ کرنا ہے۔ میں پس پردہ رہنا چاہتی ہوں۔ اگر سعید کو ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی کہ میں خفیہ طریقے سے اس کی مدد کر رہی ہوں تو وہ یہ مدد لینے سے انکار کر دے گا اور معاملہ الٹ کر رہ جائے گا۔''

یہ بات وہ پہلی ملاقات میں بھی دو تین مرتبہ کہہ چکی تھی۔ اس کا یہ انداز خاصا مشکوک اور پراسرار تھا۔ فیروزہ کی ذات کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک چبھن سی تھی۔ یہ اچھا موقع تھا لہٰذا میں نے پھانس نکالنے کا فیصلہ کیا اور فیروزہ سے استفسار کیا۔

''آپ کی باتوں سے تو لگتا ہے سعید آپ کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ کسی بھی طور آپ کا احسان لینے کو تیار نہیں؟''

''بالکل یہی حقیقت ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''اسی لئے تو میں اس کے سامنے نہیں

آنا چاہتی۔"

میں نے فیروزہ کا حوالہ دے کر سعید سے ایک سوال کیا تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں کسی قسم کی واقفیت سے انکار کر دیا تھا۔ اگر وہ فیروزہ کو جانتا تھا تو پھر انکار کا کوئی جواز نہیں تھا...... اور اگر واقعی وہ فیروزہ سے واقف نہیں تھا تو پھر فیروزہ کے اصرار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا، ان دونوں میں سے کوئی ایک چکر بازی سے کام لے رہا تھا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا، وہ دونوں ہی راست ہوں!

بات چکر بازی تک پہنچی تو میں فیروزہ کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ کسی مصلحت کی بنا پر پردہ پوشی سے کام لے سکتی تھی۔ سعید کی ایسی کوئی مجبوری دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر فیروزہ کا مدد کرنے کا انداز بھی خاصا مبہم اور سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔

پہلے تو میرے جی میں آئی کہ اس سلسلے میں فیروزہ سے استفسار کروں لیکن پھر کسی فوری خیال کے تحت میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور اسے ڈھنگ سے گھسنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر واقعی وہ کوئی گیم کھیل رہی تھی تو اس کھیل کو منطقی انجام تک پہنچانے کی ضرورت تھی۔ یہ عین ممکن تھا، میری بے خبری اور لاعلمی کا اظہار اس کیس کی نئی جہتیں کھول دیتا۔

میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں اس کی ذات کے حوالے سے کسی اسرار میں مبتلا نہیں۔ ہمارے درمیان اس کیس پر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی پھر میں نے فیروزہ سے کہا۔ "میں ایک نظر جائے وقوعہ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

میں نے کہا۔ "اس سے مجھے کیس میں خاصی مدد ملے گی۔ ممکن ہے، وہاں سے کوئی ایسا کلیو مل جائے جو سعید کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے معاون ثابت ہو۔"

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "ہاں، ایسا تو ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر آپ میرے ساتھ محمود آباد چلیں گی؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

"مم...... میں...... نہیں بیگ صاحب...... میں کیسے جا سکتی ہوں...... میرا مطلب ہے، وہاں میرا جانا مناسب نہیں ہو گا۔" وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہتی چلی گئی۔ "اگر میں سعید کے گھر جاؤں گی تو یہ بات اس سے چھپی نہیں رہے گی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اور یہی تو میں چاہتی نہیں ہوں ورنہ میں کھل کر اس کے سامنے نہ آ جاتی۔"

میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے، آپ سعید کی بیوی نیلم کی نظر میں بھی نہیں آنا چاہتیں۔"

"ظاہر ہے، بات تو ایک ہی ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں سعید کے سامنے آؤں یا نیلم کے، اس کے ایک سے اثرات ظاہر ہوں گے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ تو نہیں ہیں۔"

میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، پھر تو مجھے اکیلے ہی محمود آباد کا چکر لگانا ہو گا۔"

"آپ کب تک اس طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" فیروزہ نے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ "شاید کل کچھ فرصت نکال کر یہ کام نمٹا لوں۔"

"اوکے!" میں نے الوداعی انداز میں کہا اور "خدا حافظ" کہہ کر فون بند کر دیا۔

اگلے روز عدالت میں میرا صرف ایک کیس تھا اور اتفاق سے اس کی بھی تاریخ پڑ گئی اور میں دس بجے کے قریب فارغ ہو گیا۔ دفتر کی طرف جانے میں ابھی کافی وقت تھا لہٰذا میں نے محمود آباد کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ملزم کی بیوی سے ایک ملاقات ہو جاتی تو کوئی نئی بات سامنے آ سکتی تھی۔ میرے موکل کے مطابق مقتول نے فون کر کے اسے گھر بلایا تھا۔ اگر واقعی فریدہ نے ایسا کوئی فون کیا تھا تو نیلم اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی تھی کیونکہ وہ فون اس کے علم میں لائے بغیر تو نہیں کیا گیا ہو گا۔

محمود آباد ایک عجیب و غریب مزاج کا علاقہ ہے۔ شاید اس تنوع کا سبب یہ ہو کہ سرحدی اعتبار سے یہ محلہ جن علاقوں سے جڑا ہوا ہے وہاں معاشرتی تفاوت بہت زیادہ ہے۔ مثلاً محمود آباد بیک وقت ڈیفنس سوسائٹی، پی ای سی ایچ ایس، اعظم بستی اور منظور کالونی سے جڑا ہوا ہے۔ یہ تمام علاقے ایسے ہیں جو کسی بھی طور پر آپس میں لگا نہیں کھاتے۔ بہر حال، ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں گیارہ بجے ملزم کے گھر پہنچ گیا۔

وہ دو سو گز پر بنی ہوئی ایک تین منزلہ عمارت تھی جس کے ایک پورشن میں ملزم کی رہائش تھی۔ زیادہ تفصیل میں جانے کے بعد معلوم ہوا، پہلی اور دوسری منزل کو تقسیم کر کے چار ایک جیسے چھوٹے فلیٹ تیار کر لئے گئے تھے۔ دو ایک طرف اور دو دوسری جانب۔ بلڈنگ کی تیسری منزل پر مالک مکان خود رہائش پذیر تھا۔ ملزم والا فلیٹ پہلی منزل پر دائیں سمت اور اس کا نمبر ایک شمار ہوتا تھا۔

اطلاعی گھنٹی پر ایک دبلی پتلی پستہ قامت عورت نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظر سے مجھے سر تا پا دیکھتے ہوئے بولی۔ "جی، آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

وہ بلاشبہ ایک حسین و جمیل اور پُرکشش عورت تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ نیلم ہیں!"

"جی، میں نیلم ہی ہوں۔" اس نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا۔

میں نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کہتے ہیں۔ میں آپ کے شوہر کا وکیل ہوں۔"

"اچھا اچھا، سعید نے آپ کا ذکر تو کیا تھا۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "پلیز آپ اندر تشریف لے آئیں۔ یوں دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا ٹھیک نہیں۔"

اگلے چند لمحات میں، میں اس گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ وہ دو بیڈ اور ایک ڈرائنگ پر مشتمل چھوٹا سا فلیٹ تھا جیسا کہ دو سو گز کے ہوتے ہیں۔ فلیٹ کے پچھلے حصے میں صحن کے نام پر چند فٹ کا ایک ٹکڑا خالی چھوڑ دیا گیا تھا جہاں سے آسمان واضح نظر آتا تھا۔ وہ مختصر سا صحن ہوا اور روشنی کی آمد کا ایک مناسب وسیلہ تھا۔

نیلم نے بے حد اصرار کے بعد مجھے ٹھنڈا پلایا۔ پھر ہمارے درمیان کیس پر بات ہونے لگی۔ اس وقت ہم دونوں کے علاوہ گھر میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہوا، وہ دونوں میاں بیوی بغیر کسی اولاد کے وہاں رہتے تھے۔ میں نے نیلم سے پوچھا۔

''آپ کا شوہر تو ایک مصیبت میں مبتلا ہے۔ کیا آپ کو اس گھر میں رہتے ہوئے کوئی ڈر خوف محسوس نہیں ہوتا، خاص طور پر اس حوالے سے کہ چند روز پہلے یہاں ایک قتل بھی ہو چکا ہے؟''

''یہ ایک اتفاق ہے کہ آپ ایسے وقت آئے ہیں کہ میں گھر میں موجود ہوں۔'' نیلم نے بتایا۔ ''ورنہ میں اسی روز سے امی کے یہاں چلی گئی تھی۔ میری امی مارٹن روڈ پر رہتی ہیں۔ یہ تو مجھے چند ضروری استعمال کی چیزیں لینا تھیں اس لئے ادھر آ گئی اور آپ سے ملاقات ہو گئی۔''

''اس کا مطلب ہے، میرا چکر ضائع نہیں گیا۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

وہ بولی۔ ''سعید نے خاصی تفصیل سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ مجھے پتا چلا ہے، آپ کسی رفاہی ادارے کی طرف سے ہمارا کیس مفت لڑیں گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا نہیں کیا اور کہا۔ ''نہ صرف یہ کہ میں آپ کے شوہر کا کیس لڑوں گا بلکہ اسے جیتنے کی بھی اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔ اس کے لئے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔''

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''وقت وقت کی بات ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے مالی حالات بہت اچھے تھے۔ ہم سوسائٹی کے ایک بنگلے میں رہتے تھے لیکن پھر سب کچھ تباہ ہو گیا۔ نہ وہ کاروباری ٹھاٹ رہے اور نہ ہی بنگلہ۔ وقت کی گردش نے ہمیں کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں لا پٹخا ہے، جو نہ مکان ہے اور نہ ہی فلیٹ۔ پتا نہیں، یہ کیا ہے؟'' پھر وہ خیالوں سے نکل کر میری جانب متوجہ ہو گئی۔ ''میں بھی کیا فضول قصہ لے کر بیٹھ گئی۔ ہاں تو آپ کسی تعاون کی بات کر رہے تھے!''

میں نے کہا۔ ''آپ اس کیس کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ میں آپ سے چند سوالات کرنے آیا ہوں تاکہ یہ کیس جیتنے کے لئے میں راہ ہموار کر سکوں۔''

''ضرور ضرور! پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کے شوہر کے مطابق انہیں فون کر کے میڈیکل اسٹور سے بلایا گیا تھا

اور یہ فون آپ کی طبیعت کی خرابی کے حوالے سے مقتول فریدہ نے اسے کیا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟''

''میں وہی کہوں گی جو اس سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''یہاں سے ایسا کوئی فون نہیں کیا گیا تھا۔''

''اس سے تو ظاہر ہوتا ہے، سعید نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔''

''مجھے خود حیرت ہے، وہ اس قسم کی بات کیوں کر رہا ہے۔''

''اس فون کی تصدیق یا تردید تو فریدہ ہی کر سکتی تھی جو اب زندہ نہیں رہی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ نکتہ آپ کے شوہر کے خلاف جا رہا ہے۔ یعنی آپ کے بیان سے اس کی ذات مشکوک ہو جاتی ہے۔''

وہ بے بسی سے بولی۔ ''جو سچ ہے وہ میں نے بتا دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں۔''

میں چند لمحات تک خاموش نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''آپ بھی تو ایک فون سن کر میڈیکل اسٹور کی طرف گئی تھیں۔ شاید آپ کو اطلاع دی گئی تھی کہ سعید کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ آپ کی خیریت معلوم کرنے یہاں آیا ہوا ہے۔''

''جی ہاں، یہی ہوا تھا۔'' میں نے تائید کی۔

میں نے کہا۔ ''سعید کے مطابق فریدہ کا فون بارہ بجے دوپہر اسے موصول ہوا تھا۔ آپ کو اپنے شوہر کے بارے میں کتنے بجے اطلاع دی گئی تھی؟''

''سوا بارہ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں فوراً رکشا پکڑ کر میڈیکل اسٹور پر پہنچی لیکن وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا، سعید گھر کی طرف روانہ ہو چکا تھا لہٰذا جب میں دوسرے رکشا میں بیٹھ کر واپس گھر آئی تو دوپہر کا ایک بج چکا تھا اور یہاں کی صورت حال انتہائی خطرناک اور سمجھ سے باہر ہو چکی تھی۔

''آپ نے میڈیکل اسٹور والوں سے پوچھا کہ آپ کو کس نے فون کیا تھا؟''

''وہ ایسے کسی فون کے بارے میں نہیں جانتے۔''

''جیسا کہ آپ فریدہ کے فون سے لاعلم ہیں۔''

''بڑی عجیب صورتِ حال ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔

''صرف عجیب ہی نہیں بلکہ انتہائی خطرناک بھی ہے۔''

''میری تو کچھ عقل میں نہیں آ رہا۔'' وہ مدد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''آپ ہی کچھ کریں۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے، سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑے گا۔''

''میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں، سعید جلد از جلد رہا ہو کر گھر آ جائے۔''

"آپ کو ایسا ہی چاہنا چاہئے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے امید ہے، آپ کسی مرحلے پر غلط بیانی سے کام نہیں لیں گی۔"

"ظاہر ہے، اگر میں جھوٹ بولوں گی تو اپنا ہی نقصان کروں گی۔"

میں نے کہا۔ "اس کیس کی کچھ کڑیاں غائب ہیں۔ جب تک وہ سامنے نہیں آئیں گی، زنجیر مکمل نہیں ہو سکے گی۔ سعید جھوٹ بول رہا ہے اور نہ ہی میڈیکل اسٹور والے دروغ گوئی کر سکتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

وہ پریشان نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو لگتا ہے، سعید کے خلاف کوئی گہری سازش کی گئی ہے۔ حالات اور واقعات اسے قاتل ٹھہرا رہے ہیں لیکن مجھے نہیں امید، اس نے یہ حرکت کی ہو۔"

ایک شوہر کے لئے اس کی بیوی کے ایسے خیالات کارآمد تو تھے لیکن جب تک یہ سازش بے نقاب نہ ہو جاتی، سعید کی بہتری ممکن نہیں تھی۔ میں نے نیلم سے درخواست کی کہ وہ مجھے وہ جگہ دکھائے جہاں فریدہ کی لاش پائی گئی ہو۔ اس نے مجھے اس کمرے کا تفصیلی معائنہ کروا دیا۔ وہ ایک بیڈروم تھا۔ نیلم نے کہا۔ "فریدہ کی لاش یہاں پائی گئی تھی اور اس کا لباس تار تار تھا۔"

میں نے کہا۔ "حالات کی صورت سے ظاہر ہوتا ہے، فریدہ کے ساتھ کچھ زبردستی کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور ناکامی کی صورت میں اسے قتل کر دیا گیا۔ کیا سعید میں اس قسم کا رجحان پایا جاتا تھا۔ آپ نے کبھی محسوس کیا، وہ فریدہ کو اس نظر سے دیکھتا ہو؟"

"میں نے کبھی ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن شیطان کا کچھ بھروسا نہیں، وہ انسان کو کب درندہ بنا دے۔"

میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا۔ اس کے الفاظ سے سعید کے لئے بدگمانی جھلکتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اس کی صفائی میں بول رہی تھی۔ یہ یا تو اس کی ذہنی پریشانی کا نتیجہ تھا یا پھر وہ کوئی بہت بڑی بات چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ "یعنی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ بعض مخصوص حالات میں سعید سے اس قسم کی حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔"

"وکیل صاحب! میں بے حد پریشان ہوں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ "میں ابھی تک ایک فیصد بھی نہیں سمجھ پائی ہوں کہ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا۔ پلیز! آپ کسی طرح سعید کو بچا لیں۔ آپ کا یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔"

اس کی حالت کے پیش نظر میں اسے دوبارہ ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہ اس وقت ایک مصیبت زدہ ہرنی نظر آتی تھی۔ میں چند لمحے اس کے نارمل ہونے کا انتظار کرتا رہا، پھر کہا۔

"نیلم صاحبہ! میں آپ کی پرابلم کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میری آواز میں گمبھیرتا تھی۔

"میں کوشش کروں گا، آپ کی پریشانی کو دور کر سکوں۔ لیکن گناہ گار اور بے گناہ کا فلسفہ خاصا تکنیکی ہے۔ آپ کا شوہر یا تو مجرم ہے یا نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر مجرم کون ہے؟ یہ سوال اپنی جگہ پر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتیں کہ فریدہ کا قتل ہوا اور اس قتل سے پہلے اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ زیردست نہ بن سکی جس کے نتیجے میں اس کا لباس تار تار ہو گیا۔ آخر کار ڈر خوف کی بنا پر زبردست نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ گویا اس سنسنی خیز منظر میں ایک قاتل کا کردار موجود ہے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ فریدہ کو سعید نے قتل نہیں کیا تو پھر تلاش کرنا ہوگا، فریدہ کا قاتل کون ہے؟ سعید کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اصل قاتل تک رسائی حاصل کرنا یا اس کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے۔"

"مم...... میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" وہ وحشت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔ "آپ جو کہیں گے، میں کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "پولیس عدالت میں چالان پیش کر دے پھر میں صورت حال کو دیکھتے ہوئے آپ کو خصوصی ہدایات دوں گا۔ فی الحال آپ خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ آپ کا ہوش و حواس میں رہنا بہت ضروری ہے۔"

"جی، میں کوشش کر رہی ہوں۔" وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اسی لئے میں اپنی امی کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ یہاں تنہائی میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں دل جوئی اور حوصلہ دینے کے لئے میرے اپنے تو موجود ہیں۔"

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ اس طرح خود کو سنبھالنے میں آپ کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لیں۔ اس دوران میں مجھ سے رابطہ کرنا ہو تو آپ مجھے فون کر سکتی ہیں اور...... اور اگر آپ کا کوئی کنٹیکٹ نمبر ہو تو مجھے دے دیں۔"

"امی کے گھر کا فون عارضی طور پر بند ہے۔" اس نے بتایا۔ "کوئی خاص بات ہوئی تو میں خود ہی آپ سے رابطہ کر لوں گی۔"

مزید دو چار باتوں کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ایک فوری خیال کے تحت نیلم سے سوال کیا۔ "آپ فیروزہ کو جانتی ہیں؟"

"کون فیروزہ!" اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا۔ "کوئی بھی فیروزہ!"

وہ چند لمحات تک الجھن زدہ انداز میں سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "میں فیروزہ نامی کسی عورت سے واقف نہیں۔"

اب میرے الجھنے کی باری تھی۔ نیلم کی طرح سعید نے بھی فیروزہ سے ناواقفیت کا اظہار کیا تھا

جبکہ فیروزہ محض اس بنا پر سامنے آنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ میں نے دانستہ فیروزہ کو سعید کے خیالات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اب میرے پاس ایک اچھا موقع تھا۔ میں نیلم کو ٹٹول کر فیروزہ کی حقیقت تک پہنچ سکتا تھا۔ فیروزہ کی ایک بات مجھے سرے سے ہضم نہیں ہوئی تھی اور وہ یہ کہ وہ اس کیس میں سلیپنگ مدعی کا رول ادا کرنا چاہتی تھی اور اصل مدعی سے بھی خود کو پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی ذات شکوک سے صاف نہیں تھی۔

میں نے نیلم کے سامنے فیروزہ کی وضع قطع اور حلیہ تفصیل سے بیان کیا اور پوچھا۔ ''اب آپ کے ذہن میں فیروزہ کی شخصیت اجاگر ہو گئی ہو گی۔ یہ عورت سوسائٹی آفس کے نزدیک ایک بنگلے میں رہائش پذیر ہے۔''

وہ چند لمحات تک مجھے گہری نظر سے تکتی رہی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''فیروزہ ویروزہ کا تو میرے ذہن میں کوئی تصور نہیں البتہ آپ نے اس عورت کا جو قد کاٹھ، حلیہ اور وضع قطع بیان کی ہے اس فریم پر میری ایک دیرینہ شناسا خوب فٹ بیٹھتی ہے۔''

''آپ کی اس دوست کا نام کیا ہے؟'' میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

نیلم نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میری دلچسپی از خود کئی گنا بڑھ گئی۔ اس نے اپنی کسی شناسا کا ذکر کیا تھا لیکن میں نے دانستہ دوست کا حوالہ دے کر نام دریافت کیا۔ نیلم نے اس فرق پر کوئی توجہ نہ دی اور بتایا۔

''اس کا نام فرحانہ ہے۔''

''کیا فرحانہ کی رہائش سوسائٹی آفس کے علاقے میں ہے؟''

''نہیں، وہ نارتھ ناظم آباد میں رہتی ہے۔''

''آپ مجھے اس کا ایڈریس دے سکتی ہیں؟''

''کیا کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ ''یہ آپ فیروزہ کو چھوڑ کر اچانک فرحانہ کے بارے میں کیوں کریدنے لگے۔ کیا ان دونوں کرداروں میں کوئی قدر مشترک ہے؟''

''قدر مشترک تو آپ نے خود بیان کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے فیروزہ کا حلیہ بتایا اور آپ نے فرحانہ کو اس پر فٹ کر دیا۔ بس یہی ایک بات ان دونوں میں مشترک ہے۔ رہائش کے سلسلے میں تو آپ اختلاف کر چکی ہیں۔''

وہ مطمئن انداز میں ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''فرحانہ نارتھ ناظم آباد کے ''بلاک جے'' میں رہتی تھی۔''

''رہتی تھی کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دراصل بات یہ ہے کہ کافی عرصے سے فرحانہ سے میرا

رابطہ نہیں ہوا اس لئے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کسی زمانے میں وہ نارتھ ناظم آباد میں رہتی تھی۔'' بات کے اختتام پر اس نے مجھے نارتھ ناظم آباد بلاک جے کا ایڈریس بھی بتا دیا جو میں نے اپنے پاس نوٹ کر لیا۔

میں پُرسوچ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ فرحانہ نارتھ ناظم آباد میں رہتی ہے۔ اب وہ صیغہ ماضی پر اتر آئی تھی۔ میں نے اسے مزید ٹٹولنے کی خاطر کہا۔

''یہ بھی تو ممکن ہے، فرحانہ آج کل سوسائٹی آفس کے علاقے میں رہتی ہو!''

''ہاں، یہ ناممکن تو نہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کوئی کہیں بھی رہائش اختیار کر سکتا ہے۔ میں نے کافی عرصے سے اس سے رابطہ نہیں کیا اس لئے اس کے تازہ ترین حالات سے واقف نہیں ہوں۔''

کوئی میرے اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ فرحانہ اور فیروزہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ شاید یہ میری چھٹی حس کی پکار تھی۔ میں نے اپنی سوچ کی مزید تصدیق کے لئے نیلم سے پوچھا۔

''میری فیروزہ اور آپ کی فرحانہ کی شکل و صورت اتفاق سے ایک جیسی نکل آئی ہے۔ آپ اپنی فرحانہ کے بارے میں مزید کچھ بتائیں گی؟ ہو سکتا ہے کوئی اور بات مشترک نکل آئے؟''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''آپ اپنی فیروزہ کے بارے میں بتائیں۔ میں تصدیق یا تردید کروں گی۔''

اس کے انداز نے مجھے باور کرا دیا کہ وہ فرحانہ کے لئے اپنے دل میں اچھے جذبات نہیں رکھتی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ غور تھی۔ شاید اسی وجہ سے فیروزہ پس پردہ رہ کر سعید کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ فرحانہ اور فیروزہ کو میں فی الحال فرض کردا ملا رہا ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا، وہ دونوں بالکل ہی مختلف شخصیات ہوں!

میں نے نیلم کی فرمائش پوری کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں ہی اپنی فیروزہ کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔'' پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا۔ ''فیروزہ سوسائٹی آفس کے علاقے میں رہتی ہے، یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ اب مزید سن لیں، فیروزہ کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ضعیف والدہ اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔ اندرونِ سندھ میں ان کی زرعی اراضی اور فش فارم ہے جہاں سے اچھی خاصی آمدن ہو جاتی ہے۔ کراچی کے علاقے گلشن اقبال اور طارق روڈ پر ان کا ایک ایک فلیٹ ہے جو کرائے پر اٹھے ہوئے ہیں۔''

وہ حیرت اور دلچسپی سے مجھے دیکھتی رہی۔ میری بات ختم ہوئی تو اس نے کہا۔ ''اب تو مجھے بھی شک سا ہونے لگا ہے کہ آپ کی فیروزہ اور میری فرحانہ کئی اعتبار سے بہت کلوز ہیں۔ مثلاً......'' اس نے تھوڑا وقفہ دیا پھر بتانے لگی۔ ''یہی دیکھ لیں، میری شناسا فرحانہ کے والد کا بھی انتقال ہو

چکا ہے۔ وہ چھوٹے بھائی اور والدہ کے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ زرعی اراضی اور فش فارم والی کہانی بھی مشترک ہے۔ البتہ فلیٹ دو کے بجائے تین کر لیں۔ گلشن، طارق روڈ اور نارتھ ناظم آباد۔''

اس کی فراہم کردہ معلومات پر مجھے حد درجہ حیرت تو ہوئی لیکن میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے دلی کیفیت کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور کہا۔ ''ہوسکتا ہے یہ محض اتفاق ہی ہو!''

میں نے یہ جملہ جان چھڑانے کی غرض سے ادا کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا، وہ فیروزہ کے بارے میں کسی تشویش ناک کرید میں مبتلا ہو جائے۔ فی الحال فیروزہ کی ذات کو پردے ہی میں رکھنا ضروری تھا۔ ویسے مجھے نوے فیصد یقین ہو گیا کہ فرحانہ، فیروزہ بن کر مجھ سے ملی تھی۔ وہ درپردہ رہ کر سعید اور نیلم کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ نیلم کے رویے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا، ان لوگوں کے فیروزہ یعنی فرحانہ کے ساتھ اچھے تعلق نہیں تھے۔ شاید یہی وجہ تھی، فیروزہ ان کے سامنے آنے سے کترا رہی تھی۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ پہلی فرصت میں فیروزہ اور فرحانہ کی کہانی کو منطقی انجام تک پہنچاؤں گا۔

میرے استفسار نے نیلم کے اندر تجسس جگا دیا تھا۔ وہ بڑی کھوجنے والی نظر سے مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ''وکیل صاحب! پہلے آپ نے بڑی شدومد کے ساتھ فیروزہ کے بارے میں پوچھا اور اب سرسری انداز میں کہہ رہے ہیں، ہوسکتا ہے یہ محض اتفاق ہی ہو۔ آپ کے ذہن میں کیا ہے؟''

''فی الحال کچھ نہیں ہے۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''جب کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔''

وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں جھلکتے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اگر آپ کی فیروزہ وہی شخصیت ہے جو میری فرحانہ ہے تو وعدہ کریں، آپ مجھ سے کچھ نہیں چھپائیں گے!''

''ٹھیک ہے!'' میں نے حتمی لہجے میں کہا اور جانے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی۔ میں ''خدا حافظ'' کہہ کر اس کے گھر سے نکل آیا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کر دیا۔

ابتدائی عدالتی کارروائی مکمل ہو گئی تو میں نے اپنے موکل کی درخواست ضمانت کی منظوری کے لئے ہاتھ پاؤں مارے لیکن باوجود کوشش کے بھی میں سعید کی ضمانت نہ کروا سکا۔ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی۔ جج نے بارہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں استغاثہ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ذکر ضرور کروں گا۔

استغاثہ کے مطابق ملزم اپنی گھریلو ملازمہ پر بری نظر رکھتا تھا لیکن اسے اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے کوئی مناسب موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

چناں چہ اس نے کہیں سے فون کروا کے اپنی بیوی کو اطلاع دی کہ اسٹور پر اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ جانتا تھا جب تک اس کی بیوی بندر روڈ سے ہو کر واپس آتی، وہ اپنی مہم سر کر لیتا خلاف معمول گھر آنے کے لئے بھی اس نے مقتولہ کے فون کا جواز گھڑ لیا تھا۔ اس فون کی تصدیق صرف مقتولہ کر سکتی تھی جسے ملزم نے بڑی سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگر وہ اس کی خواہش کے آگے سر جھکا دیتی تو اس کی زندگی ضائع نہ ہوتی۔ ملزم نے بدنامی کے خوف سے فریدہ کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کی بیوی جلد واپس آ گئی ورنہ وہ مقتولہ کے نچے ہوئے لباس کا بھی کوئی بندوبست کر لیتا تاکہ وہ قتل کی ایک عام واردات ہو کر رہ جاتی اور اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جاتا۔ پولیس نے آلہ قتل بھی برآمد کر لیا تھا جو کہ ایک آہنی ہتھوڑی تھی۔ اس ہتھوڑی کی بھرپور ضرب سے مقتول کی موت واقع ہوئی تھی۔ استغاثہ کے مطابق، ملزم کی نشان دہی پر آلہ قتل برآمد کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت کا وقت دوپہر بارہ اور ایک بجے کے درمیان بتایا گیا تھا اور موت کا سبب آہنی ہتھوڑی کی وہی ضرب تھی جس نے اس کے سر کے عقبی حصے کو چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ البتہ لیبارٹری ٹیسٹ کے مطابق مقتولہ کسی قسم کی زبردستی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

جب میرے موکل نے صحت جرم سے انکار کر دیا تو گواہیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے تفتیشی افسر نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ وکیل استغاثہ نے دو چار ضمنی سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔ اس کے بعد میری باری تھی۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد انکوائری افسر کے قریب آ گیا۔

وہ ایک صحت مند سب انسپکٹر تھا اور چہرے کے تاثرات سے خاصا ہوشیار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے چند لمحات تک اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''آئی او صاحب! آپ کا نام کیا ہے؟''

''بندے کو سجاد حسین کہتے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''سجاد صاحب! آپ کو اس واردات کی اطلاع کس طرح ہوئی؟''

''ملزم کے ایک پڑوسی نے تھانے فون کر کے ہمیں مطلع کیا تھا۔''

''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''متعلقہ تھانہ جائے واردات سے زیادہ دور نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں دس منٹ کے اندر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس وقت دوپہر کا ڈیڑھ بجا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر کیا دیکھا تھا؟''

''سب سے پہلے میں مقتولہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ ایک بیڈروم میں بستر پر نیم برہنہ پڑی تھی۔ اس کے سر کا عقبی حصہ بری طرح متاثر تھا اور بعد میں پتا چلا، وہی

چوٹ اس کی موت کا سبب بنی تھی۔'' اس نے حقارت آمیز نظر سے ملزم کو دیکھا اور دوبارہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''مقتولہ بے چاری نے بھی کیا قسمت پائی تھی۔ بیک وقت وہ خوش بخت بھی تھی اور بدنصیب بھی۔ اس کی آبرو تو سلامت رہی لیکن اس ظالم شخص نے اپنے بچاؤ کی خاطر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ شخص بدترین سزا کا حق دار ہے۔''

میں نے اس کے جوش اور غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ ''آلہ قتل کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں سمجھ نہیں سکا، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' وہ پلکیں جھپکا کر بولا۔ ''آلہ قتل تو وہ رکھا ہے۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے بڑی میز کی جانب اشارہ کیا۔

آلہ قتل کے نام پر حاصل کی گئی وہ آہنی ہتھوڑی ایک سیلوفین بیگ میں بند تھی۔ اس ہتھوڑی کے ایک سرے پر سیاہ دھبا بھی دکھائی دے رہا تھا جو یقیناً خون کا نشان تھا۔ خشک ہونے کے بعد اس کی رنگت سرخ سے سیاہ ہوگئی تھی۔ مقتولہ کے سر کے عقبی حصے سے پھوٹنے والا خون اس ہتھوڑی پر اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آئی او صاحب! آلہ قتل تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا، کیا واقعی اسی ہتھوڑی سے مقتولہ کو قتل کیا گیا ہے؟''

''آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں۔'' وہ سٹپٹا گیا۔ ''اس ہتھوڑی کے دستے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم نے ہتھوڑی پر موجود خون کے دھبے کا معائنہ بھی کروایا ہے۔ مقتولہ کا خون اس خون سے میچ کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں پولیس رپورٹ میں تفصیلاً درج ہیں۔ کیا آپ نے استغاثہ کا مطالعہ نہیں کیا؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی جرح جاری رکھی۔ ''سب انسپکٹر صاحب! آپ نے جائے واردات پر مقتولہ کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا جس سے استغاثہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کیا آپ نے پوسٹ مارٹم سے پہلے مقتولہ کا طبی یا طبعی معائنہ بھی کروایا تھا؟''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ آنکھیں سکیڑ کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا مقتولہ کے بدن پر کسی قسم کا کوئی نشان یا نشانات پائے گئے تھے...... زخم کے نشان...... خراشوں کے نشان؟''

وہ کچھ الجھ گیا، پھر تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''مقتولہ کا ہر قسم کا تفصیلی معائنہ ہوا تھا لیکن ایسے نشانات کہیں نہیں ملے۔ رپورٹ میں ایسا کوئی ذکر نہیں۔''

''میں نے اسی سبب یہ سوال کیا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں نے کتنی باریک بینی سے استغاثہ کا مطالعہ کیا ہے۔''

میرے جملوں میں چبھن اور طنز تھا لہٰذا وہ کچھ بولنے سے قاصر رہا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''یہی سوال میں اپنے موکل یعنی اس کیس کے ملزم کے حوالے سے بھی کروں گا۔ کیا گرفتاری کے وقت یا بعد میں اس کے جسم کا تفصیلی معائنہ کیا گیا تھا؟ خاص طور پر اس کے چہرے، ہاتھوں یا گردن پر کسی نوعیت کے کھرونچے تو دکھائی نہیں دیئے؟''

تفتیشی افسر نے نفی میں جواب دیا تو میں شیر ہوگیا۔

''آپ کے انکار سے میں کیا مطلب اخذ کروں۔ کیا ایسا کوئی معائنہ سرے سے کیا ہی نہیں گیا یا پھر ملزم کے بدن پر خراشوں وغیرہ کے نشانات نہیں پائے گئے؟''

''میرا خیال ہے، ایسا معائنہ نہیں کیا گیا۔'' اس نے دبے الفاظ میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''خیال نہیں، یقینی بات کریں؟''

''معائنہ نہیں کیا گیا۔''

''حالانکہ یہ بہت ضروری تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں، آپ میری بات کا مطلب بخوبی سمجھ رہے ہیں!''

انکوائری افسر نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔

میں نے کہا۔ ''آپ نے ملزم کے کسی پڑوسی کا ذکر کیا ہے جس نے تھانے فون کر کے آپ کو اس واردات کی اطلاع دی تھی۔ کیا آپ نے اس شخص سے بھی پوچھ گچھ کی؟''

''صلاح الدین کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔'' آئی او نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے دیگر پڑوسیوں سے بھی بیانات لئے ہیں۔''

''پڑوسیوں کا کیا کہنا ہے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔ وہ میرے سوال کا مطلب نہ سمجھ سکا اور الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ملزم کے پڑوسیوں نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ استغاثہ کے مطابق ملزم نے مقتولہ پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی جو کہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس قسم کی وارداتوں میں حملہ آور اپنی کامیابی کے لئے پوری کوشش کرتا ہے اور مجبور اپنے ہاتھ پاؤں اور زبان سے بچاؤ کی سعی کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں، جب کوئی بے بس اور لاچار شخص اپنی زبان کا استعمال کرتا ہے تو اس کی آواز بہت دور تک جاتی ہے۔ کیا ملزم کے پڑوسیوں میں سے کسی شخص نے اس قسم کی چیخ و پکار سماعت کی ہے؟''

وہ توجہ سے میری بات سنتا رہا اور جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ ''ملزم بہت ہی چالاک اور ہوشیار شخص ہے۔ اس نے مقتولہ پر ہاتھ ڈالنے سے قبل تمام کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کر لئے تھے لہٰذا اس نا کام کارروائی کی کوئی آواز باہر نہ نکل سکی۔''

''گویا کسی نے کچھ دیکھا اور نہ ہی سنا!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''ملزم اس شاطرانہ چال کے باوجود بھی اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا اور جھنجلا کر اس نے مقتولہ کی جان لے لی۔''

''آپ استغاثہ کی مخالفت میں بول رہے ہیں آئی او صاحب!'' میں نے با آواز بلند کہا۔ ''جبکہ آپ تو استغاثہ کے روح رواں ہیں۔ کچھ آیا سمجھ شریف میں؟''

پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور کہا۔ ''میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ اس نکتے کو خاص طور پر نوٹ کیا جائے۔''

''کون سا نکتہ؟'' تفتیشی افسر بوکھلا کر بولا۔

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنے موقف کی وضاحت کردیں پلیز!''

''تھینک یو یور آنر!'' میں نے سر کو تعظیمی جنبش دی اور کہنا شروع کیا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کے مطابق میرے موکل نے زبردستی کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد محض اس خوف سے فریدہ کو قتل کردیا کہ وہ اس کے بھیانک عزائم کو دنیا والوں پر ظاہر نہ کرسکے۔ میرے موکل کو ایسا کرنے کی ضرورت اسی صورت میں محسوس ہوتی اگر لوگ اس کی چیخ و پکار کی طرف متوجہ ہوتے۔ اب آئی او صاحب فرما رہے ہیں کہ ملزم نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر رکھے تھے اور یہ کہ کسی پڑوسی نے مقتول کی فریاد نہیں سنی۔ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں؟''

میں نے ذرا توقف کر کے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''علاوہ ازیں جائے وقوعہ پر مقتولہ کا لباس بری طرح متاثر ملا ہے۔ وہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا مگر اس کے بدن پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں پایا گیا جو کہ ایک ناممکن سی بات ہے۔ پھر اگر مقتولہ نے ملزم کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا تو اس کا یہی مطلب ہے کہ مقتولہ نے بھرپور مزاحمت کی ہوگی اور اس مزاحمت میں اس نے اپنے تحفظ کے لئے ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے جس کے نتیجے میں ملزم کے چہرے، ہاتھوں اور گردن پر کسی نہ کسی قسم کے نشانات ضرور آنا چاہئیں، خاص طور پر مقتولہ کے ناخنوں کے کھرونچے لیکن یہاں تو سرے سے ملزم کے جسم کا معائنہ ہی نہیں کرایا گیا۔ یہ بہت ہی انوکھی اور نرالی صورت حال ہے۔''

جج کو میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے دیکھا تو اطمینان کی سانس لی۔ وہ میری بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے فاتحانہ انداز میں یکے بعد دیگرے وکیل استغاثہ اور انکوائری افسر کو دیکھا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی بات کی وضاحت کرچکا جناب عالی!''

''آپ تفتیشی افسر سے اور کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں؟'' جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب

دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ میں نے جج کے استفسار کو عندیہ جانا اور انکوائری افسر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''استغاثہ کے مطابق آلہ قتل ملزم کی نشان دہی پر برآمد کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے، آلہ قتل آپ ہی نے برآمد کیا ہوگا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں، آلہ قتل یعنی آہنی ہتھوڑی کو آپ نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟''

وہ تھوڑا تامل کرنے کے بعد بولا۔ ''آلہ قتل ٹول بکس کے اندر سے ملا تھا۔''

''اور یہ ٹول بکس کہاں پڑا ہوا تھا؟''

''بیڈ کے نیچے!'' اس نے جواب دیا۔

''تھینک یو مائی ڈیئر انکوائری آفیسر!'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

✿✿✿

وکیل صفائی کی حیثیت سے میرے فرائض صرف یہاں تک محدود تھے کہ میں اپنے موکل یعنی اس کیس کے ملزم سعید کو بے گناہ ثابت کردیتا۔ اس کی گھریلو ملازمہ فریدہ کو کس نے اور کیوں قتل کیا یہ جاننا میری ذمے داری نہیں تھی۔ یہ استغاثہ کا کام تھا لیکن عدالتی معاملات حاضر غائب کے اصول پر چلتے ہیں۔ یہاں ہر کردار کے لئے ایک خانہ مخصوص ہوتا ہے...... ایک خانہ ملزم کا یا پھر مجرم کا...... اور یہ خانہ کبھی خالی نہیں رہتا۔ اگر ملزم کو بے گناہ ثابت کردیا جائے تو وہ ملزم کے خانے سے نکل جاتا ہے جس کی جگہ پر مجرم آن کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب تھا، اگر میں سعید کی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو لامحالہ قاتل بے نقاب ہوجاتا۔ یہ بالکل اس طرح ہوتا جیسے ایک بوتل میں پانی بھرا ہوا ہے۔ آپ اس بوتل میں سے پانی نکال دیں۔ اب وہ بوتل پانی کے وجود سے خالی ہوگئی لیکن درحقیقت وہ بوتل خالی نہیں کہلائے گی کیونکہ پانی کی جگہ اب ہوا نے لے لی ہے۔ علم اور سائنس میں دلچسپی رکھنے والے لوگ میری بات آسانی سے سمجھ گئے ہوں گے۔

آئندہ پیشی سے قبل مجھے اپنے ایک ذاتی کام سے بلوچ کالونی جانا پڑ گیا۔ واپسی کے راستے میں، میں محمود آباد سے گزرا اور ایک نظر نیلم کو دیکھنے کے لئے رک گیا۔ ویسے نیلم مجھے بتا چکی تھی کہ وہ اپنی امی کے پاس رہنے چلی گئی ہے۔ میں نے سوچا، اگر نیلم سے ملاقات نہ بھی ہوئی تو آس پڑوس والوں سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اتفاق سے اس روز میری ملاقات اس بلڈنگ کے مالک سے ہوگئی۔

مالک عمارت کا نام ڈیوڈ تھا اور اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ خود بھی

اسی بلڈنگ کی تیسری منزل پر رہائش پذیر تھا۔ ڈیوڈ کرسچین تھا اور نہایت ہی سادہ، شائستہ مزاج۔

میں نے سعید والے پورشن کے دروازے پر جھولتے تالے کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ڈیوڈ سے پوچھا۔ ”کیا نیلم ابھی تک اپنی امی کے پاس مارٹن روڈ پر ہی رکی ہوئی ہے؟“

ڈیوڈ کو معلوم نہیں تھا کہ میں سعید کے کیس میں وکیل صفائی کا کردار ادا کر رہا ہوں۔ پہلے ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی لہٰذا اس نے سنجیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ نیلم کے کون ہیں؟“

”میں اس کے شوہر کا وکیل ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔

”پھر تو آپ کو نیلم کے بارے میں پوری واقفیت ہونا چاہئے۔“ اس کی سنجیدگی برقرار تھی۔

”کیا وہ آپ سے رابطے میں نہیں ہے؟“

اس کا انداز مجھے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی اہم بات تھی۔ میں نے کہا۔ ”اتفاق سے کئی روز سے ہمارا رابطہ نہیں ہو سکا۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ”کیوں، کیا کوئی گڑبڑ والی بات ہے؟“

”گڑبڑ یا امن و امان کا زیادہ پتا تو آپ کو ہوگا۔“ ڈیوڈ نے بڑے اخلاق کے ساتھ کہا۔ ”میں تو صرف آپ کو اتنا بتا سکتا ہوں کہ اب نیلم سے ملاقات کے لئے آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے یہ مکان چھوڑ دیا ہے۔“

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”مکان چھوڑ دیا ہے...... کیا مطلب؟“

”وکیل صاحب! مطلب بہت آسان اور واضح ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”سعید اور نیلم میرے کرائے دار تھے۔ سعید قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر عدالتی چکر میں پھنس گیا اور نیلم اپنی ماں کے پاس مارٹن روڈ چلی گئی۔ ابھی تین روز قبل وہ اپنے کسی رشتے دار کے ساتھ میرے پاس آئی تھی اور اس نے مکان چھوڑنے کی بات کی تھی۔ میں اسے منع نہیں کر سکتا تھا۔ کسی کو زبردستی اپنا کرائے دار بنائے رکھنے کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں لیکن میں نے پھر بھی علاقے کے تھانے سے رجوع کر کے اس بات کی اجازت لے لی تا کہ بعد میں مجھ پر کوئی عذاب نہ آئے۔ پولیس والوں نے اس سلسلے میں کوئی روڑا نہیں اٹکایا۔ میں نے ایڈوانس کی رقم نیلم کو واپس کر دی اور وہ اپنا سامان لے کر یہاں سے رخصت ہو گئی۔ اب اس سے ملاقات کے لئے آپ کو اس کی امی کے گھر مارٹن روڈ جانا ہوگا۔“

میرے پاس اس کا مارٹن روڈ والا پتا نہیں تھا۔ نیلم نے بتایا تھا، اس کی امی کا فون عارضی طور پر بند تھا اور یہ بھی وعدہ کیا تھا، کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ خود ہی مجھ سے رابطہ کرے گی۔ کرائے کے مکان کو چھوڑ دینا کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ شاید اسی لئے نیلم نے مجھے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا ہو۔ وہ جس قسم کے حالات سے دوچار تھی ان میں اسے تنہا رہنا بھی نہیں چاہئے تھا، کجا ایک

ایسے گھر میں جہاں قتل کی واردات ہو چکی ہو۔

میں نے مالک مکان ڈیوڈ سے استفسار کیا۔ ”کیا اس نے آپ کے پاس اپنی امی کا پتا چھوڑا ہے؟“

اس نے نفی میں جواب دیا۔ ”میں نے پوچھا اور نہ ہی اس نے بتایا۔“

میں مزید دس منٹ تک ڈیوڈ سے سعید کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔ اس گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ سعید اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک امن پسند اور صلح جو شخص تھا۔ آج تک کسی سے اس کا جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ میں نے فریدہ کے حوالے سے ڈیوڈ کو کریدا۔

”آپ کا کیا خیال ہے مسٹر ڈیوڈ، سعید مجرمانہ حملے اور قتل کا ارتکاب کر سکتا ہے؟“

”بظاہر تو وہ کہیں سے ایسا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن وکیل صاحب! کیا کہہ سکتے ہیں۔ انسان کو شیطان بنتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے...... اور صنفِ مخالف والا معاملہ تو بہت ہی حساس اور نازک ہوتا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا ”سعید چھ سات ماہ سے میرا کرائے دار تھا۔ اس دوران میں، میں نے اس میں ایسی کوئی خامی یا عیب نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پھر وہی بات آ جاتی ہے کہ انسانی نفس کی کارفرمائی کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ یہ بہت ہی پیچیدہ نفسیات کا مالک ہوتا ہے۔“

ڈیوڈ، سعید کے بے گناہ یا گنہگار ہونے کے بارے میں ففٹی ففٹی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کی یہ رائے بہت ہی محتاط اور نپی تلی تھی۔ میں نے اس کے ایک اور کرائے دار صلاح الدین کے بارے میں استفسار کیا۔ صلاح الدین استغاثہ کے گواہوں میں شامل تھا اور دوسری منزل کے فلیٹ نمبر چار میں رہتا تھا۔

ڈیوڈ نے بتایا۔ ”صلاح الدین لگ بھگ پانچ سال سے میرے پاس رہ رہا ہے اور مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔“

”وہ معاملات کا کیسا ہے؟“

”میرے ساتھ تو اس کے معاملات بہت کھرے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ اس وقت گھر میں موجود ہوگا؟“

”معلوم کرنا پڑے گا۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”کیا آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں؟ ویسے مجھے امید نہیں، وہ آپ سے ملاقات کرے۔ آپ کہیں تو میں دکھواتا ہوں!“

”میں اسے عدالت میں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ویسے آپ نے کس بنا پر یہ بات کی ہے کہ وہ مجھ سے ملاقات نہیں کرے گا؟“

ڈیوڈ نے بتایا۔ ”میری معلومات کے مطابق صلاح الدین استغاثہ یعنی آپ کی مخالف پارٹی کا گواہ ہے اس لئے مجھے یقین ہے، وکیل استغاثہ نے اسے خاص قسم کی ہدایات جاری کر رکھی ہوں

گی۔“

”آپ قانونی معاملات کے بارے میں خاصی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں!“ میرا انداز ستائشی تھا۔

وہ بولا۔ ”ہر شخص کو یہ سوجھ بوجھ ہونی چاہئے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں یہ رواج نہیں۔ لوگوں کی اکثریت ایسی معلومات جمع کرنے میں مصروف رہتی ہے جو ان کے لئے زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتیں۔“

”یہ بات تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ میں نے تائید کی۔ ”اسی لئے ہماری عوام انگلی پکڑ کر چلنے کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔ اب یہ ان کی قسمت پر منحصر ہے۔ اگر انہیں کوئی مضبوط اور راست انگلی میسر آ جاتی ہے تو ان کی بگڑی بننے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ بصورت دیگر اگر وہ کسی ٹیڑھی اور مفاد پرست انگلی پر ہاتھ ڈال دیں تو وہ ان کا گھی نکال کر اپنی راہ ہولیتی ہے۔“

ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”اور...... عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔“

ڈیوڈ کی زبانی مجھے پتا چلا کہ محمود آباد ہی میں اس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی جہاں پر پیکنگ کے لئے استعمال ہونے والے ہر قسم کے گتے کے ڈبے بنتے تھے۔ اس فیکٹری کی آمدنی اچھی خاصی تھی۔ میں نے ڈیوڈ سے پوچھا۔

”وقوعہ کے روز آپ گھر پر تھے یا فیکٹری میں؟“

”میں فیکٹری میں تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”بلکہ جب قتل کا یہ واقعہ پیش آیا، میں اس وقت فیکٹری میں بھی نہیں تھا۔ ایک پارٹی سے وصولی کرنے میں گلشن اقبال گیا ہوا تھا۔ مجھے اس سانحے کے بارے میں تین بجے معلوم ہوا جب میں واپس فیکٹری آیا تھا۔ یہ اطلاع پاتے ہی میں گھر پہنچا لیکن اس وقت تک پولیس اپنی کارروائی مکمل کر چکی تھی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا، اس روز آپ کی بلڈنگ میں دوپہر بارہ سے ایک بجے کے درمیان جو کچھ پیش آیا، آپ اس پر روشنی نہیں ڈال سکتے؟“

”سوری وکیل صاحب!“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

میں نے مصافحہ کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

اسی رات میرے گھریلو فون پر فیروزہ کی کال موصول ہوئی۔ ”ہیلو بیگ صاحب! کیا حال ہے؟“ اس نے بڑی اپنائیت سے سوال کیا۔

پچھلی ملاقات میں اس نے میرا گھر کا فون نمبر بھی لے لیا تھا تاکہ کسی ایمرجنسی میں فوری رابطہ کیا جا سکے۔ لیکن اس کی آواز میں موجود ترنگ اور چہک بتاتی تھی، ایمرجنسی کی کوئی بات نہیں ہو گی۔ فیروزہ سے ہونے والی اب تک کی ملاقاتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ ایک خوش مزاج عورت تھی۔ اس ماخوذ نتیجے نے پہلی ملاقات کے ابتدائی تاثر کو مکمل طور پر زائل کر دیا تھا۔ وہ

زندہ دل ہونے کے ساتھ ساتھ فراخ دل بھی تھی۔

میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”میں بالکل خیریت سے ہوں اور اللہ کے فضل و کرم سے حالات بہت اچھے ہیں۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”پچھلی عدالتی کارروائی کی مکمل رپورٹ مجھے مل چکی ہے۔ وہاں میرا ایک خاص نمائندہ موجود تھا۔ ماشاء اللہ! آپ ٹھیک جا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے، سعید بہت جلد آزاد فضا میں سانس لے رہا ہو گا۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔“ میں نے پورے وثوق سے کہا۔ ”ویسے میں آپ کی رسائی اور طاقت کو ماننے لگا ہوں۔“

آخری جملہ میں نے اسے گھسنے کی خاطر ادا کیا تھا۔ نیلم سے ہونے والی ملاقات کے بعد فیروزہ میری نگاہ میں پہلے سے زیادہ پراسرار ہو گئی تھی۔ میں فیروزہ اور فرحانہ کے درمیان الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے ابھی تک فیروزہ کو براہ راست چھیڑا نہیں تھا۔

اس نے ایک نیچا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”کیوں بھئی، آپ میری طاقت اور رسائی کو کیوں ماننے لگے۔ کیا میں نے ماؤنٹ ایوریسٹ کو ہاتھ پر اٹھا رکھا ہے؟“

”ماؤنٹ ایوریسٹ کو ہاتھ پر اٹھانا یا قدموں تلے دبانا تو معمولی بات ہے۔“ میں نے اسے چڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے کارنامے اس سے کہیں آگے کی شے ہیں۔“ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی، میں نے جلدی سے کہا۔ ”اب یہی دیکھیں نا! آپ ایک بار بھی عدالت نہیں گئیں لیکن وہاں ہونے والی کارروائیوں کی مکمل رپورٹ آپ کو مل جاتی ہے۔ آپ تو مجھے امریکہ کے صدر سے زیادہ بارسوخ لگنے لگی ہیں۔“

اس مرتبہ وہ کھل کر ہنسی اور شوخی سے بولی۔ ”آپ مذاق بہت اچھا کرتے ہیں۔ میں جاوَلی لوگوں کو بہت پسند کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے، آپ کی وائف کو کبھی بوریت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہو گا۔ آپ......“ اس نے یک بارگی جملہ ادھورا چھوڑا اور پوچھ بیٹھی۔ ”بیگ صاحب! کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟“

”ابھی تک میں اس نعمت سے محروم ہوں۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”اوہ!“ اس نے ایک طویل اور معنی خیز سانس خارج کی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ کو میری حالت پر افسوس ہو رہا ہے؟“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گڑبڑا گئی۔

”کیا آپ شادی شدہ ہیں؟“

”نہیں!“ وہ قطعیت سے بولی۔ پھر اچانک اس نے موضوع بدل دیا۔ ”بیگ صاحب! کیس دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے۔ آپ کو مزید رقم کی ضرورت تو ہو گی!“

میں سمجھ گیا، وہ شادی، خصوصاً اپنی شادی کو زیرِ بحث نہیں لانا چاہتی۔ مجھے بھی اس موضوع پر گفتگو کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا لہٰذا میں نے اسے درکار رقم کے بارے میں بتا دیا۔

وہ بولی۔ ''میں آئندہ پیشی سے پہلے آپ کی مطلوبہ رقم پہنچا دوں گی۔''

میں نے فیروزہ کو نیلم کے بارے میں بتایا کہ اس نے کرائے کا مکان خالی کر دیا ہے اور مستقل طور پر وہ اپنی والدہ کے یہاں مارٹن روڈ پر منتقل ہو گئی ہے۔

''وہ ایسی ہی پاگل عورت ہے۔'' فیروزہ نے بے ساختہ کہا۔ ''پتا نہیں، سعید اس جیسی بددماغ اور خود پسند عورت کے ساتھ کس طرح گزارہ کر رہا تھا۔''

میں نے محسوس کیا، وہ نیلم کے لئے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات نہیں رکھتی۔ اس کے برخلاف سعید سے وہ گہری ہمدردی ظاہر کر رہی تھی اور اسے باعزت بری کروانے کے لئے سامنے آئے بغیر پیسے کو پانی کی طرح بے دریغ خرچ کر رہی تھی۔ میں نے نیلم سے ہونے والی ملاقات سے بھی یہی تاثر لیا تھا کہ وہ اپنی دیرینہ شناسا فرحانہ کو ناپسند کرتی تھی۔ اگر فیروزہ اور فرحانہ ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے تو پھر میرے ذہن میں ایک سنسنی خیز کہانی جنم لے رہی تھی۔ جب کوئی عورت کسی دوسری عورت سے بیزاری کا اظہار کرے مگر اس کے شوہر کی مدد کرنے پر تلی نظر آئے تو پھر بہت کچھ ڈھکا چھپا نہیں رہتا۔ میں نے فیصلہ کیا، میں بہت جلد بلی کو تھیلے میں سے باہر لانے کی کوشش کروں گا۔ ورنہ تھیلے کے اندر اس کی اچھل کود بے شمار غلط فہمیوں اور لاتعداد سوالات کو جنم دیتی رہتی!

میں نے نیلم کی حمایت میں کہا۔ ''میرے خیال میں تو اس نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ محمود آباد والے گھر میں وہ تنہائی کی زندگی کیسے گزارتی۔ مارٹن روڈ والے گھر میں کم از کم اس کی حوصلہ افزائی اور دل جوئی کرنے والے تو ہوں گے۔''

''بس جی، اپنے اپنے خیال کی بات ہے۔'' وہ جان چھڑوانے والے انداز میں بولی پھر کہا۔ ''ٹھیک ہے، آپ سے پھر بات ہو گی۔ اب میرے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ خدا حافظ!''

میرے بولنے کا انتظار کئے بغیر اس نے ٹیلی فونک رابطہ موقوف کر دیا۔

میں نے بھی زیرِ لب مسکراتے ہوئے ریسیور کو کریڈل کر دیا۔ یہ اچھا ہی تھا کہ اس وقت وہ میری مسکراہٹ کو دیکھ نہیں رہی تھی ورنہ پتا نہیں، وہ اس سے کون سا مفہوم نکال بیٹھتی۔ فیروزہ ٹیلی فونک خوش گپیوں کے لئے انتہائی موزوں تھی۔ کوئی بھی باذوق اور جمال پرست شخص روبرو اس سے زیادہ دیر تک گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ میں فیروزہ کی برائی نہیں کر رہا بلکہ ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ حقیقت خاصی تیکھی اور تلخ ہوا کرتی ہے!

خدا نے ہر شخص کو ہر نعمت سے نہیں نوازا۔ دولتِ حُسن نہ سہی مگر قدرت نے اسے دولتِ دنیا سے سرفراز کرتے ہوئے بڑی فیاضی کا ثبوت دیا تھا اور وہ اس دولت کو خرچ کرنے میں دریا دلی کا

مظاہرہ کرتی تھی۔ یہ بہت بڑا وصف تھا۔

✿✿✿

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں نیلم کھڑی تھی۔

وہ خاصی مضمحل اور پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اسے پریشانی میں مبتلا ہونا بھی چاہئے تھا۔ جس عورت کا شوہر قتل کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھا رہا ہو وہ شادیانے تو نہیں بجا سکتی!

نیلم کی عمر تیس کے اریب قریب رہی ہو گی۔ فیروزہ کے برخلاف قدرت نے اسے حُسن و جمال سے نواز رکھا تھا تاہم وقت کی گردش نے ان میاں بیوی کو مالی تنگی کا شکار تو کر ہی رکھا تھا۔ فریدہ والی افتاد نے تو جیسے ان کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ نیلم کا بہت برا حال تھا۔ اس نے موسم کی مناسبت سے پرنٹڈ لان کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا لیکن وہ بات کہاں جو سہاگنوں کے پہناوے میں ہوتی ہے۔ اس کا شوہر سلامت تھا مگر وہ کسی بیوہ سے زیادہ اُداس اور کسی کھنڈر سے زیادہ ویران دکھائی دیتی تھی۔

عدالت کے دستور اور گواہی کے اصول کے مطابق نیلم نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا، پھر اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ جب وہ فارغ ہوئی تو وکیل استغاثہ سوالات کے لئے اس کے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

''نیلم صاحبہ!'' اس نے ملزم کی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔ ''اس کیس میں آپ کی حیثیت کئی اعتبار سے اہم ہے۔ آپ مدعی کی حیثیت بھی رکھتی ہیں اور استغاثہ کی گواہ بھی ہیں۔ آپ وہ پہلی ہستی ہیں جو جائے وقوعہ پر سب سے پہلے پہنچی تھیں لہٰذا میرے سوالات کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''وکیل استغاثہ لفظ مدعی کا بڑا غلط استعمال کر رہے ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے مخاصمانہ نظر سے مجھے دیکھا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! اس کیس میں فریدہ کی حیثیت مقتولہ کی سی ہے۔ اس کے لواحقین یا پھر استغاثہ تو مدعی ہو سکتا ہے لیکن ملزم کی بیوی نیلم ہرگز نہیں۔''

وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''مقتولہ کے ورثا میں سے کوئی موجود نہیں اور جہاں تک استغاثہ کی گواہ محترمہ نیلم کا تعلق ہے تو یہ خاتون مقتولہ کی مالکن رہی ہیں آپ انہیں سرپرست بھی کہہ سکتے ہیں لہٰذا ان کے مدعی ہونے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔''

''شاید آپ بھول رہے ہیں یا پھر آپ کی سمجھ اس وقت زندگی کے کسی اور بکھیڑے میں مصروف ہے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''ملزم کی بیوی نیلم ہر صورت میں اس بات کی خواہاں

ہے کہ اس کا شوہر جلد از جلد رہائی پا کر اس کے پاس پہنچ جائے۔ وہ اگر اس کیس کی مدعی ہونے لگی تو پھر اس کی کوشش ہونا چاہئے کہ فریدہ کے مبینہ قاتل کو فوراً سزا ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ استغاثہ کی گواہ نیلم مدعی کی تعریف پر پوری نہیں اترتی۔" میں نے ذرا توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر عمائدین عدالت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مقتول کے لواحقین کی عدم دستیابی کی صورت میں استغاثہ یعنی قانون ہی مدعی کی حیثیت رکھتا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ جج نے میرے حسب منشا وکیل مخالف کو کچھ ہدایات جاری کیں اور تاکید کی کہ اپنی جرح کو جاری رکھتے ہوئے گواہ سے سوالات کا سلسلہ شروع کرے۔ وکیل استغاثہ نے اس سبکی پر ایک مرتبہ پھر مجھے کھا جانے والی نظر سے دیکھا اور وٹنس باکس میں کھڑی نیلم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"نیلم صاحبہ! محمود آباد میں رہائش اختیار کرنے سے پہلے آپ لوگ کہاں رہتے تھے؟"

گواہ نے جواب دیا۔ "ہم پی ای سی ایچ سوسائٹی میں رہتے تھے۔"

"وہاں تو ماشاء اللہ آپ کا ٹھیک ٹھاک بنگلا تھا۔" وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لیکن افسوس کہ حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔"

اس اظہارِ افسوس پر گواہ خاموش رہی تو وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے، سوسائٹی والے بنگلے پر بیک وقت دو دو ملازمائیں ہوا کرتی تھیں۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔"

"پھر یکے بعد دیگرے ان ملازماؤں کو نکال باہر کیا آپ نے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کن انکھیوں سے جج کی طرف دیکھا۔

"کیا میں ان ملازماؤں کے نام پوچھ سکتا ہوں آپ سے؟"

"......ایک کا نام اللہ رکھی اور دوسری کا شمع تھا۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔ "ان کی عمروں کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟"

"آمنہ کی عمر تیس سال اور......"

"ایک منٹ!" وکیل استغاثہ نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے گھریلو ملازماؤں کے نام اللہ رکھی اور شمع بتائے ہیں۔ یہ آمنہ کہاں سے آ گئی؟"

"آمنہ ان دونوں سے پہلے ہمارے بنگلے پر کام کرتی تھی۔"

"کیا اسے بھی ملازمت سے برخاست کیا گیا تھا؟"

"جی ہاں۔" نیلم نے ایک مرتبہ پھر نگاہ چراتے ہوئے جواب دیا۔

"ونڈر فل!" وکیل استغاثہ چہکا۔ "اب آپ اللہ رکھی اور شمع کی عمریں بتا دیں۔"

استغاثہ کی گواہ نیلم نے علی الترتیب ان کی عمریں بیس اور پندرہ سال بتائیں۔

وکیل استغاثہ نے خاصا ہوم ورک کیا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیلم گھریلو ملازمات کے بارے میں جواب دیتے ہوئے اتنا گھبرائی ہوئی کیوں تھی۔ یقیناً اس کی گھبراہٹ کے پیچھے کوئی خاص بات رہی ہوگی۔ پھر اگلے سوال کے نتیجے میں وہ خاص بات پوشیدہ نہ رہ سکی۔

وکیل استغاثہ نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"نیلم صاحبہ! معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ان تین ملازمات کو کس غلطی پر نوکری سے نکالا گیا ہے؟"

"غلطی......غلطی تو کوئی......نہیں تھی......" نیلم بوکھلا گئی۔

وکیل استغاثہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "تو گویا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ لوگوں کو ملازم رکھنے اور نکالنے کا خصوصی شوق ہے؟"

"نن......نہیں......" وہ نروس ہو گئی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیسی بات ہے؟"

وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مقتولہ فریدہ سے پہلے بھی ایک ملازمہ آپ کے محمود آباد والے گھر میں کام کرنے آتی تھی۔ غالباً اس کا نام ثمینہ تھا اور اس کی عمر بائیس سال تھی۔ اسے بھی دو ماہ کی نوکری کے بعد برخاست کر دیا گیا۔" وہ ذرا دیر کے لئے خاموش ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا یہ درست ہے کہ آمنہ، اللہ رکھی، شمع اور ثمینہ کو ایک ہی سبب نوکری سے نکالا گیا تھا؟"

"نن......نہیں......" وہ نحیف آواز میں بولی۔ "جج......جی......"

"یہ نہیں اور جی کا کیا مطلب ہوا؟"

جج نے گواہ کو سرزنش کی۔ "بی بی! سوچ سمجھ کر صرف ایک جواب دیں۔"

"ہاں یا نہ!" وکیل استغاثہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہا......ہاں......" نیلم شکستہ لہجے میں بولی۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ وہ سبب آپ کا شوہر اور اس مقدمے کا ملزم سعید تھا؟"

نیلم بے حد پریشان نظر آنے لگی۔ اس موقع پر اصولاً مجھے اس کی مدد کو لپکنا چاہئے تھا لیکن میں خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا۔ میں وکیل استغاثہ کے زاویے کو بالکل درست ڈگری کے ساتھ سمجھ گیا تھا۔ تشویش کی کوئی بات نہیں تھی لہٰذا میں مطمئن تھا۔

وکیل استغاثہ کے سوال کا جب جواب نہ آیا اور نیلم خاموش کھڑی ہراساں ہوتی رہی تو جج کو ایک مرتبہ پھر اسے تنبیہ کرنا پڑی۔ "بی بی! وکیل استغاثہ تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔"

"میں اپنا سوال دہراتا ہوں تاکہ گواہ کو جواب دینے میں کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔" وکیل

استغاثہ نے مکاری سے کہا۔

''نیلم صاحبہ! کیا یہ درست ہے کہ آپ اپنے شوہر کی آوارہ مزاجی کے باعث ملازماؤں کی پکی چھٹی کرتی رہی ہیں۔ یہ آئے دن کسی نہ کسی چکر میں پڑا رہتا تھا؟''

''وہ جی......'' نیلم نے لکنت زدہ انداز میں بتایا۔ ''یہ تو تمام مردوں خصوصاً شوہروں کی عادت ہوتی ہے کہ......وہ دوسری عورتوں میں......دلچسپی لیتے رہتے ہیں......''

''بات اگر دیکھ ریکھ اور بول چال تک محدود رہتی تو میرے خیال میں ملازماؤں کو نوکری سے نکالنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔'' وکیل استغاثہ نے اپنی کوشش کی دیوار پر ایک اور رداچڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ملزم کے لچھنوں نے آپ کو مجبور کر دیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''واقعی، میں سعید کی طرف سے خاصی تشویش میں مبتلا تھی۔''

''پھر یہ سلسلہ فریدہ تک آن پہنچا۔'' وکیل استغاثہ نے عیاری سے کہا۔ ''لیکن اب ملزم بھی محتاط ہو چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ اس ملازمہ کو بھی چلتا کر دیں لہٰذا اس نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے ایک انوکھی راہ نکالی مگر افسوس کہ فریدہ نے اس کی خواہش کے آگے بھرپور مزاحمت کی جس کے نتیجے میں اس کی عزت تو محفوظ رہی مگر وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔''

نیلم کمزور سی آواز میں منمنائی۔ ''میں نے جو چیز اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی اس کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ سعید نے ایسا جرم کیا ہوگا!''

''یہ چیز آپ نے اپنی آنکھوں سے اس لئے نہیں دیکھی کہ اس مرتبہ ملزم کوئی چانس لینے کو تیار نہیں تھا۔ آپ پہلے ہی کئی مرتبہ اس کے منصوبے کے راستے میں روڑے اٹکا چکی تھیں۔'' وکیل استغاثہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''چنانچہ اب کی بار اس نے مضبوط پلاننگ کی۔ کہیں باہر سے تمہیں فون کروایا کہ وہ اچانک بیمار ہو گیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ تم یہ اطلاع ملتے ہی فوراً گھر سے نکل پڑو گی۔ اس کا یہ یقین بے جا بھی نہیں تھا۔ تم نے ویسا ہی ردِعمل دیا جو وہ چاہتا تھا۔''

وہ ایک لمحے کو سانس ہموار کرنے کی غرض سے رکا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ملزم نے اپنی طبیعت کی خرابی سے متعلق فون کہیں نزدیک ہی سے کیا تھا۔ آپ لگ بھگ سوا بارہ بجے گھر سے نکلیں اور چند منٹ بعد ملزم گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیلی کہانی سنانے کے لئے فریدہ کی لاش ہی کافی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی یہی بتاتی ہے کہ فریدہ کی موت دوپہر بارہ اور ایک بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ جب آپ میڈیکل اسٹور سے خجل خوار ہو کر واپس گھر آئیں تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ تمہاری نظر میں خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے ملزم نے ایک انوکھی کہانی گھڑ رکھی تھی۔ اس نے تمہاری طبیعت کی ناسازی کے حوالے سے فریدہ کے فون کا ذکر کیا حالانکہ آپ جانتی ہیں، فریدہ نے گھر سے میڈیکل اسٹور پر کوئی فون نہیں کیا تھا۔ وہ اگر اس قسم کی کوئی حرکت کرتی تو آپ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی

تھی۔ ملزم نے ایسی عیاری دکھائی کہ اس کی بات کی تصدیق کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک فریدہ ہی ایسی تھی جو تصدیق یا تردید کر سکتی تھی لیکن ملزم نے اسے تو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔''

لمبی چوڑی تقریر کے بعد وکیل استغاثہ امید بھری نظر سے ملزم کی بیوی اور استغاثہ کی گواہ نیلم کو دیکھنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے طولانی لیکچر سے ضرور متاثر ہوئی ہوگی۔ لیکن چند لمحے متذبذب رہنے کے بعد نیلم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''پتا نہیں، آپ کس قسم کی کہانیاں سنا رہے ہیں۔ میں اپنے شوہر کو ایسا نہیں سمجھتی۔''

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''یہ آپ کی سادگی، شرافت اور شوہر پرستی ہے جس کا فائدہ ملزم نے اٹھایا ہے ورنہ آپ کی جگہ اگر کوئی چنٹ اور طرار بیوی ہوتی تو ملزم کو دانتوں پسینہ آ جاتا۔ وہ یا تو ایسی چھچھوری حرکتوں سے توبہ کر لیتا یا پھر آپ اسے جوتے مار کر گھر سے نکال دیتیں......کم از کم اتنا تو ضرور کرتیں کہ آپ ایسے بے وفا، ہرجائی اور آوارہ شوہر سے علیحدگی اختیار کر لیتیں۔''

وکیل استغاثہ نے اپنی دانست میں ملزم کو لٹکوانے کا کامل بندوبست کر دیا تھا۔ نیلم پریشانی کی حالت میں کھڑی کبھی جج کو اور کبھی اپنے شوہر کو دیکھتی رہی۔ چند لمحات کے بعد وکیل استغاثہ نے ایک اور حملہ کیا۔

''نیلم صاحبہ!'' اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس بات سے انکار تو نہیں کریں گی کہ آپ میاں بیوی کے درمیان اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا؟''

نیلم نے برہمی سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور جواب دیا۔ ''یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔ دنیا میں ایسے میاں بیوی کوئی نہیں ہوں گے جن کی آپس میں تو تکرار نہ ہوتی ہو۔ ایک جگہ رہیں تو برتن آپس میں ٹکراتے ہی رہتے ہیں۔''

وکیل استغاثہ کی ڈھٹائی دیدنی تھی۔ اس نے کہا۔ ''وقوعہ کے روز بھی تم دونوں میں خاصی بحث وتکرار ہوئی تھی!''

''ہاں ہوئی تھی۔''

''آپ کا کہنا تھا، فریدہ نے میڈیکل اسٹور پر فون نہیں کیا تھا جب کہ وہ بھی اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ میڈیکل اسٹور سے کسی نے آپ کو بلایا نہیں تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

نیلم نے کہا۔ ''آپ غلط نہیں کہہ رہے۔ ہم دونوں ہی اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔''

مزید دو چار ضمنی سوالات کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح ختم کر دی۔

میں اپنی باری پر گواہوں والے کٹہرے کے پاس آیا اور استغاثہ کی گواہ نیلم سے سوال کیا۔

''آپ کا شوہر عموماً کتنے بجے ڈیوٹی پر جاتا تھا؟''

''ٹھیک گیارہ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میڈیکل اسٹور عام دکانوں کی بہ نسبت دیر سے

کھلتے ہیں۔“

”اس کی چھٹی کتنے بجے ہوتی تھی؟“

”رات نو بجے۔“

”کافی لمبی ڈیوٹی ہے!“

”مجبوری میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے وکیل صاحب!“

میں دانستہ ہلکے پھلکے سوالات کر رہا تھا تا کہ وہ گھبراہٹ کے عالم سے نکل آئے اور اس کا اعتماد بحال ہو جائے ورنہ ان عام سے سوالات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ کی ملازمہ مقتولہ فریدہ کتنے بجے کام کرنے آتی تھی؟“

”دس بجے صبح۔“ اس نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے، جب وہ آتی تھی تو ملزم گھر پر موجود ہوتا تھا؟“

”جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔“

”اور مقتولہ اپنا کام کب تک ختم کر لیتی تھی؟“

”لگ بھگ دو بجے دوپہر تک۔“

”اس کے بعد وہ کیا کرتی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”واپس چلی جاتی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”کیا مقتولہ کی رہائش کہیں آس پاس ہی تھی؟“

نیلم نے جواب دیا۔ ”وہ اعظم بستی میں رہتی تھی۔“

”مجھے پتا چلا ہے، اس کا دنیا میں کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا؟“

”آپ کی معلومات درست ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہ اس دنیا میں تنہا تھی اور اعظم بستی میں کسی شناسا فیملی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس فیملی کی بیشتر عورتیں بھی دیگر گھروں میں اسی نوعیت کے کام کرتی ہیں۔“

نیلم کے کشیدہ اعصاب نارمل ہونے لگے۔ میں نے محسوس کیا، اس کے لہجے میں توانائی لوٹ رہی تھی۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا وقوعہ کے روز بھی آپ کا شوہر اپنے مقررہ وقت پر ہی گھر سے نکلا تھا؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اور مقتولہ فریدہ بھی دس بجے صبح ہی کام پر آتی تھی؟“

”جی ہاں۔“

”واقعات اور شواہد کے مطابق وقوعہ کے روز ٹھیک سوا بارہ بجے میڈیکل اسٹور سے آپ کو فون موصول ہوا کہ ملزم کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے لہٰذا آپ وہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔“ میں

نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ وہاں پر پہنچیں تو معلوم ہوا، ملزم بارہ بجے دوپہر وہاں سے نکل چکا تھا اور میڈیکل اسٹور والوں نے اس بات کی تصدیق بھی کی کہ انہوں نے آپ کو کسی قسم کا فون نہیں کیا تھا لیکن اس بات کی تصدیق نہ ہو سکی کہ آیا فریدہ نے بارہ بجے ملزم کو بلانے کے لئے فون کیا تھا یا ملزم دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا؟“

”اس فون کی تصدیق یا تردید فریدہ ہی کر سکتی تھی۔ جواب باقی نہیں رہی تھی۔“

”آپ کا اپنا کیا خیال ہے؟“

”مجھے یقین ہے، فریدہ نے اس قسم کا کوئی فون نہیں کیا تھا۔“

میں نے سوال کیا۔ ”ذرا سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز مقتولہ ساڑھے گیارہ بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک کے دوران میں تھوڑی دیر کے لئے گھر سے باہر تو نہیں گئی تھی؟“

”میں آپ کے سوال کا زاویہ سمجھ رہی ہوں۔“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”شاید آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ فریدہ نے کہیں باہر سے فون کر دیا ہو گا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔“ وہ بات ختم کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی، شاید یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کا اندازہ درست ہے یا غلط!

میں نے پوچھا۔ ”ذہن پر زور دیں اور ذرا سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز مقتولہ دس بجے سے سوا بارہ بجے تک کیا کام کرتی رہی تھی؟ میں نے سوا بارہ کا وقت اس لئے دیا ہے کہ اس کے بعد کی بات آپ کو معلوم نہیں ہو گی کیونکہ اسی وقت میڈیکل اسٹور سے فون آ گیا تھا اور آپ فی الفور گھر سے روانہ ہو گئی تھیں؟“

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔ ”مقتولہ نے حسب معمول برتنوں کی دھلائی صفائی سے کام کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد جھاڑو پونچا کیا گیا۔ ڈسٹنگ کے بعد اس نے کپڑے دھونا شروع کئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب سعید گھر سے نکل رہا تھا، فریدہ میلے کپڑوں کو باتھ روم میں جمع کر رہی تھی۔“

”اور جب آپ میڈیکل اسٹور والی اطلاع پر گھر سے روانہ ہوئیں تو مقتولہ کیا کام کر رہی تھی؟“

”وہ اس وقت تک باتھ روم میں مصروف تھی۔“

”آپ نے گھر سے نکلتے وقت اس سے کیا کہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”میں نے اسے فون کے بارے میں بتایا اور کہا کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، وہ چھٹی نہ کرے۔ چاہے دو سے زیادہ وقت ہو جائے۔“

”لیکن جب آپ واپس آئیں تو فریدہ موت سے ہمکنار ہو چکی تھی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ لگ بھگ ڈیڑھ بجے دوپہر واپس آئی تھیں اور اس وقت آپ کا شوہر گھر کے اندر موجود تھا، سخت پریشانی کی حالت میں۔ کیا میں غلط کہہ

رہا ہوں؟"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔" اس نے تائیدی انداز میں کہا۔ "سعید اس بیڈ کے قریب کھڑا تھا جس پر فریدہ کی لاش پڑی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے جو کچھ بتایا، وہ عدالت کے ریکارڈ پر آ چکا ہے لہٰذا میں دہراؤں گی نہیں۔ اس کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فون کے معاملات پر بحث ہونے لگی اور یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ آس پاس لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔ پھر کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، سب کے سامنے ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ذرا اچھی طرح سوچ کر بتائیں، جب آپ میڈیکل اسٹور سے واپس آئیں تو ملزم کے علاوہ اور کوئی شخص بھی گھر میں موجود تھا؟"

"قطعاً نہیں۔" وہ پورے وثوق سے بولی۔

"نیلم صاحبہ!" میں نے قدرے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ "جب آپ گھر میں داخل ہوئیں تو تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے؟"

"نہیں۔" وہ قطعیت سے بولی۔ "صرف داخلی دروازہ بھڑا ہوا تھا، باقی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھلے تھے جیسا کہ میں انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔"

"جبکہ پولیس آپ کے بعد یعنی میڈیکل اسٹور سے لوٹنے کے بعد وہاں پہنچی تھی اور انکوائری آفیسر نے دعویٰ کیا ہے کہ اس وقت گھر کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔" میں نے طنزیہ نظر سے وکیل استغاثہ اور آئی او کی جانب دیکھا۔ "اس بیان کی کیا حقیقت ہے؟"

"یہ تو آپ تفتیشی افسر ہی سے پوچھیں۔" وہ ناگواری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کسی کے بیان پر میں کیا تبصرہ کر سکتی ہوں!"

میں نے جرح کے سلسلے کو تھوڑا آگے بڑھایا اور استغاثہ کی گواہ سے پوچھا۔ "آپ نے وکیل استغاثہ کے مختلف سوالات کے جواب میں ملازمت بدلنے کی خاصی طویل کہانی سنائی ہے اور اس کا سبب ملزم کو بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تمام مرد خصوصاً شوہر اس قسم کا ہرجائی پن کرتے رہتے ہیں۔ کیا آپ کا شوہر کبھی کسی سنگین معاملے میں ملوث رہا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

"کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اسے خاصا ٹائٹ رکھا ہوا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یا پھر اسے کسی سنگین معاملے کا موقع ہی نہیں ملا؟"

"میرا خیال ہے، یہ معاملات ٹائٹ یا لوز رکھنے پر منحصر نہیں ہوتے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "بعض مرد صرف دل پشوری کرنے کے لئے اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ حدود کو پھلانگ سکیں اور...... جو ہمت والے ہوتے ہیں یعنی سکہ بند بدکردار اور بے وفا! وہ کسی روک ٹوک یا سمجھانے بجھانے سے باز نہیں آتے۔ انہیں اپنی اور دوسرے کی عزت کا خیال

نہیں ہوتا۔"

"آپ اپنے شوہر کا شمار کس قسم کے مردوں میں کریں گی؟"

"اول الذکر۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"یعنی بزدل...... صرف نگاہ بازی سے دل پشوری کرنے والے؟"

"جی ہاں، میری یہی مراد تھی۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے، ملزم کو کبھی کھل کھیلنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔" میں نے دانستہ ایسا سوال کیا جو استغاثہ کے فیور میں جاتا تھا اس سے میرا ایک خاص مقصد تھا۔ "اگر آپ اسے وقت اور موقع دے دیتیں تو ممکن تھا، وہ دل پشوری کرنے سے آگے بھی قدم بڑھاتا؟"

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میرا خیال ہے، سعید اس قماش کا مرد نہیں۔ ہماری زندگی میں کئی بار ایسے موقع آئے کہ وہ کئی کئی گھنٹے تک گھر میں اکیلا رہا لیکن میں نے اس کی کسی ایسی حرکت کے بارے میں نہیں سنا۔"

"آپ کی وضاحت سے تو لگتا ہے، ملزم کو اس قسم کی حرکات کے لئے اتنا لمبا چوڑا ڈراما کرنے کی ضرورت ہرگز نہیں تھی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یعنی ٹیلی فون والا ڈراما؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ اسے ایسا کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہو۔"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ میں عدالت کے کمرے سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

۞۞۞

سہ پہر کے تین بجے تھے اور میں اس وقت نارتھ ناظم آباد کے ایک بنگلے کے سامنے کھڑا تھا۔ "بلاک جے" میں واقع وہ بنگلہ عالیشان اور قابل دید تھا۔ نیلم کے مطابق کسی زمانے میں اس کی ایک شناسا فرحانہ اس بنگلے میں رہتی تھی۔ آج میرے پاس کچھ وقت تھا لہٰذا میں نے سوچا، یہ فرحانہ اور فیروزہ کا معاملہ بھی نمٹا ہی دوں۔ اس بنگلے کا پتا نیلم نے مجھے دیا تھا۔

اطلاعی گھنٹی پر بنگلے کا گیٹ وا ہوا اور تھوڑی ہی دیر بعد میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ پھر چند لمحات کے بعد فرحانہ سے میری ملاقات ہو گئی۔ فرحانہ یعنی فیروزہ!

فیروزہ کی نظر مجھ پر پڑی تو اسے ایک جھٹکا سا لگا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ میں نے بنگلے کے اندر رسائی حاصل کرنے کے لئے داؤ کھیلا

تھا اس لئے جب تک وہ مجھ سے آ کر ملی نہیں، پہچان نہیں سکی کہ اس کا ملاقاتی کون ہے۔

میں فیروزہ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے سوچا، آج میں ہی آپ کو عدالتی کارروائی کی رپورٹ پیش کر دوں۔ آپ کا انفارمر تو پتا نہیں کب آئے گا۔ اب آپ جلدی سے بتائیں، فیروزہ اور فرحانہ میں کیا فرق ہے؟''

''آپ بیٹھ تو جائیں۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آج میں آپ کو یہ تفصیل بھی بتا ہی دوں۔''

اس کی فرمائش پر میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد فیروزہ نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں مجھے اس راز سے آگاہ کیا جو فیروزہ اور فرحانہ کی شخصیات سے وابستہ تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ نیلم سے مجھے اس کے بنگلے کا پتا ملا تھا۔

فیروزہ کے مطابق، کسی زمانے میں وہ نیلم کی بڑی گہری دوست تھی۔ اس کا نام فرحانہ ہی تھا۔ فیروزہ اور سوسائٹی آفس والے بنگلے کا ڈراما اس نے مجھے بے خبر رکھنے کے لئے رچایا تھا اور اس میں اس کی بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بعد میں مجھے سب کچھ بتا دیتی۔ وہ چونکہ نیلم اور سعید کے علم میں لائے بغیر ان کی مدد کرنا چاہتی تھی اس لئے بھی مجھے بے خبر رکھا گیا۔ بہرحال، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

فرحانہ نے بتایا کہ کسی زمانے میں وہ اور سعید ایک دوسرے کو بڑی شدت سے پسند کرتے تھے اور عنقریب ان کی شادی ہونے والی تھی۔ لیکن پھر فرحانہ کے توسط سے سعید کی ملاقات نیلم سے ہو گئی۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد فرحانہ کو احساس ہوا کہ کھیل بگڑ گیا تھا۔ سعید اس کی طرف سے غافل ہونے کے ساتھ ساتھ نیلم کی جانب مائل ہونے لگا۔ اس نے دونوں کو سمجھانے کی حتی المقدور کوشش کی لیکن اسے اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب سعید نے نیلم سے شادی کرنے کا اعلان کر دیا۔ فرحانہ کا دل اس بری طرح ٹوٹا کہ اس نے ان دونوں سے قطع تعلق کر لیا۔ ان سے خود کبھی ملنے کی کوشش کی اور نہ ہی ان کے ملنے کی کوئی راہ کھلی چھوڑی۔ فرحانہ کو دونوں پر سخت غصہ تھا، خاص طور پر وہ نیلم سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اس کے خیال میں اس کھیل کو بگاڑنے میں نیلم کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔

اس واقعے کو کافی عرصہ گزر گیا اور پھر اچانک فرحانہ کو معلوم ہوا کہ سعید کا کاروبار بری طرح تباہ ہو گیا تھا۔ اسے سعید کی بربادی کا دکھ تو ہوا لیکن اس نے کبھی اس سے ملنے یا اظہارِ ہمدردی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سعید کی مالی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن نیلم کا تصور اس کے ارادے کو پامال کر دیتا۔ اسی دوران میں فریدہ کے قتل اور سعید کی گرفتاری والا واقعہ پیش آ گیا تو فرحانہ کو خود پر اختیار نہ رہا۔ وہ کسی بھی قیمت پر سعید کو پھانسی کے پھندے تک جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ جیسا بھی تھا، اس کا محبوب تھا۔ سعید کو بچانے کے لئے اس کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا اور اس

نے فیروزہ بن کر مجھ سے ملاقات کی اور وہ اپنے مقصد میں غالب حد تک کامیاب بھی رہی تھی۔ میں کیس کو اپنی جانب موڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ میری کارکردگی سے مطمئن تھی۔

''آپ نے میری کہانی تو سن لی بیگ صاحب!'' فرحانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں کہ آج رات عدالت میں کیا کارروائی ہوئی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق آج سعید کی بیوی نیلم کی گواہی تھی؟''

''آپ کو ملنے والی اطلاع بالکل درست ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اور وکیل استغاثہ نے نیلم پر خاصی طویل جرح کی ہے۔''

''اس سے کیا نتیجہ اخذ ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے اسے آج کی عدالتی کارروائی سے آگاہ کر دیا۔

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ سنسنی خیز انداز میں بولی۔ ''میں قاتل تک پہنچ گئی ہوں!''

اب میرے پھڑکنے کی باری تھی۔ ''قاتل کون ہے؟''

''نیلم!'' وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں بولی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔'' اس کے لہجے میں وثوق کی کوئی کمی نہیں تھی۔

میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''آپ کس بنا پر اتنی بڑی بات کہہ رہی ہیں؟''

''کس بنا پر!'' اس نے میرے الفاظ دہرائے اور چند لمحات کا توقف کرنے کے بعد پُرسوچ انداز میں بتانے لگی۔ ''بیگ صاحب! نیلم میری پرانی دوست ہے۔ مجھ سے زیادہ کوئی اس کی فطرت اور مزاج سے واقف نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسے انتہائی لالچی اور خود غرض پایا ہے۔ دولت کے حصول کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آ سکی۔'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''فریدہ کو قتل کرنے سے اسے کون سی دولت مل جاتی؟''

''آپ سمجھے نہیں۔'' وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔ ''فریدہ کو اس نے اس لئے قتل کیا ہو گا کہ سعید اس کے قتل کے الزام میں پھانسی چڑھ جائے۔''

''یہ بھی عجیب بات ہے۔'' میں زیادہ الجھ گیا۔ ''اگر سعید کو فریدہ کے قتل کے جرم میں کوئی خوفناک سزا ہو جاتی ہے تو اس میں نیلم کو کیا مالی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''جب ان کی شادی ہوئی تو سعید کا کاروبار خوب چمک رہا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ایک پُرکشش اور خوبصورت مرد بھی ہے۔ نیلم نے اس پر ڈورے ڈالے اور

اسے مجھ سے چھین لیا۔اس کی ساری زندگی مارٹن روڈ کے عسرت زدہ کوارٹر میں گزری تھی۔سعید کی بیوی بن کر اس نے بہت عیش کیے۔لیکن اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔سعید مالی طور پر بہت نیچے چلا گیا ہے۔اس کے پاس نہ اپنا بنگلا رہا اور نہ ہی بزنس۔وہ چند روپوں کے لئے ایک میڈیکل اسٹور کی نوکری کرنے پر مجبور ہے۔'' اس نے ذرا رک کر سانس درست کی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔''نیلم کے لئے سعید میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ دولت اور عیش و آرام کی بھوکی نیلم نے شاید کوئی اور آشیانہ دیکھ لیا ہے جو سعید سے جان چھڑانے کے لئے اس نے اتنا کامیاب ڈراما کھیلا مگر میں کسی بھی قیمت پر سعید کو موت کے منہ میں نہیں جانے دوں گی۔ٹھیک ہے، اس نے مجھ سے بے وفائی کی لیکن اس وقت اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔آپ سے میں درخواست کروں گی کہ نیلم اور سعید کو کسی طرح یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں پردے کے پیچھے رہ کر سعید کو بری کروانے کی کوشش کر رہی ہوں۔خاص طور پر نیلم کو تو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنا چاہئے۔وہ بہت ہی چالاک اور مکار عورت ہے۔''

''لیکن وہ ایسی لگتی تو نہیں۔'' میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''وہ تو عدالت میں اپنے شوہر کی حمایت میں بول رہی تھی۔''

''آپ اسے نہیں جانتے۔کبھی میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ وہ میرے محبوب پر ڈاکا نہیں ڈالے گی لیکن پھر اس نے اپنی گندی فطرت کے مطابق سعید کو مجھ سے چھین لیا۔'' فرحانہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔''اور جہاں تک شوہر کی حمایت کا تعلق ہے تو شاید آپ نے ایک نکتے پر غور نہیں کیا۔اس نے آپ کی جرح کے جواب میں تو شوہر پرستی دکھائی ہے لیکن اس سے پہلے وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں وہ بھری عدالت کو یہ باور کرا چکی تھی کہ سعید گھریلو ملازمات کے ساتھ ملوث ہو جایا کرتا تھا چنانچہ اسے جلدی جلدی ملازمائیں بدلنا پڑیں۔اس نے بڑی معصومیت اور بھولے پن سے سعید کی کردار کشی کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ فریدہ کے قتل والے واقعے میں وہ پوری طرح فٹ ہو جائے۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر مزید کہا۔''اس کے مطابق سعید نے فریدہ پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نقلی ٹیلی فون کا سہارا لیا اور گھنٹے دو گھنٹے کے لئے نیلم کو گھر سے آؤٹ کر دیا تاکہ وہ اپنے عزائم کی تکمیل کر سکے۔نیلم نے ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ میری طرح وہ بھی جانتی ہے، سعید اس لائن کا آدمی نہیں۔اس ڈرامے میں مزید رنگ آمیزی کے لئے اس نے فریدہ کو قتل بھی کر دیا۔میرے ذہن میں سب کچھ واضح ہو گیا ہے کہ اس لومڑی نے کس طرح کیا ہوگا۔''

وہ بات ختم کر کے معنی خیز انداز میں مجھے تکنے لگی۔ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے ذہن میں جو کچھ واضح ہوا ہے اس سے مجھے آگاہ کرو؟''

''ضرور کروں گی۔'' وہ ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔''نیلم نے یقیناً کوئی دوسری

اسٹرانگ پارٹی دیکھ لی ہے۔اس کے پاس حسن و خوب صورتی کی دولت ہے۔سعید سے نجات حاصل کئے بغیر وہ دوسری پارٹی جوائن نہیں کر سکتی لہٰذا اس نے سعید کو راہ سے ہٹانے کے لئے فریدہ کے قتل کا مذموم منصوبہ بنایا۔سعید شرافت سے اسے چھوڑنے والا نہیں تھا اور فریدہ کی موت سے اس کا کوئی نقصان نہیں تھا۔'' وہ چند لمحات کے لئے رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''نیلم نے اپنی ملازمہ فریدہ سے واقعی فون کروایا ہوگا۔فریدہ اس کے حکم سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نیلم کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر سعید کو فوراً گھر پہنچنے کے لئے کہا ہوگا۔فون کے سلسلے میں سعید نے قطعاً کوئی دروغ گوئی نہیں کی۔نیلم نے بارہ بجے سعید کو فون کروایا اور پھر اس کے فوراً بعد اس نے موقع پا کر فریدہ کے سر کے عقبی حصے میں آہنی ہتھوڑی کا کاری وار کر دیا۔فریدہ دھڑام سے گری ہوگی۔نیلم نے چھینا جھپٹی اور زبردستی کا تاثر دینے کے لئے جگہ جگہ سے فریدہ کے کپڑے پھاڑ دیئے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ فریدہ میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تو وہ گھر سے نکل گئی۔آلۂ قتل یعنی آہنی ہتھوڑی کو اس نے ٹول بکس میں ڈال دیا۔وہ ٹول بکس سعید کے تصرف میں رہتا تھا۔اس کے پھنسنے کے مکمل انتظام ہو گئے تو ڈراما مکمل کرنے کے لئے اس نے یہ کہانی گھڑی کہ میڈیکل اسٹور سے کسی نے فون کر کے اسے بلایا تھا۔''

فرحانہ ذرا رک کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی۔ جب میں کچھ نہیں بولا تو اس نے اپنا بیان جاری رکھا۔''نیلم اتنی دیر گھر سے باہر رہی جب تک سعید گھر پہنچ جاتا۔پھر اس نے دیکھا کہ سعید کو گھر میں داخل ہوئے چند منٹ ہو گئے ہیں تو وہ خود بھی اندر آ گئی۔اس کے بعد ان دونوں میں فون کے معاملات پر بحث و تکرار ہونے لگی پھر جو کچھ ہوا، وہ سب نے دیکھا۔پولیس نے موقع پر آ کر کارروائی کی اور سعید کو فریدہ کے قتل کے الزام میں پکڑ کر لے گئے لیکن کسی کا دھیان نیلم کی طرف نہیں گیا۔وہ سب کی نظروں میں معصوم اور مظلوم بنی رہی......اور اب تک بنی ہوئی ہے۔''

میں نے حیرت اور تعجب کے ملے جلے تاثرات سے فرحانہ کو دیکھا اور پوچھا۔''آپ تو یہ سب کچھ اس طرح بتا رہی ہیں جیسے آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا ہو؟''

''بیگ صاحب! آپ یقین کریں، اس واقعے کا ایک ایک حصہ اسی طرح ہوا ہوگا۔'' وہ تیقن سے بولی۔''میں نیلم کی عیاری اور نیچر کو جانتی ہوں۔بعد میں آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔''

''بعد کی تو بعد میں دیکھی جائے گی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔''فی الحال تو آپ کے بیان کا زیادہ تر حصہ مفروضات اور الزامات پر مبنی نظر آتا ہے۔معذرت کے ساتھ!'' میں نے ایک لمحہ رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پوری سچائی کے ساتھ کہا۔''میں آپ کی اس کہانی پر یقین نہیں کر سکتا۔''

"تو کیا آپ اس کیس سے دست بردار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "سعید کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے میں نے اب تک جو کوشش کی ہے وہ خاصی نتیجہ خیز نظر آرہی ہے۔ مجھے امید ہے، میں بہت جلد اسے باعزت بری کروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے بے یقینی اس کہانی کے بارے میں ظاہر کی ہے جو نیلم سے متعلق آپ نے سنائی ہے۔"

وہ خواب ناک انداز میں بولی۔ "میری تو یہ شدید خواہش ہے کہ سعید کی بریت کے ساتھ ہی نیلم بھی فریدہ کے قتل کے الزام میں پھانسی چڑھ جائے!"

فرحانہ کے لہجے میں جنون کی سی کیفیت تھی۔ میں اس کے دلی جذبات کو سمجھ رہا تھا۔ سوچ کی یہ کج روی اس نفرت کا نتیجہ تھا جو وہ نیلم کے ساتھ اپنے دل میں رکھتی تھی۔ بقول اس کے، نیلم نے اپنے حُسن کا جال بچھا کر اس سے اس کا محبوب چھین لیا تھا۔ اگر واقعہ یہی تھا تو وہ نیلم جیسی لٹیری کے لئے نفرت کے میدان میں کسی بھی حد تک سوچ سکتی تھی۔ اس کی سوچ پر پہرا بٹھایا جاسکتا تھا اور نہ ہی عمل کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالی جاسکتی تھی۔

مگر میں اتنا بے وقوف اور جذباتی نہیں تھا کہ اس کے مجروح جذبات کی تسکین کے لئے خواہ مخواہ نیلم کے خلاف محاذ بنا کر کھڑا ہو جاتا۔ ہاں، اگر وہ مجھے کسی زاویے سے مشکوک نظر آتی تو بات الگ تھی۔ میں نے واشگاف اور دوٹوک الفاظ میں فرحانہ سے کہا۔

"فرحانہ صاحبہ! آپ نے جو کیس میرے حوالے کیا ہے وہ اپنے منطقی انجام کی جانب گامزن ہے اور انشاء اللہ میں بہت جلد سعید کو بری کروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اگر آپ نیلم کو فریدہ کا قاتل سمجھتی ہیں تو اس کے جرم کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو پھر اس بارے میں سوچا جائے گا۔ میں اس بات سے تو اختلاف نہیں کرسکتا کہ قاتل کو قرار واقعی سزا ملنا چاہئے۔"

وہ قدرے مایوس ہوگئی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں فرحانہ کو "خدا حافظ" کہہ کر اس کے بنگلے سے نکل آیا۔

آئندہ دو تین پیشیوں پر استغاثہ کے باقی ماندہ گواہوں کو شہادت اور جرح کے لئے عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان میں میرے موکل کا پڑوسی صلاح الدین اور میڈیکل اسٹور کے عملے کے دو افراد بھی شامل تھے لیکن ان گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کے نتیجے میں کوئی نئی بات سامنے نہ آسکی۔ میڈیکل اسٹور والوں کا موقف تھا کہ وہاں سے کسی نے فون کر کے ملزم کی بیوی کو نہیں بلایا تھا۔ اسی طرح انہوں نے ملزم کے فون سننے کی تصدیق تو کی تھی تاہم وہ یہ بات نہیں جانتے تھے، میرے موکل نے فون پر فریدہ سے بات کی تھی یا کسی اور سے۔ سعید کے پڑوسی صلاح الدین نے تھانے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ وہ بھی کوئی کارآمد بات سامنے

نہ لاسکا۔ چنانچہ جج نے دلائل کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ آئندہ پیشی دس دن بعد تھی۔

✿✿✿

جس روز عدالت میں دلائل دیئے جاتے ہیں یا فیصلہ سنایا جاتا ہے اس دن وہاں سامعین کا خاصا رش ہوتا ہے۔ خاص طور پر فیصلے کے روز تو پریس فوٹو گرافرز اور اخباری نمائندے جوق در جوق وہاں پہنچتے ہیں۔ عدالت میں بڑی رونق اور ایک میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔

دلائل کا آغاز استغاثہ کی طرف سے ہوا اور وکیل استغاثہ نے میرے موکل کو قاتل ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ زیادہ تر باتیں وہی تھیں جو اس کے پلیٹ فارم سے اب تک عدالت کے ریکارڈ پر جمع ہو چکی تھیں۔ وکیل استغاثہ نے اپنے موقف کی حمایت میں خوب بڑھ چڑھ کر دلائل دیئے اور بالآخر جج سے درخواست کی کہ وہ میرے موکل کو قرار واقعی سزا سنا دے۔

اپنی باری پر میں نے دلائل دینے شروع کئے اور انکوائری افسر سمیت وکیل استغاثہ اور گواہوں کے بیانات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ میں نے کراری آواز میں کہا۔

"جناب عالی! استغاثہ کے مطابق میرے موکل نے پہلے ایک موقع پیدا کیا اور پھر اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے مقتول پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہونے کی صورت میں اس کا غصہ اور جھنجلاہٹ اس بلندی کو پہنچ گئے تھے کہ پکڑے جانے یا بدنامی کے خوف سے اس نے مقتول فریدہ کو قتل کر دیا۔

"جناب عالی! مجرمانہ حملے کے نتیجے میں جب فریق ثانی مدافعت پیش کرتا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ حملہ آور کے جسم پر ایک خراش تک نہ آئے۔ خصوصاً اس کا چہرہ، ہاتھ اور گردن کھرونچوں سے بھر جاتے ہیں لیکن کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ میرے موکل کے جسم پر اس قسم کا ایک نشان نہیں پایا گیا جب کہ اس مجرمانہ جدوجہد میں فریق ثانی یعنی مقتول فریدہ کا لباس تار تار ہوتا چلا گیا۔

"میرے موکل کا جسمانی معائنہ تو نہیں کرایا گیا جو کہ ایک سنگین کوتاہی میں شمار ہوتا ہے مگر مقتولہ کا مکمل طبی وطبعی ٹیسٹ ہوا تھا اور...... حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کہیں بھی اس امر کی نشان دہی نہیں کی گئی کہ مقتول کے ناخنوں میں سے ملزم کے بدن کے ریشے ملے ہوں۔ اس سے صرف ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ مقتولہ نے خود کو بچانے کے لئے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی ورنہ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ مقتول کے ناخنوں میں ملزم کے گوشت کے ریشے دستیاب نہ ہوتے اور ملزم کے بدن پر خراشیں نہ آتیں جبکہ دوسری جانب مقتول کے لباس کی دھجیاں بکھر گئیں۔ اس سے صرف ایک ہی بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ مقتول پر کسی قسم کا کوئی مجرمانہ حملہ کیا ہی نہیں گیا۔ اسے ہتھوڑی کا خطرناک وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا پھر مجرمانہ حملے کا تاثر دینے کے لئے اس

کے لباس کو جگہ جگہ سے پھاڑ دیا گیا۔

''جناب عالی! اس ناپختہ ذہن کی کارروائی سے لگتا ہے، قاتل جو کوئی بھی تھا وہ بہت ہی اناڑی اور ناتجربہ کار تھا لیکن استغاثہ کی عقل کہاں گھاس چرنے چلی گئی تھی کہ اس نے اسی بات کو بنیاد بنا کر میرے موکل کو پھانسی دینے کا منصوبہ بنا ڈالا؟

''جناب عالی! یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر میرے موکل نے آہنی ہتھوڑی سے مقتول کی جان لی ہوتی تو وہ آلۂ قتل کو ضرور کہیں چھپا دیتا۔ ٹول بکس میں کھلا چھوڑ کر وہ پولیس والوں کو اپنے پیچھے لگانے کا اہتمام نہ کرتا۔

''ایک اور خاص بات! انکوائری افسر کے مطابق جب وہ جائے واردات پر پہنچے تو عیار ملزم نے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر رکھے تھے لیکن اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ گھر کے دروازے اور کھڑکیاں قطعاً بند نہیں تھیں۔ ملزم کی بیوی نیلم اور پڑوسی صلاح الدین اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں۔''

میں نے چند لمحات تک خاموشی اختیار کی پھر حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد دوبارہ جج کی طرف متوجہ ہو گیا اور اپنے دلائل کو آخری ٹچ دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! ان واقعات، شواہد اور دلائل کی روشنی میں استغاثہ جھوٹ کے کسی پلندے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ میرے موکل کو باعزت بری کرنے کے احکام صادر کرے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے ساتھ ہی یہ درخواست بھی کروں گا کہ پولیس کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ مقتول فریدہ کے اصل قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر کے حوالہ عدالت کرے تاکہ ایک جانب انصاف کے تقاضے پورے ہوں تو دوسری طرف اس بے سہارا اور غریب عورت کی روح کو بھی قرار آ جائے۔''

میرے دلائل کا سلسلہ ختم ہوا تو جج اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ لگ بھگ پندرہ منٹ کے بعد وہ دوبارہ نمودار ہوا اور فیصلے کے لئے تاریخ دے کر اس نے عدالت برخاست کر دی۔

اگلی پیشی پر عدالت نے میرے موکل سعید کو باعزت بری کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی جج نے انکوائری آفیسر کو تاکید کی کہ وہ اس کیس کو دوبارہ اسٹڈی کرے اور مقتول فریدہ کے قاتل کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرے تاکہ اس کیس کا دوسرا رخ بھی تکمیل سے ہمکنار ہو سکے۔

میں کیس کی کامیابی پر خوش تھا۔ ظاہر ہے، یہ خوش ہونے ہی کی بات تھی۔ اسی رات فرحانہ کا فون آ گیا۔ ''بیگ صاحب! میں آپ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ آپ نے سعید کو رہائی دلا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں ساری زندگی یاد رکھوں گی۔''

''میں نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میری خوش قسمتی اور قدرت کا احسان کہ میں اس کوشش میں کامران ہو گیا۔ ویسے ایک بات ہے۔'' میں نے ذرا رک کر کہا۔ ''اگر میں یہ کیس ہار جاتا تو بھی آپ اسی طرح مجھے ٹریٹ کرتیں۔ یعنی خوشی اور شادمانی کے ساتھ؟''

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور پورے اعتماد سے بولی۔ ''میں آپ کی ناکامی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے سعید کی بے گناہی کا پورا یقین تھا اور آپ تو جانتے ہیں، یقین بہت طاقت ور جذبہ ہوتا ہے!''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''خدا اور بندے کا تعلق بھی یقین کا رہین منت ہے ورنہ کون کسی کو پوچھتا ہے۔''

''آپ ابھی میرے اس یقین کا ایک اور معجزہ بھی دیکھیں گے۔'' وہ پراسرار انداز میں بولی۔

''اچھا، ایسی کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''میں نیلم کے خلاف آج ہی ثبوت جمع کرنا شروع کر دوں گی اور آپ دیکھ لیجئے گا، ایک دن میں اسے فریدہ کے قتل کے جرم میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ضرور پہنچاؤں گی۔''

''آپ کا ذہن ابھی تک نیلم ہی میں اٹکا ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔

''ذہن نیلم اور دل سعید میں!'' بات کے اختتام پر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

میں خاموش رہا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا۔ وہ اس وقت انتہائی جذباتی ہو رہی تھی۔

وہ خود ہی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بیگ صاحب! میں عنقریب آپ کو ایک خوش خبری سنانے والی ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''آپ اسے ایک سرپرائز سمجھ لیں۔''

''کیسی خوش خبری فرحانہ صاحبہ؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ''اگر وقت سے پہلے بتا دیا تو پھر سرپرائز کیسا؟''

''وِش یو گڈ لک!'' میں نے خلوصِ دل سے اسے دعا دی۔

بظاہر یہ قصہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن لگ بھگ ایک سال بعد فرحانہ دوبارہ میرے پاس آئی۔ اس وقت سعید بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کے لبوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ تھی۔ میں نے انہیں بٹھایا اور حال احوال دریافت کیا۔

فرحانہ نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں نے آپ سے سرپرائز دینے کا وعدہ کیا تھا نا!'' پھر وہ سعید کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''ان سے ملیں، یہ اب آپ کے موکل نہیں بلکہ میرے شوہر ہیں۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''شوہر اور موکل میں کوئی خاص فرق نہیں

ہوتا۔'' پھر بے پناہ حیرت چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''بھئی آپ لوگوں نے کب شادی کر لی؟''

''ایک ہفتہ قبل۔'' سعید نے بتایا۔

''کمال ہے، مجھے جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا۔'' میں نے شکوہ کیا۔ ''میں تم لوگوں کی شادی رکوا تو نہ دیتا۔''

فرحانہ نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں سرپرائز کو متاثر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا، آپ ناراض ہوں گے تو میں معذرت کر لوں گی۔ آئی ایم ویری سوری!''

''ٹھیک ہے، آپ کی معذرت قبول ہو گئی۔'' میں نے کہا پھر سعید سے پوچھا۔ ''نیلم کا کیا بنا؟''

''میں نے اُسے طلاق دے دی تھی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نہیں چاہتا تھا، وہ جیل جاتے ہوئے میرا نام بھی اپنے ساتھ لے جائے۔''

''جیل؟'' میری آواز حیرت سے بھر گئی۔

فرحانہ نے بتایا۔ ''میں نے نیلم کے خلاف ایسے ٹھوس ثبوت حاصل کر لئے تھے کہ پولیس اور عدالت کو اس پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی!''

''اوہو!'' میں نے بے ساختہ سانس خارج کی۔ ''آپ اپنی دھن کی بہت پکی ہیں۔''

''کوئی ایسی ویسی!'' سعید نے گرہ لگائی۔ ''یہ اس کی دھن ہی ہے کہ آج ہم ایک ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ فرحانہ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔''

میں نے سعید سے یہ نہیں پوچھا، فرحانہ نے اس کی آنکھیں کھولنے کے لئے کون سا ہنر آزمایا ہے اور نہ ہی فرحانہ سے دریافت کیا کہ اس نے نیلم کے خلاف کیسے اور کون سے ٹھوس ثبوت حاصل کر لئے تھے۔ وہ کسی بھی مرحلے پر، کچھ بھی کر سکتی تھی۔

بعض چلمن نشین اسی طرح اوٹ میں رہ کر تیر چلاتے ہیں۔ انہیں یہ خدشہ ہوتا ہے، اگر انہوں نے سامنے آ کر شست باندھی تو نشانہ خطا ہو جائے گا۔ فرحانہ ماضی میں ایک ناکام تجربہ کر چکی تھی۔ اب اس کا اعادہ نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے انہیں خوشگوار مستقبل کے لئے نیک خواہشات سے نوازا اور رخصت کر دیا۔

✿✿✿

چھاچھ کا جلا

اصولی طور پر اس عمارت کا نام وکیل پلازا یا وکیل مینشن ہونا چاہئے کیونکہ اس کے بیشتر دفاتر پر وکیلوں کا قبضہ ہے۔ سٹی کورٹ نزدیک ہونے کی سہولت کے پیشِ نظر میں نے بھی اپنا دفتر اسی پانچ منزلہ عمارت میں بنا رکھا تھا۔ جو مصیبت زدہ شخص پہلی مرتبہ اس عمارت میں قدم رکھتا ہے اس کے لئے اپنے مطلوبہ وکیل تک پہنچنا خاصا مشکل ثابت ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ وکیلوں کی ایک بلند و بالا مارکیٹ میں آ گیا ہو! اس عمارت کا اندرونی نظارہ خاصا دلچسپ اور حیرت آفریں ہے۔

اسی بھیڑ بھاڑ اور افراط کا فائدہ اٹھا کر بعض موقع پرست وکیل ہاتھ دکھانے سے باز نہیں آتے۔ ان سے جب کسی وکیل کا پتا پوچھا جائے تو وہ پوچھنے والے کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس کا انٹرویو شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ آنے والے کے ان مسائل سے واقفیت حاصل کر لیں جن کے سبب وہ کسی وکیل سے ملنا چاہتا ہے۔ اس طریقہ کار پر عمل کر کے وہ بسا اوقات کلائنٹ گھیرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تاہم ایسے ہتھکنڈے وہی لوگ استعمال کرتے ہیں جن کے پاس موکلات کی کمی ہوتی ہے۔ کامیاب اور مصروف وکلا کو تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی۔

منیرہ بیگم نہایت ہی ثابت قدم اور مضبوط قوتِ ارادی کی مالک اور ایک ضعیف خاتون تھی۔ وہ کئی لوگوں سے پوچھنے کے بعد بالآخر مجھ تک پہنچ ہی گئی حالانکہ اسے ورغلانے کی بہت کوشش کی گئی۔ میری سیکرٹری نے جب مجھے بتایا کہ منیرہ بیگم انتظار گاہ میں موجود ہے تو میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

منیرہ بیگم ایک کمر خمیدہ اور پستہ قامت عورت تھی۔ ممکن ہے اس کا قد مناسب ہو اور کمر کے خم نے اس کی قامت کو گھٹا دیا ہو۔ اس کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہو گی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور ایک کرسی کی جانب اشارہ کر دیا۔

وہ ''اللہ تمہارا بھلا کرے وکیل بیٹا'' کہتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

چند سال قبل میں نے منیرہ کی کسی عزیزہ کا کیس لڑا تھا جس میں مجھے صد فیصد کامیابی ہوئی تھی چنانچہ جب منیرہ کو میری مدد کی ضرورت پیش آئی تو اس نے میری ہی طرف رخ کیا۔ میری سیکرٹری کو فون کر کے اس نے یہاں کا پتا سمجھ لیا تھا۔ میں منیرہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ کے بارے میں سیکرٹری نے مجھے مختصراً بتایا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آسکا، آپ کس سلسلے میں میری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہیں؟ ذرا تفصیل بتائیں تو آپ کی آمد کا مقصد واضح ہو!"

"وکیل صاحب! آپ نے مجھے پہچان تو لیا ہے نا؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ پھر اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دیتا وہ اپنی عزیزہ کے حوالے سے کچھ بتانے لگی۔

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "ٹھیک ہے، میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ میری یادداشت بہت قوی ہے۔ اب آپ اپنے مسئلے کو بیان کریں۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا اور پھر سوالیہ نظر سے اپنے سامنے بیٹھی منیرہ بیگم کو دیکھنے لگا۔

وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "میرے بیٹے کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔"

"کس جرم میں؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولی۔ "شاکر نے کوئی جرم نہیں کیا۔ پولیس نے کسی غلط فہمی کی بنا پر اسے گرفتار کرلیا ہے۔ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کے خون میں ہاتھ رنگ بیٹھے۔"

"تو گویا معاملہ قتل کا ہے!" میں نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"شاکر نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے وکیل صاحب!" وہ اپنے موقف کو دہراتے ہوئے بولی۔ "میرا بیٹا بے گناہ ہے۔ لگتا ہے کسی گہری سازش کے تحت اسے اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔"

قتل کے مقدمات میں عمومی طور پر ملزم کے لواحقین اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں ملزم بے گناہ اور معصوم ہوتا ہے لہٰذا وہ وکیل کی مدد سے اس کی باعزت رہائی کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسے شخص کی ماں موجود تھی، پولیس نے جسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔ میں اس بوڑھی عورت کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

میں نے منیرہ بیگم سے استفسار کیا۔ "پولیس نے آپ کے بیٹے شاکر کو کب گرفتار کیا ہے؟"

"کل چار بجے شام۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ!" میں نے رف پیڈ پر یہ معلومات درج کرتے ہوئے کہا۔ "گویا اس واقعے کو چھبیس ستائیس گھنٹے گزر گئے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ "کیا پولیس نے آج صبح شاکر کو عدالت میں پیش کیا تھا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔ "عدالت نے سات روز کا ریمانڈ دیا ہے۔ پولیس تفتیش کررہی ہے۔ ایک ہفتے کے بعد اسے دوبارہ عدالت میں پیش کیا جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "شاکر پر کس کے قتل کا الزام ہے؟"

"چمن شاہ!" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا یہ کسی شخص کا نام ہے؟"

"ہاں، چمن شاہ ایک عامل کامل اور تعویذ گنڈے کا ماہر تھا۔" اس نے بتایا۔ "اس کی نیم برہنہ لاش آستانے کے ایک کمرے میں پائی گئی ہے۔"

"آپ کے بیٹے کی چمن شاہ سے کیا دشمنی تھی؟"

"نہ دوستی اور نہ دشمنی۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "شاکر، چمن شاہ کے پاس ملازم تھا۔"

"چمن شاہ کا آستانہ کہاں واقع ہے جہاں سے اس کی نیم برہنہ لاش ملی ہے؟"

منیرہ بیگم نے جواب دیا۔ "چمن خاصا ماڈرن ماہرِ عملیات تھا۔ اس نے طارق روڈ جیسے بارونق اور مہنگے علاقے میں ایک فلیٹ کے اندر اپنا آستانہ کھول رکھا تھا جہاں وہ اپنے پاس آنے والوں سے لمبی رقمیں بٹورتا تھا۔ میں نے شاکر کو منع بھی کیا تھا، ایسے جعلی اور فراڈ پیر کے پاس ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اس نے میری بات نہیں مانی۔" ایک لمحے کو رک کر وہ بے بسی سے بولی۔ "وہ بے چارہ بھی کیا کرتا۔ کافی عرصے سے بے روزگار تھا۔ جو کام بھی ملا، کرنے کو تیار ہو گیا۔ آج کل بے روزگاری سب سے بڑا عذاب ہے وکیل صاحب!"

وہ ایک کھلی حقیقت بیان کررہی تھی۔ میں بھلا کیسے انکار کرتا۔ دور کوئی سا بھی ہو، بے کاری اور بے روزگاری کسی لعنت سے کم نہیں۔ اس کی اذیت کو وہی لوگ محسوس کرسکتے ہیں جو کبھی اس تجربے سے گزرے ہوں!

میں نے منیرہ بیگم سے پوچھا۔ "شاکر علی کے کام کی نوعیت کیا تھی؟"

"وہ چمن شاہ کے آستانے کے بارے میں اشتہار وغیرہ بانٹتا پھرتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "آستانے اور چمن شاہ کی مشہوری کے سلسلے میں جو کچھ کیا جاسکتا ہے، اس شعبے کو شاکر چلا رہا تھا۔" پھر وہ اپنے بیٹے کے کام کی تفصیلات بیان کرنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ نے بتایا ہے، کل شام چار بجے شاکر کو گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ گرفتاری کس جگہ عمل میں آئی؟"

"طارق روڈ والے اسی آستانے پر۔" اس نے جواب دیا۔

شاکر علی کے معاملے میں مجھے خاصی دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ میرے کریدنے پر منیرہ بیگم نے مزید چند باتیں بتائیں پھر اس کی معلومات اختتام پذیر ہوگئیں اور اس نے بے بسی سے کہا۔

"وکیل صاحب! آپ کو اور جو کچھ بھی پوچھنا ہے، شاکر سے پوچھ لیں۔ میں نے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی ہے۔ خدا کے لئے میرے بیٹے کو اس مصیبت سے نکال لیں۔"

"ٹھیک ہے، دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں تھانے جا کر شاکر سے مل لوں گا۔ آپ کل کسی وقت میرے دفتر آجائیں۔" تھوڑے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا۔ "ویسے بھی آپ کا

بیٹا اس وقت عدالتی ریمانڈ پر ہے۔ عدالتی کارروائی تو ایک ہفتے بعد ہی ہوگی۔"
اس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی تھانے جائے گی۔ میں نے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے انتظار گاہ میں بیٹھنے کو کہا۔ اس کی بات میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آئی۔ رات ساڑھے نو بجے وہ میری گاڑی میں بیٹھ کر متعلقہ تھانے کی جانب جا رہی تھی۔

✪✪✪

عدالتی ریمانڈ، پولیس کی تحویل میں آئے ہوئے کسی حوالاتی سے ملنا سہل نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ہماری برادری کو جو ہتھ کنڈے آزمانا پڑتے ہیں، اس کی تفصیل پہلے کئی مرتبہ بیان کی جا چکی ہے لہٰذا یہاں اس کا ذکر ضروری نہیں سمجھتا۔ تھانے پہنچنے کے پانچ منٹ بعد میں شاکر علی سے تنہائی میں گفتگو کر رہا تھا۔
شاکر علی ایک گورا چٹا اور دراز قامت نوجوان تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس رہی ہوگی لیکن اس کے چہرے کی معصومیت اسے تیرہ چودہ سے زیادہ کا نہیں بتاتی تھی۔ اس معصومیت میں بڑی نزاکت اور نسوانیت پائی جاتی تھی، خصوصاً اس کے ہاتھ اور چہرے کے نقش و نگار کسی دوشیزہ کے مانند نرم و ملائم اور خوب صورت تھے۔ وہ پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ اسے حوالات کے اندر کسمپرسی کی حالت میں بیٹھے دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔
میں نے لگ بھگ آدھا گھنٹہ شاکر علی سے گفتگو کی۔ میرے مختلف سوالات کے اس نے بھرپور جواب دیئے۔ نتیجے کے طور پر میں نے وکالت نامے پر اس کے دستخط لئے اور اسے تسلی دینے کے بعد تھانے سے باہر آ گیا۔ منیرہ بیگم کو میں نے یہ کیس لینے کی خوشخبری سنانے کے بعد ایک ٹیکسی میں بٹھایا اور خود اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔
شاکر علی سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں، میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ پر اس کیس کا پس منظر واضح ہو سکے۔ اس بیان میں چند ایسی باتیں بھی شامل ہیں جو بعد میں کسی دوسرے ذریعے سے پتا چلیں لیکن واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے میں نے انہیں بھی ساتھ ملا لیا ہے۔ اسی طرح بعض باتیں میں نے سردست آپ سے چھپا لی ہیں۔ ان کا ذکر بعد میں عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر آئے گا۔
شاکر علی اور اس کی بوڑھی والدہ منیرہ بیگم کی رہائش اختر کالونی میں تھی۔ چند سال پہلے منیرہ کا شوہر عبدالوہاب حادثاتی موت کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ وہ سائٹ ایریا میں واقع ایک بڑی مل میں کام کرتا تھا۔ اس مل کا مالک ایک ہمدرد دل رکھنے والا خدا ترس انسان تھا۔ عبدالوہاب کی موت اسی مل میں کام کرتے ہوئے واقع ہوئی تھی لہٰذا متوفی کی متاثرہ بیوہ منیرہ بیگم کی مدد کے خیال سے مل کے مالک نے کچھ رقم اسے دی۔ منیرہ نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لگ بھگ پچاس ہزار روپے کی وہ رقم بینک میں رکھوا دی جس پر اسے ماہانہ منافع ملتا تھا۔

اس موقع پر بہت سے لوگوں نے اسے کاروبار کرنے کا مشورہ بھی دیا جن میں اکثر لالچی اور فریبی تھے۔ منیرہ بیگم ان کی نیت بھانپ گئی۔ ایک دو سنجیدہ اور پُرخلوص مشیروں کی بات پر بھی اس نے توجہ نہ دی کیونکہ اسے کسی قسم کے کاروبار کا تجربہ نہ تھا۔ اگر وہ اس میدان میں قدم رکھتی تو لامحالہ اسے دوسروں کا سہارا لینا پڑتا جس سے ہر گام دھوکے کا امکان تھا۔ ایک ناتجربہ کار، بے اختیار بیوہ کے لئے بینک میں رقم رکھوا دینا ہی بہترین سرمایہ کاری تھی، سو منیرہ بیگم نے اسی پر عمل کیا۔
ماہانہ منافع تو گھر میں آ ہی رہا تھا، اس کے ساتھ ساتھ صاحب ثروت محلے دار بھی مختلف مواقع پر اس کی مدد کر دیتے۔ اس طرح ماں بیٹے کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ منیرہ بیگم کی ساری امیدوں کا مرکز شاکر علی تھا لیکن اس نے میٹرک کرنے کے بعد مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔ بیٹے کا یہ فیصلہ ماں کے لئے حیران کن اور صدمے کا باعث تھا۔
"شاکر! میں تمہیں پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی ہوں۔" منیرہ بیگم نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔ "تمہیں معلوم ہے، تم میرے خواب کو چکنا چور کر رہے ہو!"
وہ بیزاری سے بولا۔ "ماں! بڑا آدمی بننے کے لئے کسی بڑے اسکول یا کالج میں پڑھنا پڑتا ہے۔ میں تو ایسے کسی اسکول میں داخلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"
"یہ تمہاری سوچ کا فتور ہے۔" منیرہ بیگم نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "بڑا آدمی بننے کے لئے بلند عزائم اور کڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسکول کون سا ہے۔"
"بہت فرق پڑتا ہے ماں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں نے جس اسکول سے میٹرک کیا ہے وہاں اسٹوڈنٹ کی تعداد چھبیس اور اساتذہ چونتیس ہیں جن میں سے زیادہ سے زیادہ چار حاضر ہوتے ہیں۔ ایسے تعلیمی مرکز میں پڑھائی کیا ہوگی۔ بیشتر سرکاری سکولز کا یہی حال ہے، جن سکول میں اچھی تعلیم ملتی ہے، وہ بہت مہنگے ہیں۔ ہم وہاں کی فیسیں نہیں دے سکتے۔"
شاکر علی کے بیان میں اگرچہ جذباتیت شامل تھی لیکن وہ کسی قسم کے مبالغے سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ اسکولز آج سے بیس پچیس سال پہلے بھی بہت مہنگے تھے۔ محدود آمدنی والے لوگ آج کل تو ان اسکولز میں بچوں کو بھیجنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔
منیرہ بیگم نے اپنے بیٹے کی دل شکستہ باتیں سنیں تو تسلی آمیز لہجے میں بولی۔ "تم فکر نہ کرو میرے بچے! میں تمہیں کسی اچھے کالج میں بھیجوں گی۔"
"سب بے کار ہے۔" وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں میٹرک میں اتنے شرمناک نمبرز لایا ہوں کہ اچھے تو کیا، کسی گئے گزرے کالج میں بھی مجھے مشکل ہی سے داخلہ مل سکے گا اور......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر کہنے لگا۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آگے بالکل نہیں پڑھوں گا۔"

"پھر تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"میں کام کروں گا۔" وہ قطعیت سے بولا۔ "میں کل ہی سے ملازمت کی تلاش میں نکل جاؤں گا۔ ہماری گھریلو حالت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ میں کچھ کما کر گھر میں لاؤں۔ آگے وقت بڑا سخت ہے۔ ایسے گزارہ نہیں ہوگا۔"

شاکر علی جن حقائق کا اظہار کر رہا تھا، وہ منیرہ بیگم سے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ سخت محنت اور اولوالعزمی کی حامی تھی لیکن اس کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بیٹے کو اپنے خیالات میں ڈھال سکے۔ اگر شاکر کا باپ زندہ ہوتا تو شاید صورت حالات مختلف ہوتی۔

الغرض دوسرے روز سے شاکر نوکری کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مختلف نوعیت کے کام کئے اور چھوڑ دیئے۔ اس کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا اور تعلیم اتنی کم تھی کہ وہ کسی جگہ ٹک نہ سکا۔ کہیں کام اسے پسند نہیں آیا اور کہیں وہ مالکان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ بالآخر گردشِ حالات اسے چمن شاہ ماہرِ عملیات وتعویذات کے پاس لے آئی۔

چمن شاہ جیسے عاملین وکاملین اپنے دھندے کی پبلسٹی کے لئے دوسرے اور تیسرے درجے کے اخبارات میں متواتر اشتہارات دیتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی تشہیر کے لئے ہینڈ بلز اور کارڈز وغیرہ کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ شاکر علی اسی کام پر مامور تھا۔ وہ صبح اپنے گھر سے نکلتا اور مختلف علاقوں میں ہینڈ بلز بانٹتا پھرتا۔ علاوہ ازیں وہ بسوں کے اندر چمن شاہ کے پبلسٹی کارڈز بھی تقسیم کرتا۔ ان بلز اور کارڈز پر بڑے دلچسپ اور توجہ مبذول کرنے والے بلند و بانگ دعوے درج ہوتے تھے مثلاً سنگ دل محبوب آپ کے قدموں میں، ہر مقصد میں کامیابی، روٹھے ہوئے مان جائیں، بچھڑے ہوئے مل جائیں، ستاروں کی گردش کو پلٹنے کے ماہر، لوٹ پلٹ اور سفلی کاٹ کرنے والے ماہر عملیات چمن شاہ سے آج ہی ملیں۔ ہر کام کلام پاک کی مدد سے کیا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

منیرہ بیگم نے اس نوکری کا سنتے ہی شاکر کو سختی سے منع کر دیا لیکن اس نے یہ کہہ کر ماں کو تسلی دے دی کہ جب تک کوئی اچھی اور مناسب ملازمت نہیں ملتی، وہ چمن شاہ کی پبلسٹی کا کام کرے گا۔ چمن شاہ نے اسے پانچ سو روپے تنخواہ پر رکھا تھا۔ آج سے لگ بھگ پچیس سال پہلے پانچ سو روپے کو خاصی معقول تنخواہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ آج کل کے آٹھ ہزار روپے ہوں گے۔

شاکر علی کو چمن شاہ کے پاس کام کرتے ہوئے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ اسے چمن شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ شاکر کی زبانی مجھے چمن شاہ کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوئیں جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ شاکر نے مختصر سے عرصے میں بہت کچھ معلوم کرلیا تھا۔ میں یہاں جو کچھ بیان کر رہا ہوں اس میں چند ایسی باتیں بھی ہیں جو بعد میں مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوئیں۔

چمن شاہ کا آستانہ کسی زمانے میں ریلوے کالونی میں ہوا کرتا تھا۔ وہ کبیر شاہ نامی شخص کے ساتھ مل کر وہ آستانہ چلاتا تھا۔ آستانے کا نام "عاستانہ عالیہ فیضیہ" ہوا کرتا تھا۔ پھر ان دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ پھوٹ کے بارے میں متضاد اور مختلف آرا پائی جاتی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا، ان کے بیچ مال کی تقسیم پر جھگڑا ہوا تھا۔ کچھ کا کہنا تھا، وہ دونوں اپنے علم وعمل کی بلندی اور پستی پر الجھ بیٹھے تھے۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ان دونوں کے درمیان وجہ تنازع ایک خوب صورت نوجوان لڑکے کو قرار دے رہا تھا۔

چند روز بعد کبیر شاہ نے پی آئی بی کالونی میں "آستانہ کبیریہ" کے نام سے دھندا شروع کر دیا۔ البتہ چمن شاہ پورے چھ ماہ تک منظر سے غائب رہا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا، وہ کراچی کو خیرباد کہہ کر کسی دوسرے شہر نکل گیا ہے۔ ریلوے کالونی والے آستانے پر ہی چمن شاہ نے نادر نامی ایک حسین اور طرح دار لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ کبیر شاہ غیر سرکاری طور پر ابھی تک کنوارا تھا۔ جب تک وہ چمن شاہ کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا، اس کی رہائش بھی چمن شاہ کے گھر میں ہی تھی لیکن پی آئی بی والا آستانہ کھولنے کے بعد اس نے ناظم آباد میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس کا خیال تھا، کاروبار اور رہائش دو مختلف جگہوں پر ہونا چاہئے۔

چمن شاہ بڑے طمطراق کے ساتھ دوبارہ منظر میں نمودار ہوا۔ اب اس کا انداز اور طور طریقے بدلے ہوئے تھے۔ وہ کام تو وہی کر رہا تھا لیکن ذرا ماڈرن اور جدید اسٹائل سے۔ اس نے طارق روڈ کی ایک کمرشل بلڈنگ میں پورا فلیٹ حاصل کر کے اس میں اپنا جدید آستانہ کھول لیا تھا۔ اس آستانے میں باقاعدہ ویٹنگ روم اور ریسپشن موجود تھا۔ ریسپشن تھا تو ظاہر ہے ریسپشنسٹ بھی تھی۔ ایک کمرا چمن شاہ کے اسسٹنٹ کے لئے تھا۔ ویٹنگ روم میں طویل انتظار کے بعد سائل چمن شاہ کے نائب کے پاس پہنچتا تو وہ سرگوشیانہ انداز میں اس کا طویل انٹرویو کرتا۔ سائل ریسپشنسٹ کو پہلے ہی فیس ادا کر چکا ہوتا لہٰذا ان صبر آزما مراحل سے گزرنا اس کی مجبوری تھی۔ انٹرویو مکمل ہونے کے بعد اسسٹنٹ چمن شاہ کے کمرے (حجرۂ خاص) میں پہنچتا، اسے سائل کے مسائل کے بارے میں تفصیلاً بتاتا۔ کچھ ہی دیر بعد مصیبت زدہ شخص کو چمن شاہ کے پاس اندر بھیج دیا جاتا۔

چمن شاہ کا "حجرۂ خاص" دو حصوں پر مشتمل تھا۔ فرشی نشست کو وہ ریلوے کالونی والے آستانے پر ہی چھوڑ آیا تھا۔ طارق روڈ والے آستانے کو اس نے جدید خطوط پر استوار کیا اس کے باوجود بھی وہ اسے آستانہ کہلوانے پر زور دیتا۔ یہ اس کا ایک کاروباری نکتہ تھا۔ موجودہ آستانہ کسی نیشنل کمپنی کے ویل ڈیکوریٹیڈ آفس کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ چمن شاہ کے "حجرے" کا ایک حصہ اس کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا جب کہ دوسرا پورشن اس کا ریسٹ روم تھا۔ چمن شاہ قیلولے کا عادی

تھا۔ لنچ کے بعد وہ ایک گھنٹے کے لئے ریسٹ روم میں بند ہو جاتا۔

اس جدید آستانے کے اخراجات پورے کرنے کے لئے چمن شاہ نے تگڑی فیس رکھی تھی۔ صرف اس سے ملاقات کے لئے سائل کو دو سو روپے ادا کرنا پڑتے جو وہ آستانے میں داخل ہوتے ہی استقبالیہ لڑکی کے پاس جمع کرواتا، پھر انتظار گاہ میں بیٹھ کر اپنی باری شمار کرنے لگتا۔ اس زمانے میں دو سو روپے خاصی بھاری فیس تھی۔ ملاقات کے بعد چمن شاہ سائل کے لئے جو تجویز کرتا وہ اس فیس کے علاوہ ہوتا۔ وہ ایک فراڈ کے کام میں لوگوں کو اونچے پیمانے پر کاٹ رہا تھا۔ اس کے پاس آنے والوں میں زیادہ تعداد صاحب ثروت افراد کی تھی۔ یہ اسی آستانے کی "مہربانی" تھی کہ چمن شاہ نے گلشن اقبال میں ایک چھ سو گز پر بنا ہوا دو منزلہ بنگلہ بھی حاصل کر لیا تھا۔

شاکر علی بڑی تن دہی سے کام کر رہا تھا۔ اس دوران میں اس پر بہت سی باتیں منکشف ہوئیں۔ چمن شاہ کا دھندا تو رہا ایک طرف، خود اس کی ذات کے حوالے سے شاکر کے کان میں جو بات پڑی وہ اس کے لئے ناقابل یقین اور عجیب تھی۔ پھر ایک روز اس کے سامنے سب کچھ عیاں ہو گیا۔ چمن شاہ نے تنہائی کے وقت اسے اپنے حجرے میں طلب کیا۔ وہ لنچ سے فارغ ہو چکا تھا اور اس وقت قیلولے کے لئے ریسٹ روم میں لیٹا ہوا تھا۔ شاکر علی اس کے پاس پہنچا تو چمن شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر اسے بھی اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔

شاکر علی تھوڑے سے تامل کے بعد اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن ہزار ہا اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے چمن شاہ کی جس عادتِ بد کی بھنک ملی تھی وہ معاشرے کی نظر میں ناپسندیدہ اور قابل مذمت تھی۔

شاکر علی خدشات کے بھنور میں چکرا رہا تھا کہ چمن شاہ کی بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "کیا تمہیں میرے پاس بیٹھ کر کسی قسم کا ڈر محسوس ہو رہا ہے؟"

"نن...... نہیں۔" شاکر علی گڑبڑا گیا۔

چمن شاہ نے پوچھا۔ "پھر اتنی دور کیوں بیٹھے ہو؟"

"آپ نے شاید کسی ضروری کام سے مجھے یہاں بلایا تھا!"

"ٹھیک کہتے ہو۔" وہ معنی خیز انداز میں شاکر کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ "مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے لیکن تم اس قدر سہمے ہوئے ہو کہ بتانا فضول ہے۔ ذرا ایزی ہو کر بیٹھو تو بات کرتے ہیں۔"

"میں بالکل ٹھیک بیٹھا ہوں۔" شاکر اس کے مقاصد کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔ "آپ کو جو کہنا ہے کہہ ڈالیں۔"

چمن شاہ چند لمحے کھوجتی ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ اس مرتبہ اس کا انداز خاصا بدلا ہوا تھا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں اڑنے والی ہوس کی چنگاریاں شاکر کی

نگاہ سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ چہرہ کسی بھی انسان کی سوچ کا آئینہ ہوتا ہے...... اور چمن شاہ کے چہرے پر موجود تاثرات شاکر کو کسی اور ہی دنیا کی کراہت بھری کہانیاں سنا رہے تھے۔

"میں نے تمہیں اس وقت اپنے پاس اس لئے بلایا ہے کہ تمہاری محنت کا اعتراف کر سکوں۔" چمن شاہ نے منافقت بھرے انداز میں کہا۔ "تمہاری خدمات کے نتیجے میں میرا دھندا خوب چمک رہا ہے۔ حالانکہ تمہیں میرے پاس کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن اس ڈیڑھ پونے دو ماہ میں تم نے ایسی جان توڑ محنت کی ہے کہ آستانے کی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔"

چمن شاہ کے آخری الفاظ نے شاکر کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے سوالیہ نظر سے چمن شاہ کو دیکھا۔ "خوشی اور افسوس ایک ساتھ کیوں؟"

چمن شاہ تھوڑی دیر تک اثبات میں گردن جھٹکتا رہا پھر خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ "مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تم پوری دیانت داری سے میرے کاروبار کو پھیلانے میں مدد دے رہے ہو۔ میں تمہارے کام سے مطمئن ہوں۔ آج کل اتنے محنتی اور ایماندار ورکرز ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ تم سے پہلے میرے پاس جولڑ کا کام کر رہا تھا، وہ بہت بے ایمان اور بدمعاش تھا۔ وہ آستانے سے بیگ بھر کر پمفلٹ، ہینڈ بلز اور پبلسٹی کارڈز لے جاتا، پھر انہیں کسی کچرا کنڈی میں پھینک کر واپس آ جاتا۔ مجھے جب اس کی کارکردگی پر شک ہوا تو میں نے اس کی نگرانی کا بندوبست کیا پھر وہ جلد ہی رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ میں نے سانس روک کر اسے سات جوتے مارے اور نوکری سے نکال دیا۔"

چمن شاہ مسلسل خلا میں تک رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی نادیدہ مخلوق سے ہم کلام ہو۔ شاکر جانتا تھا، وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ شاکر پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا۔

"میں نے شروع میں چند روز تمہاری بھی نگرانی کروائی تھی کیوں کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ لیکن میں جلد ہی تمہاری طرف سے مطمئن ہو گیا۔ تمہاری جان توڑ محنت نے مجھے بے حد متاثر کیا...... اور افسوس بھی مجھے اس بات کا ہے!" وہ اچانک خاموش ہو کر شاکر کو دیکھنے لگا۔

شاکر اس وقت خود کو بہت اُلجھی ہوئی صورتِ حالات میں پا رہا تھا۔ چمن شاہ اس کی محنت کو ایک طرف اگر سراہ رہا تھا تو دوسری جانب وہ اس پر افسوس کا اظہار بھی کر رہا تھا۔

چمن شاہ کی ہمدردانہ باتیں شاکر کو حیران کر رہی تھیں۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے کہہ دیا۔ "اگر آپ کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں آپ کے آستانے کے لئے پانچ سو روپے سے زیادہ محنت کر رہا ہوں تو اس پر افسوس کرنے کے بجائے آپ میری تنخواہ بڑھا دیں۔"

شاکر نے ایک معقول اور حسب حال تجویز پیش کی تھی۔ لیکن چمن شاہ کا شیطانی دماغ کسی اور ہی جال کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ وہ شاکر علی کو گہری نظر سے گھورتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری تنخواہ میں دو سو روپے کا اضافہ کرسکتا ہوں لیکن اس اضافے کے لئے تمہیں کچھ اضافی کام کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد چمن شاہ نے نہایت ہی پرکار الفاظ میں اپنے مکروعزائم شاکر علی پر کھول دیئے۔

اب چمن شاہ، شاکر علی پر پوری طرح عیاں ہو چکا تھا۔ اس نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں فوری طور پر آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتا، مجھے سوچنے کا موقع دیں۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دیتا ہوں۔" چمن شاہ یک دم بے حد سنجیدہ ہوگیا۔

شاکر علی، چمن شاہ کے حجرے سے باہر آگیا۔ وہ کسی بھی صورت چمن شاہ کی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے چمن شاہ کی پیش کش پر کسی شدید ردِعمل کا اظہار اس لئے نہیں کیا تھا کہ ابھی اس کے پاس ایک ہفتے کا وقت محفوظ تھا۔ اس دوران میں وہ کوئی دوسری ملازمت تلاش کر لیتا۔ یہ بات تو طے تھی کہ اب اسے چمن شاہ کے پاس ملازمت کو جاری نہیں رکھنا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد اگر وہ اس کے حسب منشا جواب نہ دیتا تو پھر اس نوکری کی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔ چمن شاہ یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کا ایک معمولی سا ملازم اس کی کسی خواہش سے انکار کردے۔

وہ چمن شاہ کے حجرے سے باہر آیا تو چمن شاہ کا اسسٹنٹ انیق بڑی معنی خیز نظر سے اسے تکنے لگا۔ شاکر کے دماغ میں چور تھا اس لئے وہ یہی سمجھا کہ انیق اس پر شک کر رہا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ چمن شاہ کے حجرے میں بلکہ ریسٹ روم میں تنہائی میں وقت گزار کر آیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ جب بھی چمن شاہ سے ملا، لوگوں کی موجودگی میں ملا تھا۔

دوسرے روز بھی انیق اُسے ایسی نظر سے دیکھتا رہا جیسے شاکر کوئی مجرم ہو۔ شاکر اس کو نظر انداز کرتا رہا۔ وہ خواہ مخواہ اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا، چمن شاہ کی طرح انیق بھی کم خطرناک نہیں۔

تیسرے روز موقع پا کر انیق نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ "کیا بات ہے شہزادے!" وہ بڑے خوش گوار انداز میں بولا۔ اس وقت اتفاق سے آستانے پر ان دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

"تم بڑے اُکھڑے اُکھڑے دکھائی دے رہے ہو۔ مجھ سے ایسی کیا خفگی ہے پیارے؟"

شاکر کو اس کے انداز پر بڑی حیرت ہوئی۔ انیق ایک سخت مزاج اور رعب داب والا شخص تھا لیکن اس وقت وہ بڑے دوستانہ اور بے تکلفی کے انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کا یہ رویہ بے معنی نہیں ہوسکتا تھا۔ ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔

"میری آپ سے کیا ناراضگی ہوسکتی ہے جناب!" شاکر نے معتدل لہجے میں کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں، چند روز سے تم بہت اونچی ہوا میں اُڑ رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" شاکر نے کہا۔

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "بیٹا! چار دن کی چاندنی، پھر اندھیری رات ہے۔ میں نے ایسے بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔"

"پتا نہیں، آپ کس قسم کی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔"

"جو باتیں ابھی تمہیں الٹی نظر آرہی ہیں، بعد میں سیدھی ہو جائیں گی۔"

شاکر نے بیزاری سے اسے دیکھا۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، آپ کیا کہہ رہے ہیں!"

"اب تم اتنے بچے بھی نہیں ہو۔" انیق نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

شاکر نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور لنچ کا بہانہ کر کے آستانے سے نکل گیا۔ وہ دوپہر کا کھانا باہر کھاتا تھا۔ اس کی شروع ہی سے یہ عادت تھی۔ حالانکہ انیق اور استقبالیہ لڑکی نازیہ آستانے پر کھانا کھاتے تھے۔ آفس بوائے جمشید چمن شاہ اور ان دونوں کے لئے الگ الگ کھانے لے کر آتا تھا کیوں کہ ان لوگوں کے کھانے کے اوقات میں اچھا خاصا فرق تھا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد چمن شاہ نے دوبارہ تنہائی میں شاکر سے بات کی اور جواب میں شاکر نے اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ چمن شاہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ اپنا کام کرو۔"

شاکر نے چمن شاہ کے الفاظ میں پوشیدہ دھمکی کو واضح طور پر محسوس کرلیا۔ اسے کسی بات کا ڈر خوف نہیں تھا۔ اگرچہ وہ ابھی تک متبادل نوکری تلاش نہیں کرسکا تھا لیکن چند روزہ بے روزگاری اس کے لئے اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ بارہا اس تلخ تجربے سے گزر چکا تھا۔ اگر چمن شاہ اسے کھڑے کھڑے بھی ملازمت سے نکال دیتا تو زیادہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی ذہنی اُلجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔

"شاہ جی! میں کوئی دوسری ملازمت دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ مہینہ پورا کر لینے دیں۔"

"تم خواہ مخواہ فکرمند ہو رہے ہو۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ "تمہیں نوکری سے کون نکال رہا ہے۔ تم جب تک چاہو، میرے آستانے پر کام کر سکتے ہو۔ میں تمہاری خدمات سے مطمئن اور خوش ہوں۔"

اگرچہ چمن شاہ اس وقت بڑے میٹھے انداز میں بات کر رہا تھا لیکن شاکر جانتا تھا، وہ دل میں کس طرح پھنکار رہا ہوگا۔ وہ کسی بحث ومباحثے میں الجھے بغیر اس کے کمرے سے نکل آیا۔

جب انسان کا دل ایک مرتبہ کسی جگہ سے اُکھڑ جائے تو پھر وہ وہاں سے دور ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ شاکر بھی اب اس آستانے پر کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس مہینے کے باقی ماندہ دن پورے کر رہا تھا کہ وہ واقعہ پیش آگیا جس کے طفیل آج وہ پولیس کی تحویل میں تھا۔

میں نے شاکر علی سے وقوعہ کے روز پیش آنے والے حالات کے بارے میں بھی مختلف سوال کیے۔ اس نے بتایا کہ وہ اس روز حسب معمول آستانے پر پہنچا پھر اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ وہ دوپہر تک چمن شاہ کی اشتہاری مہم میں مصروف رہا پھر واپس آستانے پر آ گیا۔ انیق نے اس سے کہا کہ چمن شاہ اسے یاد کر رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا، آج اس کی چھٹی ہونے والی ہے۔ وہ بے خوف و خطر چمن شاہ کے حجرے میں پہنچ گیا لیکن چمن شاہ وہاں موجود نہیں تھا۔ شاکر یہی سمجھا کہ وہ ریسٹ روم میں آرام کر رہا ہوگا۔ ویسے بھی وہ چمن شاہ کے قیلولے کا وقت تھا۔ ریسٹ روم کا دروازہ بھی بھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ چند لمحے دفتری حصے میں بیٹھ کر چمن شاہ کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ ریسٹ روم سے باہر نہ نکلا۔ مزید کچھ انتظار کے بعد وہ چمن شاہ کے کمرے سے نکل کر انیق کے پاس آ گیا اور اس سے کہا۔ ”شاہ جی تو اپنے کمرے میں موجود نہیں ہیں۔“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ وہیں تھے۔“ انیق نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ تمہارے آنے سے ایک منٹ قبل ہی تو انہوں نے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ دوسرے حصے میں جا کر لیٹ گئے ہوں۔ کیا تم نے ریسٹ روم میں جھانک کر دیکھا ہے؟“

شاکر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”ریسٹ روم کا دروازہ بند ہے اور...... میں نے اس طرف جانے کی کوشش کی اور نہ ہی ضرورت محسوس کی ہے۔“

”تب پھر چمن شاہ یقیناً ریسٹ روم میں سو رہے ہوں گے۔“ انیق نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ ”تم بعد میں ان سے مل ضرور لینا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔“ شاکر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں لنچ کے لئے باہر جاؤں گا۔“

پھر شاکر علی اپنا بیگ ریسپشنسٹ نازیہ کے پاس رکھوا کر آستانے سے باہر نکل گیا۔ اس بیگ میں پبلسٹی کے ہینڈ بلز، پمفلٹ اور کارڈ وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ شاکر عموماً وہ بیگ نازیہ کے پاس رکھوا دیا کرتا تھا۔ نازیہ سے اس کی اچھی بنتی تھی۔ نازیہ پچیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کو آستانے پر کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

اس روز شاکر کو لنچ پر اچھی خاصی تاخیر ہو گئی۔ جب لگ بھگ چار بجے وہ واپس آستانے پر آیا تو وہاں کا نقشہ ہی الٹا ہو چکا تھا۔ وہاں چمن شاہ کی بیگم کے علاوہ چند پولیس والے بھی موجود تھے۔ شاکر نے جیسے ہی آستانے میں قدم رکھا، چمن شاہ کے اسسٹنٹ انیق نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

”یہی ہے قاتل، اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔“

اس کے الفاظ ختم ہوئے ہی تھے کہ پولیس نے آگے بڑھ کر شاکر کو حراست میں لے لیا۔

✿✿✿

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق ماہر عملیات چمن شاہ کی موت دوپہر ایک اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے حجرے کے دوسرے حصے یعنی ریسٹ روم میں مُردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ اس کی موت کا سبب ریوالور کی دو گولیاں تھیں جو اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست پائی گئیں۔ یہ دونوں فائر سائلنسر لگے ریوالور سے کیے گئے تھے۔

پولیس رپورٹ کے مطابق آلۂ قتل موقع واردات سے برآمد کر لیا گیا تھا۔ پولیس نے جب آستانے کی مکمل تلاشی لی تو شاکر کے بیگ میں سے وہ ریوالور مل گیا جس کی مدد سے چمن شاہ کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ وہی بیگ تھا جو لنچ پر جانے سے پہلے شاکر نے نازیہ نامی استقبالیہ لڑکی کے پاس رکھوایا تھا۔ موقع کے گواہوں کے مطابق شاکر کے بعد چمن شاہ کے کمرے میں اس کی بیوی نادرہ گئی تھی اور اسی نے باہر آ کر یہ انکشاف کیا کہ چمن شاہ نیم برہنہ حالت میں ریسٹ روم کے اندر مُردہ پڑا ہے۔

نادرہ ہی کی کوششوں کے نتیجے میں پولیس وہاں پہنچی اور شاکر کی واپسی پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ شاکر آلۂ قتل کی اپنے بیگ میں موجودگی پر حیرت زدہ تھا۔ اس نے وہ ریوالور اپنے بیگ میں رکھا تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جانتا تھا لیکن پولیس نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ پولیس کے چالان اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کے علاوہ چند ٹیکنیکل باتیں موجود تھیں جن کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔

پولیس نے اپنی رپورٹ اور تفتیش کے نتیجے میں شاکر علی کو چمن شاہ کا قاتل نامزد کر دیا تھا۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ شاکر اس قتل سے انکاری تھا۔ اسے بے گناہ ثابت کرنا میرا کام تھا۔ میں نے شاکر سے اس دوست کے بارے میں تفصیلاً معلومات حاصل کر لیں جس کی وجہ سے اس روز اسے لنچ پر تاخیر ہو گئی تھی۔ اس دوست کا نام قیصر تھا اور وہ لسبیلہ کے علاقے میں رہتا تھا۔

میں نے قیصر کو اپنے دفتر میں بلا کر اس سے ضروری ملاقات کی۔ میں نے مختصر گفتگو کے دوران میں اسے شاکر کا سچا دوست پایا لہٰذا میں نے اس کے ذمے چند اہم کام لگا دیئے۔ اس نے تہ دل سے اپنے دوست کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔ ازاں بعد اس نے میری ہدایت کے مطابق اپنا وعدہ پورا بھی کر دکھایا۔

پولیس نے جب مقدمے کا چالان پیش کر دیا تو عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے موکل نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ استغاثہ کی جانب سے کل آٹھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی لیکن میں یہاں پر اہم گواہوں کا احوال ہی بیان کروں گا۔

ابتدائی چند پیشیوں پر کوئی قابل ذکر عدالتی کارروائی نہ ہو سکی۔ پھر باقاعدہ سماعت کا آغاز

ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے سب سے پہلے تفتیشی افسر نے چند واقعاتی شواہد پیش کئے اور ایک چھوٹی سی تقریر بھی کر ڈالی جس کا لب لباب یہ تھا کہ میرے موکل شاکر علی نے چمن شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد انکوائری آفیسر کی جانب بڑھا۔ وہ رینک کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔

"آئی او صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو کب اور کس نے یہ اطلاع دی کہ طارق روڈ والے آستانے پر چمن شاہ کو قتل کر دیا گیا ہے؟"

جواب دینے سے پہلے اس نے خاصی ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "پولیس اسٹیشن فون کرنے والی مقتول کی وائف نادرہ تھیں اور ہمارے روزنامچے کے مطابق اس قتل کی اطلاع وقوعہ کے روز لگ بھگ تین بجے دی گئی تھی۔"

"لگ بھگ کیوں؟" میں نے تیز نظر سے گھورا۔ "آپ لوگ تو باقاعدہ وقت نوٹ کرتے ہیں اور بعض مستعد اور فرض شناس پولیس والے تو اس وقت کو گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ میں درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "میں نے لگ بھگ کے الفاظ محض آسانی کی خاطر استعمال کئے ہیں ورنہ چمن شاہ کے قتل کی اطلاع ہمیں دو بج کر انسٹھ منٹ اور چند سیکنڈ پر ملی تھی۔"

"آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"تین بج کر اکتیس منٹ پر۔" اس نے ترش لہجے میں جواب دیا اور پوچھا۔ "اگر ضرورت ہو تو سیکنڈ بھی بتا دوں؟"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں، شکریہ۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "پولیس رپورٹ کے مطابق میرے موکل اور اس مقدمے کے ملزم شاکر علی کو چار بجے گرفتار کیا گیا تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ ساڑھے تین سے چار بجے تک آپ مقتول کے آستانے میں کیا کرتے رہے تھے؟"

میں نے یہ سوال اسے کنفیوژ کرنے کے لئے کیا تھا۔ میرے استفسار پر وکیل استغاثہ نے بھی تیکھی نظر سے مجھے دیکھا۔ انکوائری آفیسر نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب! نہ تو یہ آپ کا پہلا مقدمہ ہے اور نہ ہی میں نے پہلے کیس کی تفتیش کی ہے۔ جائے واردات پر پہنچنے کے بعد پولیس جو کارروائی کرتی ہے وہ میرے اور آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔"

وہ ایک لمحے کو رکا پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے، میں موقع کی کارروائی میں مصروف ہو گیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "میری اطلاعات اور معلومات کے مطابق آپ کا تھانہ جائے واردات سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ آپ چند منٹ میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ پھر آپ کو اس کام کے لئے آدھا گھنٹہ کیوں لگا؟ اور وہ بھی قتل کے واقعے کے سلسلے میں؟"

"پولیس کے پاس کوئی چراغی جن نہیں ہوتا کہ پلک جھپکتے میں کام ہو جائے۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "ہمارے کام کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ ہمیں تھانے سے نکلنے کے لئے کچھ ابتدائی تیاری کرنا ہوتی ہے۔ بہرحال، میرا خیال ہے ہم بروقت جائے وقوعہ پر پہنچ گئے تھے۔"

"آپ کے ساتھ اور کون تھا یا تھے؟"

"میرے علاوہ دو کانسٹیبلز تھے۔"

"آپ لوگوں نے جائے وقوعہ پر کیا دیکھا؟"

"جب ہم چمن شاہ کے آستانے پر پہنچے تو وہاں مقتول کی بیوی میڈم نادرہ، انیق، نازیہ اور جمشید موجود تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ مقتول کی لاش ریسٹ روم میں پڑی ہے۔ میں مذکورہ ریسٹ روم میں پہنچا تو مقتول کو نیم برہنہ حالت میں مُردہ پایا۔ اس کے سینے پر دو سوراخ کی موجودگی اس کے قتل کی کہانی سنا رہی تھی۔"

"کیا آپ نے مقتول کی لاش دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس دنیا میں باقی نہیں رہا یا اس تصدیق کے سلسلے میں آپ نے کوئی جدوجہد بھی کی؟" میں نے استفسار کیا۔

اس نے بیزاری سے مجھے دیکھا اور جواب دیا۔ "ویسے تو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں لیکن اس کے باوجود بھی میں نے تصدیق کی خاطر مقتول کی لاش کو ہلا جلا کر اس کا ضروری معائنہ کیا تھا۔ مجھے ایک بھی وائٹل سائن نہیں مل سکا۔"

"اس معائنے کے بعد آپ کو یقین ہو گیا کہ مقتول کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا ہے!"

"جی ہاں، اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔"

میں نے کہا۔ "اس یقین کے ساتھ ہی آپ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ مقتول چمن شاہ کی موت کا ذمہ دار میرا موکل شاکر علی ہے!" میرے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

وہ ایک نظر وکیل استغاثہ کو دیکھنے کے بعد بولا۔ "نہیں جناب! میں نے قاتل تک پہنچنے یعنی اسے نامزد کرنے کے لئے تفتیش کی ہے۔ اس کے بعد ہی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"کیا آپ نے جائے وقوعہ پر انگلیوں کے نشانات اٹھانے کا بندوبست کیا تھا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"پھر اس کارروائی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟"

"مقتول کے کمرے میں مختلف جگہوں پر ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے۔"

"کیا صرف میرے موکل کے فنگر پرنٹس؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"نن......نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔ "وہاں کچھ اور لوگوں کی انگلیوں کے نشانات کا سراغ بھی ملا تھا جن میں مقتول کا نائب انیق، آفس بوائے جمشید اور ریسپشنسٹ نازیہ شامل ہیں حتیٰ کہ میڈم نادرہ کے فنگر پرنٹس بھی ایک دو جگہوں سے حاصل ہوئے ہیں۔"

میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ محض فنگر پرنٹس کی بنا پر میرے موکل کو قاتل نہیں گردانا جاسکتا۔ اگر قاتل کا یہی فارمولا ہے تو پھر اس ذیل میں دیگر مذکورہ افراد کا نام بھی آسکتا ہے۔"

انکوائری آفیسر جلدی سے بولا۔ "ملزم کے قاتل ہونے میں اس لئے کوئی شبہ نہیں کہ آلہ قتل اس کے بیگ سے برآمد ہوا ہے۔ لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ نے تصدیق کی ہے کہ اسی ریوالور کی مدد سے مقتول کے سینے میں دو گولیاں اتاری گئی تھیں۔"

"اور اگر مذکورہ ریوالور آپ کے لباس یا بیگ سے برآمد ہوتا تو آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق یہ قتل آپ نے کیا ہوتا!" میں نے خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔

وہ گڑبڑا گیا۔ "یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں وکیل صاحب! میں بھلا چمن شاہ کو کیوں قتل کروں گا؟"

"میں نے کوئی فتویٰ جاری کیا ہے اور نہ ہی کوئی فیصلہ صادر کررہا ہوں۔" میں نے وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو یکے بعد دیگرے دیکھنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تو آپ کے بیان کردہ اصول کی ہمہ گیری عرض کررہا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہے، آلہ قتل چوں کہ میرے موکل کے بیگ سے برآمد ہوا ہے اس لئے وہی قاتل ہوسکتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بغلیں جھانکنے لگا۔

میں نے میز پر رکھا سیلوفین بیگ اٹھالیا۔ آلہ قتل مع سائلنسر اس بیگ میں موجود تھا۔ میں نے وہ بیگ تفتیشی آفیسر کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"کیا اس ریوالور پر بھی ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا پھر ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس چالاک شخص نے ریوالور بیگ میں رکھنے سے پہلے اسے اچھی طرح صاف کردیا تھا۔"

"کیا آپ نے میرے موکل کو آلہ قتل کی صفائی کرتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"نن......نہیں۔" وہ ہکلایا۔

"پھر آپ کس بنیاد پر "صاف کردیا تھا" کے الفاظ استعمال کررہے ہیں؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی بات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو یہ کام کرتے دیکھا تھا۔"

وہ چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی بات میں تھوڑی تبدیلی کرتا ہوں۔" پھر اس نے ایک نظر جج کو دیکھا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ملزم نے واردات کے بعد آلہ قتل پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات کو صاف کردیا ہوگا۔ اسی لئے فنگر پرنٹس اٹھاتے وقت ہمیں ریوالور پر اس کی انگلیوں کے نشانات کا سراغ نہیں مل سکا۔"

انکوائری آفیسر نے بڑی خوبصورتی سے بات نبھا دی تو میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"گرفتاری کے بعد آپ نے ملزم کے ہاتھوں کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا تھا؟" ایک لمحے کا توقف دینے کے بعد میں نے اضافہ کیا۔ "اس سلسلے میں ایک مخصوص قسم کا کیمیکل ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔ اس ٹیسٹ کو پیرافن ٹیسٹ کہا جاتا ہے۔ ہم نے اس ٹیسٹ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"کیوں ضرورت محسوس نہیں کی گئی؟" میں نے تیز آواز میں دریافت کیا۔

وہ بولا۔ "شواہد کے مطابق ملزم سوا دو بجے لنچ کے لئے آستانے سے نکل گیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے لگ بھگ پندرہ منٹ مقتول کے کمرے میں گزارے تھے۔ پھر جب وہ لنچ سے واپس آیا تو شام کے چار بج رہے تھے۔ سوا دو بجے سے چار بجے تک اچھا خاصا وقت گزر چکا تھا اور اس دوران میں اس نے کھانا بھی کھایا تھا۔ ظاہر ہے کھانے سے پہلے اور بعد میں اس نے ہاتھ ضرور دھوئے ہوں گے۔ اس صورت میں اس کے ہاتھوں پر سے بارود کے ذرات بھی صاف ہوگئے ہوں گے جو پیرافن ٹیسٹ میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ انہی اسباب کے پیشِ نظر ہم نے ملزم کا مذکورہ ٹیسٹ نہیں کروایا۔"

انکوائری آفیسر کی دلیل میں اچھا خاصا وزن موجود تھا لہٰذا اس سلسلے میں، میں نے اس سے زیادہ جرح نہیں کی اور مزید چند سوالات کے بعد اسے فارغ کردیا۔

اگلا گواہ آستانے پر کام کرنے والا آفس بوائے جمشید تھا۔ جمشید کی عمر پچیس چھبیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک مناسب صورت اور دراز قد شخص تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر بیان ریکارڈ کروایا۔ وہ بولتے ہوئے تھوڑا اٹکتا تھا۔ شاید اس کی زبان کے ساتھ کوئی میڈیکل پرابلم تھی۔ ایسے مسائل عموماً پیدائشی ہوتے ہیں اور اکثر معاملات میں ناقابلِ علاج بھی۔ میں یہاں پر جمشید کی گفتگو عام اور سادہ انداز میں پیش کروں گا ورنہ "اٹکنے" کا سلسلہ آپ کے لئے الجھن کھڑی کردے گا۔

جمشید کا بیان مکمل ہوچکا تو وکیل استغاثہ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے گواہ والے کٹہرے کے نزدیک آکر پہلا سوالا کیا۔

’’مسٹر جمشید! تم چمن شاہ کے آستانے پر کب سے کام کر رہے ہو؟‘‘

’’کام کر رہا تھا کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔‘‘ وہ سادگی سے بولا۔ ’’اب تو چمن شاہ رہا، نہ اس کا آستانہ اور نہ ہی میری نوکری، بہر حال۔‘‘ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے کم وبیش ایک سال تک اس آستانے پر کام کیا ہے۔‘‘

’’اس دوران میں تم نے چمن شاہ کو کیسا پایا؟‘‘

’’میں اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں جناب!‘‘ میں معتدل انداز میں بولا۔ ’’میں نے شاہ جی کو ٹھیک ٹھاک ہی پایا ہے...... میرا مطلب، تھا۔ اب تو شاہ جی مرحوم ہو چکے۔‘‘

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ’’ملزم تمہاری موجودگی ہی میں آستانے پر ملازم ہوا تھا؟‘‘

اس نے اثبات میں سر کو خفیف جنبش دی۔

وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔ ’’میری معلومات کے مطابق ملزم نے لگ بھگ دو ماہ تک آستانے پر کام کیا، میرا مطلب ہے آستانے کی پبلسٹی کے لئے کام کیا۔ اگرچہ یہ ایک مختصر سا عرصہ ہے لیکن انسان کو سمجھنے کے لئے چند لمحات بھی کافی ہوتے ہیں۔‘‘ وکیل استغاثہ معنی خیز انداز میں خاموش ہو گیا۔ ردِ عمل کے طور پر گواہ نے وکیل استغاثہ کو دیکھا، وہ گواہ کی اُلجھن کو دور کرتے ہوئے بولا۔ ’’تمہارے نزدیک ملزم کس ٹائپ کا بندہ تھا؟‘‘

’’بہت ہی فضول اور واہیات۔‘‘ وہ کھٹ سے بولا۔

وکیل استغاثہ نے فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھا اور گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ’’تم کہنا کیا چاہتے ہو مسٹر جمشید! ذرا اپنی بات کی وضاحت کرو۔‘‘

میں وکیل استغاثہ کے زاویے کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ میرے موکل کو طیش دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس سلسلے میں اس نے گواہ کو کوئی خاص بیان رٹوا رکھا ہو لیکن میرا موکل نہایت ہی صبر و برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس قسم کے مقدمات میں سب سے زیادہ نازک اور قابل رحم پوزیشن ملزم کی ہوتی ہے۔ اسے سب کی تلخ و ترش سننا پڑتی ہیں اور وہ بھی نہایت ہی خاموشی کے ساتھ۔ یہ خاموشی اس کی مجبوری بھی ہوتی ہے اور اسی میں اس بے چارے کا بھلا بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ میرا موکل میری ہدایت کے مطابق عمل کر رہا تھا۔

وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں گواہ نے کچھ یوں وضاحت کی۔ ’’جناب! میں نے ایسا بد دماغ اور مغرور شخص اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ دنیا کی ہر شے میں اسے کیڑے نظر آتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے خوردبین کے لینس والی عینک پہن رکھی ہو۔ ہر چیز پر تنقید یہ اپنا حق سمجھتا ہے حتیٰ کہ اس سلسلے میں ملزم نے چمن شاہ کو بھی نہیں چھوڑا۔ حالانکہ شاہ جی نے برے وقت میں اسے سہارا دے کر جو احسان کیا تھا وہ ملزم کو زندگی بھر یاد رکھنا چاہئے تھا مگر اس نے اس کے برعکس کیا۔‘‘ پھر گواہ نے میرے موکل کی

جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ’’اس احسان ناشناس شخص نے اپنے ہی محسن کے خون میں ہاتھ رنگ ڈالے۔ یہ احسان فراموشی کی ایک زندہ مثال ہے۔‘‘

گواہ کے ان جذباتی کلمات کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح ختم کر دی۔ میں اپنی مخصوص سیٹ سے اٹھا اور جرح کے لئے وٹنس باکس (گواہ والے کٹہرے) کے نزدیک آ گیا۔ میں چند لمحات تک بڑی گہری اور خاموش نگاہ سے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں جمشید سے مخاطب ہوا۔

’’مسٹر جمشید! لگتا ہے، ملزم کے خلاف ایک مخصوص رنگ کا بیان رٹنے میں تمہیں بہت زیادہ محنت کرنا پڑی ہے۔ کیا اس محنت و مشقت کے لئے تمہیں کوئی معاوضہ وغیرہ بھی دیا گیا ہے؟‘‘

’’آبجیکشن یور آنر!‘‘ وکیل استغاثہ کی احتجاجی آواز سے عدالت کا کمرا گونج اٹھا۔ جج سمیت حاضرین عدالت نے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ ’’جناب عالی! وکیل صفائی معزز گواہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔‘‘

’’گمراہ!‘‘ میں نے وکیل استغاثہ کے الفاظ دہرائے اور دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ’’جناب عالی! میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔‘‘ میرے الفاظ سے حیرت ٹپکتی تھی۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ’’آپ نے معزز گواہ پر رشوت لینے کا الزام لگایا ہے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسٹر جمشید جھوٹا گواہ ہے؟‘‘

’’میں واقعی یہ کہنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے وکیل مخالف کو سلگانے کی خاطر کہا۔

’’کیا آپ اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں؟‘‘ وکیل استغاثہ چراغ پا ہوتے ہوئے بولا۔

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ’’بیگ صاحب! آپ گواہ کو کس بنا پر دروغ گو کہہ رہے ہیں؟ کیا اس نے معزز عدالت کے سامنے کوئی غلط بیانی کی ہے؟‘‘

’’ایگزیکٹلی یور آنر!‘‘ میں نے اپنی بات میں زور پیدا کیا۔ ’’اور میں گواہ کی دروغ گوئی ثابت بھی کر سکتا ہوں۔‘‘

جج، وکیل استغاثہ اور دیگر حاضرین عدالت سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

میں دراصل مخالف پارٹی پر دباؤ ڈالنے کے لئے وہ ڈرامائی سچویشن پیدا کر رہا تھا ورنہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سب کی استفساریہ نظروں کی تشفی بھی ضروری تھی لہٰذا میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

’’جناب عالی!‘‘ میرا مخاطب عزت مآب جج تھا۔ ’’گواہ جمشید نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ مقتول چمن شاہ نے احسانِ عظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے موکل کو اپنے آستانے پر نوکری دی تھی۔ لیکن احسان فراموش ملزم نے اپنے محسن کے خون میں ہاتھ رنگ ڈالے۔ اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیا گواہ نے اپنی آنکھوں سے

یہ قتل ہوتے دیکھا تھا؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے تیز سوالیہ نظر سے گواہ جمشید کو گھورا۔

وہ بوکھلا گیا اور اضطراری انداز میں بولا۔"مم...... میرا مطلب ہے...... میں نے اپنی آنکھوں سے...... میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ...... ظاہر ہے، ملزم نے قتل کی واردات کی ہے تو وہ آج کٹہرے میں کھڑا ہے......"

اس کی بے ربط باتیں اس کی اُلجھن زدہ ذہنی کیفیت کی غماز تھیں۔ میں نے اسے رگیدنے کا فیصلہ کیا اور سخت لہجے میں کہا۔"مسٹر جمشید! اگر تم نے اپنی آنکھوں سے قتل کی اس واردات کا مشاہدہ نہیں کیا تو پھر تمہارا یہ کہنا کہ ملزم نے مقتول کے خون میں ہاتھ رنگ ڈالے، دروغ گوئی کے زمرے ہی میں آئے گا۔ معزز عدالت کے سامنے سوچ سمجھ کر زبان کھولنا چاہئے۔"

وہ قدرے سہم گیا۔"جی، میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا۔"

اس موقع پر وکیل استغاثہ اس کی مدد کو لپکا۔"گواہ دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ملزم کو چمن شاہ کے قتل کے الزام میں عدالت تک لایا گیا ہے۔"

وکیل استغاثہ کی لیپا پوتی بعداز وقت تھی میں نے اس کے زخم پر نمک چھڑکتے ہوئے نہایت ہی سادگی سے کہا۔"اس وضاحت کے لئے بہت بہت شکریہ میرے فاضل دوست!"

جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔"بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔"

میں گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔"مسٹر جمشید! کیا تم میرے موکل سے کسی قسم کی دشمنی رکھتے ہو؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔"تم نے اپنے وکیل کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کے روبرو یہ بیان کیا ہے کہ ملزم نہایت ہی فضول اور واہیات ٹائپ کا انسان ہے۔ کیا اس کی ذات سے تمہیں کبھی کوئی نقصان پہنچا؟"

"نن...... نہیں۔"

"پھر تمہارے ان خیالات کی کیا توجیہہ ہے؟"

"میں درحقیقت یہ کہنا چاہ رہا تھا......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔"ملزم ہر وقت الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کے خیالات بہت خطرناک تھے۔ یہ ہر شے کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ چمن شاہ کے بارے میں بھی یہ بڑی بے ہودہ باتیں کرتا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اسے کسی اندرونی طاقت نے اس موضوع کو نہ چھیڑنے کی تلقین کی ہو۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔"مثلاً ملزم جادو ٹونے اور تعویز گنڈے پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ عملیات وغیرہ کو بھی نہیں مانتا۔ اس کی باتوں کا نچوڑ یہ نکلتا تھا کہ اس کے نزدیک چمن شاہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر

اپنی دکانداری چمکا رہا تھا۔ اسے احسان فراموشی اور کم ظرفی نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟"

گواہ نے بڑی خوب صورتی سے مقتول کی ذات کے ایک پہلو کو کیموفلاج کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بھی اس حوالے سے اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ چمن شاہ کی ذات کا وہ پہلو ہمارے کیس کا حصہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

"تم نے میرے موکل کے جن خیالات کو فضول، واہیات اور بے ہودہ گردانا ہے وہ تمہاری ذاتی رائے ہے۔ تم اپنی ذاتی پسند ناپسند کی بنا پر کسی شخص کو تنقید کا ہدف نہیں بنا سکتے۔ ممکن ہے، دوسروں کی نظر میں تمہارے خیالات انتہائی فضول اور ضعیف الاعتقادی کی مثال ہوں۔" میں ایک لمحے کے لئے سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"میرے موکل نے لگ بھگ دو ماہ تک چمن شاہ کے آستانے پر ملازمت کی ہے۔ اس دوران میں اگر تمہیں اس کی ذات سے کوئی نقصان پہنچا ہو یا اس نے کبھی تمہاری دل آزاری کی ہو تو بتاؤ؟"

"یہ سوال آپ پہلے بھی پوچھ چکے ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔"اور میرا جواب یہ ہے کہ ذاتی طور پر مجھے ملزم سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں۔"

میں نے اپنے سوالات کے رخ کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے گواہ جمشید سے پوچھا۔"مسٹر جمشید! تم مقتول کے آستانے پر کس نوعیت کی ملازمت کرتے تھے؟"

"آپ معزز اور مہذب الفاظ میں مجھے آفس بوائے کہہ لیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔"حالانکہ نہ تو میں بوائے ہوں اور نہ ہی شاہ جی کا آستانہ کوئی آفس تھا۔" پھر وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔"آپ مجھے ایک چپراسی سمجھ لیں۔ میں چھوٹے موٹے ہر قسم کے کام کرتا تھا۔"

"میں صرف تمہارے ایک کام کو فوکس کرتا ہوں تاکہ تمہیں جواب دینے میں آسانی رہے۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔"اس لئے جو بھی بولنا، اچھی طرح سوچ سمجھ کر بولنا۔"

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وکیل استغاثہ متعجب انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے گواہ جمشید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔"آستانے کے اسٹاف اور مقتول کے لئے لنچ کا بندوبست تم ہی کرتے تھے؟"

"جی ہاں، یہ میری ڈیوٹی تھی۔" اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔"میں ایک قریبی ہوٹل سے کھانا لے کر آتا تھا۔"

"مجھے پتا چلا ہے، مقتول لگ بھگ ڈیڑھ بجے لنچ کرتا تھا؟"

"آپ کو کسی نے بالکل درست بتایا ہے۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔"میں پہلے شاہ جی کے لئے ہی کھانا لاتا تھا۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں لنچ سے فارغ ہو جاتے تھے۔ میں ان کے جھوٹے برتن اٹھا لیتا تو وہ چھوٹے کمرے (ریسٹ روم) میں آرام کرنے چلے جاتے۔"

"کیا یہ مقتول کا روز کا معمول تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، وہ باقاعدگی کے ساتھ قیلولہ کرتے تھے۔"

"تم لوگ کتنے بجے لنچ کرتے تھے؟"

"کم و بیش ڈھائی بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"گویا تمہیں ایک مرتبہ کھانا لینے کے لئے ہوٹل پر جانا پڑتا تھا!"

"ظاہری بات ہے۔"

"تم تمام کھانا ایک ہی بار کیوں نہیں لے آتے تھے؟"

"انیق صاحب کو یہ بات پسند نہیں تھی۔" اس نے عام سے لہجے میں بتایا۔ "ان کا خیال تھا، ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد ایک تو کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے، دوسرے اس کا اصل ذائقہ بھی برقرار نہیں رہتا۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تو نوکر ہوں جی۔ شاہ جی نے مجھے اپنی اور اپنے اسٹاف کی خدمت کے لئے رکھا تھا۔ یہ لوگ مجھے اگر دس مرتبہ بھی کھانا لینے بھیجتے تو میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔"

"ایک وفادار خدمت گار کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔" میں نے ستائشی نظر سے گواہ کو دیکھا۔ میں ان ہلکی پھلکی باتوں سے اسے ایک مخصوص مقام تک لانا چاہتا تھا اور میں اس کی بے خبری میں اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "مسٹر جمشید! تمہاری یادداشت کیسی ہے؟"

"میرے خیال میں تو بہت اچھی ہے۔ کیوں؟"

"ذرا سوچ کر بتاؤ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "وقوعہ کے روز ملزم نے کس رنگ کا لباس پہن رکھا تھا؟"

وہ ایک لمحہ آنکھیں بند کئے کھڑا رہا پھر بڑے وثوق سے بولا۔ "بلیو جینز اور دھاری دار ٹی شرٹ۔"

میں نے تصدیقی انداز میں اپنے موکل کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں گواہ جمشید کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "مسٹر جمشید! وقوعہ کے روز بھی تم نے مقتول کو مقررہ وقت پر ہی لنچ کروایا تھا؟"

"جی ہاں، بالکل۔ ڈیڑھ بجے میں نے شاہ جی کا کھانا لگا دیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "مسٹر جمشید! وقوعہ کے روز ملزم کتنے بجے آستانے پر آیا تھا؟"

"میرا خیال ہے، اس وقت دو بج رہے تھے۔"

"تم اپنے لئے کھانا لے آئے تھے؟"

"نہیں، میں کھانے کے لئے ہوٹل کی طرف جانے ہی والا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، تم نے مقتول کے جھوٹے برتن سمیٹ لئے تھے؟"

"جی ہاں، میں اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہی اپنے لئے کھانا لینے جاتا تھا۔"

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر جمشید! استغاثہ کے مطابق جب ملزم آستانے پر پہنچا تو مقتول کے اسسٹنٹ انیق نے اسے اطلاع دی تھی کہ مقتول ملزم سے ملنا چاہتا ہے بلکہ اس نے ملزم کو اپنے پاس طلب کیا تھا۔" ایک لمحے کا وقفہ دے کر میں نے گواہ سے پوچھا۔ "تم سے میرا یہ سوال ہے کہ کیا انیق نے تمہارے سامنے ملزم سے یہ بات کی تھی؟"

اس نے نفی میں گردن کو جھٹکا اور بولا۔ "نہیں جناب! میں اس وقت کچھ کہے سنے بغیر باہر نکل گیا تھا۔"

"مسٹر جمشید!" میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جب تم کھانا لے کر واپس آئے تو کیا ملزم آستانے پر موجود تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں جناب! وہ لنچ کے لئے آستانے سے نکل چکا تھا۔"

"تم کتنی دیر کے بعد واپس آئے تھے؟"

"پندرہ بیس منٹ بعد...... یا ایک دو منٹ اس سے زیادہ لگا ہوگا۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

"آستانے پر آ کر مجھے پتا چلا کہ وہ چند منٹ پہلے وہاں سے روانہ ہوا تھا۔"

"کیا ملزم آپ لوگوں کے ساتھ لنچ نہیں کرتا تھا؟"

"نہیں۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"ایک وجہ تو اس کی دماغی ٹیڑھ ہے۔" وہ ناپسندیدہ نظروں سے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس کا مزاج کسی سے ملتا ہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک ساتھ لنچ نہ کرنے کا یہ بھی سبب تھا کہ اس کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی وہ کھانا کھانے کے بعد ہی آستانے پر پہنچتا تھا اور کبھی تین چار بجے تک بھوکا رہتا۔ آپ اسے سنکی یا موڈی کہہ سکتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "مسٹر جمشید! تم لوگوں نے وقوعہ کے روز حسب معمول ڈھائی بجے ہی کھانا کھایا تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے سوال کیا۔ "وقوعہ کے روز چمن شاہ کی بیوی آستانے پر آئی تھی۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، وہ کتنے بجے وہاں پہنچی تھی؟"

"میڈم نادرہ پونے تین بجے آستانے پر آئی تھیں۔"

"کیا وہ روزانہ اسی وقت آستانے پر آتی تھی؟"

"وہ روزانہ نہیں آتی تھیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ ان کا چکر لگتا تھا اور اس آمد کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا۔"

"میڈم نادرہ آستانے میں داخل ہوتے ہی مقتول کے کمرے کی طرف چلی گئی تھی؟"

"ظاہر ہے، انہیں کون روک سکتا ہے؟" وہ بے چارگی سے بولا۔ "وہ جب بھی آتیں، سیدھی شاہ جی کے کمرے میں چلی جاتیں۔ وقوعہ کے روز جب وہ وہاں پہنچیں تو ہمارا لنچ اختتامی مراحل میں تھا۔ انیق صاحب نے ان کے احترام میں اٹھنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور شاہ جی کے حجرے میں داخل ہوگئیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے سنسنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔

کٹہرے میں کھڑے گواہ نے ایک جھرجھری لی اور سراسیمہ آواز میں بتانے لگا۔ "میڈم نادرہ جیسے تیزی سے شاہ جی کے حجرے میں داخل ہوئی تھیں اسی سرعت سے واپس بھی پلٹ آئیں اور باہر آکر انہوں نے ایک خوف ناک انکشاف کیا۔"

یہاں تک بیان کرنے کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

"مسٹر جمشید! وہ خوفناک انکشاف یہی تھا کہ چمن شاہ اپنے حجرے میں نیم برہنہ اور مُردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر کسی سائلنسر لگے ریوالور سے دو سفاک گولیاں اتار دی گئی تھیں؟"

"جی ہاں...... جی ہاں......" اس نے بڑی شدت سے اثبات میں سر جھٹکا۔

میں نے دریافت کیا۔ "کیا اس وقت تک ملزم لنچ کر کے واپس آستانے پر آچکا تھا؟"

"نہیں، وہ چار بجے کے قریب واپس آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اور شاید یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ "میڈم نادرہ نے مقتول کے حجرے سے باہر آنے کے بعد کس قسم کے اقدامات کئے تھے؟"

اس نے چند لمحات تک سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "میڈم نے ہمیں جو سنسنی خیز اطلاع دی اس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا اور ہم بے اختیار شاہ جی کے حجرے کی طرف بڑھ گئے۔ میڈم نادرہ بھی ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ ہم نے شاہ جی کے ریسٹ روم میں وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کا ذکر میڈم نے کیا تھا۔ شاہ جی واقعی وہاں نیم برہنہ مُردہ حالت میں پڑے تھے۔ یہ واقعہ ہمارے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ میڈم ہم سب کو لے کر دوسرے کمرے میں آگئیں اور اس سانحے کے بارے میں تفتیش کرنے لگیں۔ ظاہر ہے، مجھے تو کچھ پتا نہیں تھا۔ اس دوران میں، میں تو آستانے سے باہر تھا اس لئے میڈم کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا۔ یہی حالت نازیہ کی بھی تھی۔ البتہ انیق کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہمارے آستانے کا وہ واحد شخص تھا جس نے شاہ جی کو آخری مرتبہ زندہ دیکھا تھا۔ میں جب برتن سمیٹ کر باہر آیا تھا تو انیق، شاہ جی کے حجرے میں داخل ہوا تھا۔ انیق نے میڈم کے مختلف سوالات کے جواب دیئے۔ انہی جوابات میں

ایک انکشاف انگیز بات یہ بھی تھی کہ اس کے باہر آنے کے بعد ملزم شاہ جی سے ملنے ان کے حجرے میں گیا تھا اور اس نے آکر بتایا تھا کہ شاہ جی اپنے دفتری حصے میں موجود نہیں جس سے یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ وہ اپنے ریسٹ روم میں آرام فرما رہے ہوں گے۔ کیونکہ ریسٹ روم کا دروازہ بھی بھڑا ہوا پایا گیا تھا۔"

"اور اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ مقتول چمن شاہ کو میرے موکل نے قتل کیا ہے؟" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "حالات اور واقعات تو اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ انیق صاحب، شاہ جی کے بھروسے کے آدمی ہیں اور برسوں کے آزمائے ہوئے ہیں۔ ان پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے آخری مرتبہ چمن شاہ کو ان کے حجرے میں زندہ سلامت دیکھا تھا۔ ان کے بعد ملزم شاہ جی سے ملنے اندر گیا اور بس...... پھر کسی بندے بشر نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔"

وہ سانس لینے کے لئے ذرا خاموش ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں جب ہوٹل سے کھانا لے کر واپس آیا تو ہم سب مل کر کھانے میں مصروف ہو گئے اور اس وقت تک کھانے کی میز پر موجود رہے جب تک میڈم نادرہ آستانے پر آنہیں گئیں۔ اس کے بعد کی بات میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

گواہ کٹہرے میں کھڑا گہری سانسیں لینے لگا۔ اس نے اپنے بیان کو خاصا تفصیل سے بتایا تھا۔ میں نے اسے ذرا موقع دینا مناسب نہ سمجھا اور اگلا سوال داغ دیا۔

"مسٹر جمشید! تم نے بتایا ہے کہ جب میڈم نادرہ نے ماہر عملیات چمن شاہ کی عبرت ناک موت کی اطلاع دی اس وقت تک ملزم کھانا کھا کر آستانے پر واپس نہیں آیا تھا۔ اس دوران میں تمہاری میڈم نے کیا چارہ جوئی کی؟"

"میڈم نادرہ اپنے شوہر چمن شاہ کی موت پر بہت بوکھلائی ہوئی تھیں۔" استغاثہ کے گواہ جمشید نے بتایا۔ "وہ پہلی فرصت میں یہ جاننا چاہتی تھیں کہ چمن شاہ کو قتل کس نے کیا ہے۔ ان اوقات میں آستانے پر جو حالات و واقعات پیش آئے وہ ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہیں لہٰذا میڈم کو اسی شخص کی تلاش تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہم میں سے کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کسی ہوٹل میں لنچ کرنے گیا ہے۔ بہرحال، مجھے پھر بھی دوڑایا گیا۔ میں نے آستانے کے نزدیک واقع دو تین ہوٹل جھانک لئے مگر ملزم مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں ناکام و نامراد واپس آگیا اور آستانے پر پہنچنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ اس دوران میں پولیس کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ ان لمحات میں میڈم نادرہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ شوہر کی موت کا غم تو انہیں تھا ہی لیکن انہوں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور پولیس کو فون کر دیا۔"

میں نے سوال کیا۔ ''مسٹر جمشید! کیا پولیس تمہاری موجودگی ہی میں آستانے پر پہنچی تھی؟''
اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی ہاں، میں اس وقت وہیں تھا۔''
میں نے پوچھا۔ ''پولیس نے آستانے پر آ کر کس قسم کی کارروائی کی؟''
''انہوں نے سب سے پہلے چمن شاہ کی لاش کا معائنہ کیا۔'' گواہ نے بتایا۔ ''اسی دوران میں انہیں بتایا گیا کہ شاہ جی کو ملزم یعنی شاکر علی نے قتل کیا ہے۔''
میں نے تیز آواز میں پوچھا۔ ''پولیس کو یہ بات کس نے بتائی تھی؟''
''چمن شاہ کے اسسٹنٹ انیق صاحب نے۔'' اس نے جواب دیا۔
یہ ایک اہم انکشاف تھا لیکن میرے لئے کچھ زیادہ غیر متوقع نہیں تھا۔ یہی شخص میرے موکل کو شاہ جی کے پاس بھیجنے والا تھا۔ وہ اس قسم کی بات کر سکتا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔
''مسٹر جمشید! انیق کے انکشاف پر پولیس کا کیا ردِ عمل تھا؟''
''وہ ملزم کے بارے میں کرید میں لگ گئے تھے۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''انیق صاحب نے انہیں ملزم کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کیں۔ مثلاً اس کا گھر کہاں ہے، یہ کب آستانے پر آتا ہے اور کب واپس جاتا ہے۔ اس کے کام کی نوعیت کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پولیس کو جب یہ پتا چلا کہ ملزم لنچ کے بعد واپس آستانے پر آتا ہے تو انہیں اس بات پر حیرت ہوئی کہ وہ اب تک آیا کیوں نہیں۔ آج اسے خلافِ معمول اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ انیق صاحب اس کے قتل میں ملوث ہونے کی بات کر چکے تھے۔ لہٰذا پولیس کا خیال تھا کہ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔ قاتل جائے واردات سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو سب انسپکٹر اس معاملے کی تفتیش کے لئے آیا تھا اس نے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد سیدھا اختر کالونی شاکر کے گھر جائے گا۔''
''کیا سب انسپکٹر نے اپنے کہے پر عمل کیا تھا؟''
''اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔'' استغاثہ کے گواہ نے بتایا۔ ''جائے واردات پر تفتیش ابھی جاری تھی کہ ملزم خود ہی واپس آ گیا۔''
میں نے جلدی سے کہا۔ ''ملزم کی واپسی سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس واردات میں ملوث نہیں تھا...... سب انسپکٹر کے فارمولے کے مطابق۔ ورنہ وہ ادھر کا رخ نہ کرتا!''
''جی، وہ فارمولا تو یہی بتاتا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''لیکن ملزم کی واپسی سے قبل ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ اس پر قانون کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی۔''
''کیسا واقعہ؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
اس نے بتایا۔ ''ملزم اپنا بیگ نازیہ کے پاس رکھوا گیا تھا۔ جب پولیس نے اس بیگ کی تلاشی

لی تو آلۂ قتل برآمد ہو گیا...... سائلنسر لگا ریوالور۔''
''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''یہ آئیڈیا کس کا تھا کہ ملزم کے بیگ کی تلاشی لی جائے؟''
''پولیس کو یہ مشورہ انیق صاحب ہی نے دیا تھا۔''
میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔
''مسٹر جمشید! تم اپنی مضبوط یادداشت کو ثابت کر چکے ہو۔ اب ذرا یہ بھی بتاؤ کہ وقوعہ کے روز جب میڈم نادرہ آستانے پر پہنچی تو اس نے کون سا اور کس رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا؟''
وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میڈم نادرہ نے اس روز فیروزی ساڑھی باندھ رکھی تھی جس کا بارڈر خاصا چوڑا تھا۔ یہ بات مجھے اس لئے بھی یاد رہ گئی کہ فیروزی ساڑھی پر سنہرا بارڈر بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔''
میں نے مزید دو تین سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔
جج نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اس نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔
شاید میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ پہلی باقاعدہ سماعت پر میں نے موکل کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی خاص طور پر جب ملزم مفلوک الحال اور مدعی صاحب حیثیت اور طاقت ور ہو۔
میں عدالت کے کمرے سے باہر آیا تو موکل کی ماں منیرہ بیگم بھی ساتھ تھی۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اس نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے گواہ پر جرح تو بہت بھرپور کی ہے۔ مجھے امید ہے جیت ہماری ہو گی۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ شاکر کی ضمانت ہو جاتی۔ وہ گھر پر آ جاتا تو میرے دل کو قرار آ جاتا۔''
وہ ایک ماں تھی اور ہر ماں اپنی اولاد کے لئے جس قسم کے سچے اور گہرے جذبات رکھتی ہے اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ مگر قانون اور عدالت کا اپنا دستور ہوتا ہے۔ ان کے طور طریقے جذبات کے تابع نہیں ہوتے۔ یہ صرف عقلی دلائل اور واقعاتی شواہد کو مانتے ہیں۔ میں نے منیرہ بیگم کو حتیٰ الامکان تسلی تشفی دی اور اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کا بیٹا بہت جلد باعزت بری ہو جائے گا۔
وہ میرا شکریہ ادا کر کے مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

✿✿✿

گواہوں کے کٹہرے میں نازیہ خاصی پریشان کھڑی تھی! اس کی حالت کو دیکھ کر بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ عدالت میں حاضری دینے کا اس کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ وہ خاصی نروس اور سہمی

ہوئی نظر آتی تھی۔ نازیہ کی عمر چوبیس سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلی پتلی اور خوش شکل لڑکی تھی۔ اس نے پھول دار لان کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔

عدالت کے اصول کے مطابق اس نے بیان ریکارڈ کروانے سے پہلے سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد ایک مختصر بیان دے دیا۔ گواہ کے بیان کی تکمیل کے بعد وکیل استغاثہ نے نازیہ والے کٹہرے کا رخ کیا۔

''مس نازیہ!'' وہ استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو مقتول چمن شاہ کے آستانے پر کام کرتے ہوئے لگ بھگ کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''میں آٹھ، ساڑھے آٹھ ماہ سے وہاں کام کر رہی تھی۔''

''ملزم نے آستانے پر محض دو ماہ کام کیا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے سرسری انداز میں سوال کیا۔ ''آپ نے اسے کیسا پایا؟''

مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی کہ میرے موکل کی نازیہ سے اچھی بنتی تھی لہٰذا مجھے امید تھی کہ وہ میرے موکل کے خلاف کوئی لب کشائی نہیں کرے گی، میرا مطلب ہے کہ خواہ مخواہ کی مخالفانہ کوئی بات جیسا کہ استغاثہ کے گواہ جمشید نے کیا تھا۔ وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں نازیہ نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''جناب! میں آستانے پر آنے کے بعد زیادہ وقت اپنے کام میں مصروف رہتی ہوں۔ دوسروں سے زیادہ کھلنے ملنے کا مجھے موقع نہیں ملتا۔ میں کوشش کرتی ہوں اسٹاف کے دیگر افراد کے ساتھ اچھی رہوں، اس لئے وہ بھی میرے ساتھ اچھے ہیں۔''

''آپ نے خاصا ڈپلومیٹک جواب دیا ہے۔''

''یہ حقیقت ہے!'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''مقتول چمن شاہ کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟''

''میں سمجھی نہیں، آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔

وکیل استغاثہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا اشارہ ملزم کی طرف تھا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ ملزم اپنے دل میں مقتول کے خلاف بڑے خطرناک جذبات رکھتا تھا اور اکثر و بیشتر وہ اس پر تنقید کرتا رہتا تھا۔ کیا آپ نے چمن شاہ میں وہ تمام خامیاں محسوس کیں جن کا تذکرہ ملزم کیا کرتا تھا؟''

جواب دینے سے پہلے وہ چند لمحات تک گہری سوچ میں ڈوبی رہی، پھر اس نے کہا۔ ''جناب! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، میں اپنے کام میں بے حد مصروف رہتی تھی لہٰذا کسی کے خیالات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ جاننا یا اسے اپنے خیالات و نظریات سے آگاہ کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے ملزم نے خاص طور پر چمن شاہ کے خلاف مجھ سے کبھی کسی قسم کی گفتگو نہیں

کی۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر متوقف ہوئی پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ ملزم ایک روایت شکن شخص ہے۔ وہ فرسودہ اور دقیانوسی باتوں کو نہیں مانتا۔ تعویذ گنڈا اور چھوا چھکا اس کی نظر میں فضول چیزیں ہیں۔ یہ اپنے پاس آئے ہوئے مصیبت زدہ شخص کو بے وقوف بنانے کے ہتھکنڈے ہیں۔ ملزم درحقیقت اس ''معالجی طریقہ کار'' کے خلاف ہے۔ اس طریقہ کار کا حامل چاہے چمن شاہ ہو یا کوئی دوسرا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وکیل استغاثہ نے اس کی بات پوری ہونے کے بعد کہا۔ ''ہم ملزم کے خیالات اور نظریات کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ آپ معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ چمن شاہ کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں۔ کیا اسے فراڈ عامل کہا جا سکتا ہے...... یعنی کہا جا سکتا تھا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ آپ نے بڑا عجیب و غریب سوال کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں نے ذاتی طور پر کبھی شاہ جی کو آزمایا نہیں، اس کی ضرورت ہی نہیں۔ ویسے جتنے پڑھے لکھے اور بڑے لوگ آستانے پر شاہ جی سے ملنے آتے تھے انہیں اور ان کی عقیدت کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ شاہ جی بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے جس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ ان کے کام میں تاثیر ہوگی۔''

''چلیں کوئی بات نہیں۔'' وکیل استغاثہ نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تجربہ نہ سہی آپ نے اپنا مشاہدہ بیان کر دیا۔ آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول فراڈ شخص نہیں تھا۔'' ذرا وقفہ دے کر اس نے گواہ سے پوچھا۔ ''مس نازیہ! مقتول کا آپ کے ساتھ کیسا رویہ تھا؟''

''بس نارمل۔'' وہ عام سے انداز میں بولی۔ ''جیسا کسی معقول مالک کا اپنے ملازم کے ساتھ ہوتا ہے۔''

وکیل استغاثہ نے جب تک جو بھی سوالات کئے ان سب سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ مقتول چمن شاہ کو معتبر اور سچا عامل ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی یہ کوشش بھی تھی کہ وہ ملزم کو ڈی فالٹر کے روپ میں پیش کر سکے۔ وکیل استغاثہ کو اپنے مقصد میں جزوی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے اسی قسم کے چند ضروری سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔

اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد نازیہ والے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ بوکھلا گئی۔ اس بوکھلاہٹ کا سبب شاید یہ ہو کہ میں وکیل مخالف تھا۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں مخالف وکیل کا کیسا ڈراؤنا تصور ہو...... یا تصور بٹھایا گیا ہو!

میں نے بڑی مہربان نظر سے نازیہ کو دیکھا اور نرم لہجے میں کہا۔ ''مس نازیہ! کیا آج سے پہلے کبھی آپ کو کسی سلسلے میں عدالت آنے کا اتفاق ہوا ہے؟''

''نن...... نہیں۔ یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''یہ پہلا تجربہ آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟''

”ابھی تک تو سب ٹھیک چل رہا ہے۔“ وہ سادگی سے بولی۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنے ذہن کو ہر قسم کے اندیشوں سے پاک کر دیں اور ریلیکس ہو جائیں۔ اگر ابھی تک کوئی ناخوشگواریت سامنے نہیں آئی تو ان شاء اللہ بعد میں بھی نہیں آئے گی۔ ایک طرح سے آپ خود کو اس وقت اپنے گھر میں سمجھیں یا یوں خیال کریں جیسے آپ آستانے میں موجود ہوں۔ عدالت کا کمرا اتنا خطرناک نہیں ہوتا جیسا آپ کے ذہن میں ہے۔“

وہ قدرے مطمئن اور آسودہ نظر آنے لگی۔ شاید میری وضاحت نے اس کے اندیشے اور خدشے کم کر دیئے تھے۔ اسے قطعی امید نہیں ہوگی کہ مخالف پارٹی کا وکیل اس سے اس نوعیت کی میٹھی باتیں کرے گا۔

میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ”مس نازیہ! وقوعہ کے روز آپ پورا وقت آستانے پر موجود رہی تھیں؟“

”جی ہاں! ایک مرتبہ ڈیوٹی پر آنے کے بعد میں کہیں آتی جاتی نہیں۔“ اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”آستانے کے اوقاتِ کار کیا ہیں؟“

”آستانہ صبح دس بجے سے دوپہر ایک بجے تک کھلتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ایک سے تین بجے تک دو گھنٹے کا لنچ بریک ہوتا ہے۔ آپ اسے مختصر وقفہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ پھر تین بجے سے رات نو بجے تک کام جاری رہتا ہے۔ لیکن یہ اوقات اس زمانے کے ہیں جب شاہ جی زندہ تھے اور آستانہ آباد ہوا کرتا تھا۔ اب تو وہاں پہلے والی بات نہیں رہی۔ آستانہ کبھی دیر سے کھلتا ہے اور کبھی مقررہ وقت سے پہلے بند ہو جاتا ہے۔“

اس کا جواب خاصا انکشاف انگیز تھا کیوں کہ پچھلی پیشی پر گواہ جمشید نے آستانے کے حوالے سے اس قسم کا اظہارِ خیال کیا تھا کہ...... اب چمن شاہ زندہ رہا اور نہ آستانہ رہا اور نہ ہی اس کی ملازمت رہی۔ لیکن نازیہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ چمن شاہ کا آستانہ ہنوز قائم دائم ہے۔ میں نے اس حوالے سے جب اس سے سوال کیا تو اس نے بتایا کہ گواہ جمشید کی ملازمت واقعی نہیں رہی۔ انیق صاحب نے اس کی چھٹی کر دی ہے۔ باقی آستانہ چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

”آج کل اس آستانے کو کون چلا رہا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”فی الحال تو انیق صاحب ہی وہاں آنے والوں سے ڈیل کر رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن میں محسوس کر رہی ہوں، مستقبل میں نقشہ بدل جائے گا۔ کیونکہ آج کل میڈم نادرہ بھی دن میں ایک آدھ مرتبہ چکر ضرور لگاتی ہیں۔“

میں نے اس کے جواب کی روشنی میں سوال کیا۔ ”یہ آپ نے مستقبل میں نقشہ بدلنے والی کیا بات کی ہے، ذرا اس کی وضاحت کریں گی؟“

وہ بولی۔ ”میرا مطلب ہے، ہوسکتا ہے کہ آئندہ اس آستانے کو میڈم چلائیں یا کسی اور کے

حوالے کر دیں۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے، اسے بند کر دیا جائے۔ کیونکہ اس سلسلے میں لمبی لمبی میٹنگز ہوتی رہتی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بات ممکنات میں نظر نہیں آتی کہ آستانے کو بند کر دیا جائے۔ اس قسم کے آستانے اور گدیاں ایک وسیع و عریض آمدنی کے ذرائع ہوتے ہیں اور صاحب گدی یا صاحب آستانہ کے بعد زیادہ پھولتے پھلتے ہیں چاہے انہیں کوئی بھی چلا رہا ہو۔ کیوں کہ اس صورت میں وہ گدی نشین یا آستانہ مکین زندہ نہیں رہتا اور کہیں نہ کہیں اس کا مزار بھی بن جاتا ہے جس سے اس کی ”تاثیر“ میں اور زیادہ اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا چمن شاہ کا آستانہ بند تو نہیں ہوسکتا۔ میڈم نادرہ ایسی غلطی نہیں کریں گی اور......“ میں نے بات کو ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور مزید کہا۔ ”جہاں تک میڈم نادرہ کے خود آستانہ چلانے کا سوال ہے تو اس بات میں دم نظر نہیں آتا۔ البتہ یہ ممکن ہے وہ آستانہ کسی اور کے حوالے کر دیں مگر اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے، وہ آستانہ کس کے سپرد کریں گی؟ چمن شاہ کا اسسٹنٹ انیق تو اس وقت آستانہ چلا رہا ہے۔ وہ خاصا تجربہ کار شخص ہوگا۔ اگر چمن شاہ کی کوئی اولاد ہوتی تو پھر یہ مسئلہ پیش نہ آتا۔ گدی کی منتقلی آسان ہو جاتی۔ لمبی لمبی میٹنگز کس حوالے سے چل رہی ہیں؟“

نازیہ نے گواہوں والے کٹہرے میں کھڑے کھڑے اپنے جسم کے وزن کو ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کیا اور بولی۔ ”میں نے امکانات کی بات کی تھی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے، ایسا کچھ نہ ہو جیسا میں محسوس کر رہی ہوں۔ میٹنگز میں چوں کہ میں شریک نہیں ہوتی اس لئے میں اس تفصیل سے واقف نہیں ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”میٹنگز میں آپ شریک نہیں ہوتیں یا آپ کو شریک کیا نہیں جاتا؟“

”آپ کے سوال کے دوسرے حصے میں میرا جواب موجود ہے۔“ وہ سادگی سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ”ان میٹنگز میں عموماً کون لوگ شریک ہوتے ہیں؟“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا برداشت کر رہا تھا، اچانک چلا اٹھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کھڑا ہونے کے دوران میں اعتراض کیا تھا۔

میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور کہا۔ ”میرے فاضل دوست! میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا!“

”آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“ جج نے وکیل استغاثہ سے دریافت کیا۔

وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ ”یور آنر! اس وقت عدالت میں چمن شاہ مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور فاضل وکیل آستانے کے انتظام و انصرام کے قصے چھیڑنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کی یہ کوشش معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔“

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”چمن شاہ کا قتل اس کے آستانے پر ہوا ہے اس لئے آستانے کو زیر

بحث لانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے۔"
"لیکن آپ استغاثہ کے گواہ سے جس قسم کے سوالات کر رہے ہیں ان کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ شپٹائے ہوئے انداز میں بولا۔
میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے، آپ کے نزدیک میرے سوالات غیر متعلق ہوں لیکن میں جانتا ہوں، میں کتنی متعلق اور اہم جرح کر رہا ہوں۔"
وکیل استغاثہ نے دال نہ گلتے دیکھ کر جج کی جانب رخ کیا اور فریادی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی اپنے ان ہتھ کنڈوں کے لئے خاصے مشہور ہیں۔ یہ غیر ضروری باتوں میں الجھا کر عدالت کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو ان سے اس قسم کی شکایت رہتی ہے۔"
"شکریہ مائی ڈیئر کونسلر!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
"یہ آپ میرا شکریہ کس بات کے لئے ادا کر رہے ہیں؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "یہ شکریہ آپ کی اس عنایت کے بدلے ہے کہ آپ نے میرے لئے لفظ "مشہور" استعمال کیا۔ ورنہ آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ...... میں ان ہتھکنڈوں کے لئے خاصا بدنام ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں غیر ضروری باتوں میں الجھا کر عدالت کا وقت برباد نہیں کرتا۔" میں چند لمحات کے لئے خاموش ہوا پھر وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا ان افراد میں سے چند ایک کے نام بھی گنوا دیں جنہیں مجھ سے اس قسم کی شکایت ہے۔ آپ نے ابھی اکثر لوگوں کا حوالہ دیا ہے۔"
جج نے ہماری بحث بحثی کے بیچ مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ آپس میں الجھنے کے بجائے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھائیں تو اچھا ہے۔"
بات ختم کرتے ہی اس نے دیوار گیر کلاک کو دیکھا۔ جج کی یہ ادا ہمیں وقت کا احساس دلانے کے لئے تھی۔ میں نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔
"جناب عالی! اگر گواہ کو میرے سوال کا جواب دینے پر کوئی اعتراض ہو تو میں دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔"
جج نے سوالیہ نظر سے کٹہرے میں کھڑی استغاثہ کی گواہ نازیہ کو دیکھا۔ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ "میرے خیال میں وکیل صاحب کے سوال میں اعتراض والی کوئی بات نہیں!"
میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھا اور گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پوچھا۔ "مس نازیہ! آپ نے جن میٹنگز کا ذکر کیا ہے، ان میں عموماً کون لوگ شریک ہوتے ہیں؟"
عموماً میڈم نادرہ اور انیق صاحب۔" اس نے جواب دیا۔ "ایک آدھ مرتبہ باہر کا ایک آدمی

بھی ان میں شامل تھا۔"
"باہر کا آدمی!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "ذرا اس باہر کے آدمی پر روشنی ڈالیں گی آپ؟"
وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ "میں اس شخص کو نہیں جانتی۔ اس نے چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں میری کوئی معلومات ہیں۔"
"آپ اس شخص کا حلیہ بیان کر سکتی ہیں؟"
میرے اس استفسار کے جواب میں استغاثہ کی گواہ نازیہ نے اس مخصوص آدمی کا تفصیلی حلیہ بیان کر دیا۔ میں نے وہ تفصیل اپنے ذہن میں نقش کرنے کے بعد سرسری سے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے، اگر موقع ملا تو اس میڈم نادرہ اور انیق سے اس بارے میں کوئی سوال کروں گا۔ بہر حال ان معلومات کی فراہمی کے لئے بہت بہت شکریہ۔"
وکیل استغاثہ نے کینہ توز نظر سے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔
"مس نازیہ! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم دقیانوسی اور روایتی باتوں کا حامی نہیں ہے اس لئے وہ چمن شاہ سمیت ایسے تمام عاملین کاملین کے خلاف باتیں کرتا رہتا تھا۔ کیا ملزم نے کبھی ایسی کوئی بات کی جس سے آپ نے محسوس کیا ہو، وہ چمن شاہ کے لئے اپنے دل میں کوئی خصوصی عناد رکھتا ہو؟"
اس نے نفی میں جواب دیا۔ "بالکل نہیں!"
"ملزم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"
"کس حوالے سے؟"
میں نے وضاحت کی۔ "وہ اپنے اعمال اور کردار کے حوالے سے آپ کو کیسا لگا؟"
"جہاں تک میں ملزم کو سمجھ سکی ہوں، وہ ایک اچھا انسان ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ویسے ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے یہ شخص بہت محنتی ہے اور اپنے کام سے نہایت مخلص۔"
میں نے پوچھا۔ "نازیہ صاحبہ! آپ نے کچھ دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز آپ نے پورا وقت آستانے پر گزارا تھا اور آپ کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ ڈیوٹی پر آنے کے بعد آپ کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"
"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔" وہ میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولی۔
میں نے پوچھا۔ "پھر تو آپ کو اس روز آستانے پر پیش آنے والے ایک ایک واقعے کی تفصیل یاد ہو گی۔"
"میری یادداشت بہت اچھی تو نہیں۔" وہ کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے بولی۔ "بہر حال آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ ''کچھ پوچھنے سے پہلے میں آپ کی یادداشت کا ایک چھوٹا سا ٹیسٹ لیتا ہوں۔ مجھے امید ہے، آپ اس ٹیسٹ میں کامیاب ہو جائیں گی۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی مگر خاموش رہی۔ میں نے پوچھا۔ ''ذرا سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز ملزم شاکر علی نے کس قسم کا ڈریس پہن رکھا تھا؟''

وہ ایک لمحہ غور کرنے کے بعد بولی۔ ''بلیو جینز اور ٹی شرٹ، دھاریوں والی۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اور میڈم نادرہ جب آستانے پر پہنچی تو اس نے کیا پہن رکھا تھا؟''

''فیروزی ساڑھی، سنہرے بارڈر والی۔''

''ایکسیلنٹ!'' میں نے کہا۔ ''آپ کی یادداشت ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک ہے۔''

وکیل استغاثہ میری اس غیر متعلقہ گفتگو سے پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن وہ سب کچھ سننے پر مجبور تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ مجھے کچا چبا ڈالتا لیکن اس کا بس چل رہا تھا اور نہ اتفاق سے کوئی بس چلتی تھی ورنہ عین ممکن تھا، وہ عدالت سے باہر جاتے ہی اپنی بس میری گاڑی پر چڑھانے کی کوشش کرتا۔ اس کی حالت اس وقت ایسی ہی تھی!

میں نے گواہ نازیہ سے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز ملزم کتنے بجے آستانے پر پہنچا تھا؟''

''آپ دوپہر کی بات کر رہے ہیں نا؟''

''بالکل، میں دوپہر میں اس کی آمد کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''ورنہ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ صبح آپ کے آنے سے پہلے وہ آستانے کو ٹچ کر کے جا چکا ہوتا ہے۔ آپ شاید ذرا دیر سے آتی ہیں!''

''میری ڈیوٹی ساڑھے دس سے شروع ہوتی ہے اور رات ساڑھے آٹھ تک جاری رہتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بہرحال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ وقوعہ کے دن ملزم شاکر علی دوپہر میں دو بجے آستانے پر پہنچا تھا۔''

''مجھے پتا چلا ہے چمن شاہ نے اسے فوراً اپنے کمرے میں طلب کر لیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، انیق صاحب نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے وہ شاہ جی کے پاس سے ہو کر آئے تھے۔ پھر جیسے ہی ملزم آستانے میں داخل ہوا، انیق صاحب نے اسے شاہ جی کے بارے میں بتایا یعنی ان سے ملنے کے لئے کہہ دیا۔''

''اس پر ملزم نے کیا ردِعمل ظاہر کیا؟''

''وہ فوراً شاہ جی کے کمرے میں چلا گیا تھا۔'' گواہ نازیہ نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس کی واپسی کتنی دیر بعد ہوئی تھی؟''

نازیہ نے جواب دیا۔ ''پندرہ منٹ بعد۔''

''کیا چمن شاہ سے اس کی ملاقات ہو گئی تھی؟''

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''شاید اس وقت تک شاہ جی ریسٹ روم میں قیلولہ کرنے جا چکے تھے اس لئے ملزم پندرہ منٹ بعد ان کے کمرے سے نکل آیا تھا۔''

''کیا یہ قیلولہ والی بات آپ کو ملزم نے بتائی تھی؟''

''نہیں، یہ میرا اور انیق صاحب کا خیال تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے، ملزم نے چمن شاہ کے ریسٹ روم میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''ورنہ وہ باہر آ کر قدرے مختلف بات بتاتا۔''

وہ بولی۔ ''ملزم کا یہی بیان ہے کہ وہ ریسٹ روم کی طرف نہیں گیا۔'' اس نے کہا۔

''مقتول چمن شاہ کے حجرے سے باہر آنے کے بعد ملزم نے کیا، کیا تھا؟''

''اس نے اپنا بیگ میرے پاس رکھوایا اور لنچ کے لئے باہر چلا گیا۔''

''کیا بیگ آپ کے پاس رکھوانا اس کا معمول تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔ ''میں چونکہ ریسپشنسٹ ہوں اور دروازے سے داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری سیٹ ہے، اس لئے اکثر لوگ کچھ نہ کچھ میرے پاس رکھوا دیتے ہیں۔''

''کیا آپ نے کبھی ملزم کے بیگ کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کی؟''

''کبھی نہیں۔'' وہ شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہوتی۔ ویسے بھی مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے، ملزم کے بیگ میں آستانے کا پبلسٹی میٹر ہوتا تھا۔''

اس بات سے ظاہر ہوا کہ وہ میرے موکل اور اس کے بیگ کے اندرونی حالات سے بخوبی واقف تھی۔

''لیکن وقوعہ کے روز تو اس بیگ میں سے اور بھی ایک خطرناک شے برآمد ہوئی تھی۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''جس کی بنا پر میرے موکل کو چمن شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔''

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''اگر میں نے اپنی آنکھوں سے سائلنسر لگا ریوالور ملزم کے بیگ سے برآمد ہوتے نہ دیکھا ہوتا تو شاید مجھے یقین نہ آتا لیکن...''

''لیکن کیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''مم...... میرا مطلب ہے، آلۂ قتل ملزم کے بیگ سے برآمد ہوا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس بات پر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے، ملزم کے بیگ کی تلاشی کسی کی نشاندہی پر لی گئی تھی؟''

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''جب پولیس نے آستانے پر پہنچ کر اپنی تفتیش کا آغاز کیا تو بہت سی باتیں سامنے آئیں۔ انیق صاحب کے مطابق جب آخری مرتبہ وہ شاہ جی کے کمرے سے نکلے تو مقتول شاہ جی زندہ تھے۔ میڈم نادرہ جب شاہ جی کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ مُردہ حالت میں وہاں پڑے تھے۔ ان دو افراد کے درمیان صرف ملزم ہی شاہ جی کے کمرے میں پندرہ منٹ گزار کر آیا تھا۔ اس پس منظر میں پولیس نے ملزم اور اس کی سیٹ کے بارے استفسار کیا۔ انیق صاحب نے پولیس کو بتایا کہ ملزم لنچ کرنے آستانے سے باہر گیا ہوا ہے البتہ اس کا بیگ یہیں پر موجود ہے۔ اس کے بعد ہی ملزم کے بیگ کی تلاشی لی گئی جس کے نتیجے میں آلہ قتل پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور جب ملزم چار بجے واپس آستانے پر آیا تو پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''مس نازیہ! استغاثہ کے ایک گواہ نے انکشاف کیا ہے کہ ملزم کے بیگ کی تلاشی تو انیق کے ایما پر ہی لی گئی تھی تاہم اس سے قبل وہ پولیس کو بتا چکا تھا کہ چمن شاہ کو ملزم نے قتل کیا ہے۔ کیا انیق نے اس قسم کے الفاظ ادا کئے تھے؟''

عدالت میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کی شہادت لی جاتی ہے، دوسرے گواہ اس کے بیان اور جرح سے واقف نہیں ہوتے۔ نازیہ نہیں جانتی تھی کہ جمشید نے پہلے مجھے کیا کیا بتا رکھا ہے۔ اس کے جواب نے جمشید کے بیان کی تصدیق کردی۔

''جی ہاں......'' وہ سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''انیق نے یہ الفاظ کس بنا پر ادا کئے تھے جب کہ اس نے ملزم کو قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟''

''یہ بات تو آپ انیق صاحب ہی سے پوچھیں۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

''اچھی بات ہے، یہ سوال میں انیق سے ہی کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں میرے موکل کے بیگ میں وہ سائلنسر لگا ریوالور کس نے رکھا تھا؟''

''میں کیا بتا سکتی ہوں۔'' وہ بری طرح چونک کر مجھے تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مس نازیہ! میرے موکل نے اپنا بیگ آپ کے پاس رکھوایا تھا اور اس کا کہنا ہے، مذکورہ ریوالور اس کا ہے اور نہ ہی اس نے وہ ریوالور کبھی اپنے بیگ میں رکھا ہے۔ آپ کو بتانا پڑے گا کہ......''

میرا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ وکیل سرکار نے مداخلت کی۔ ''یہ بھی تو عین ممکن ہے، ملزم ایک کھلا جھوٹ بول رہا ہو۔ وہ ریوالور کے وجود سے انکاری ہے۔ جب وہ چمن شاہ کا قتل کرنے سے پھر سکتا ہے تو پھر اس کی کون سی بات کا اعتبار کیا جائے۔ وہ یقیناً جھوٹ بول رہا ہے۔ چمن شاہ کے قتل

کے بعد اس نے آلہ قتل اپنے بیگ میں رکھا اور بیگ کو نازیہ کے پاس رکھوا کر چمپت ہوگیا۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جج نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟''

''میرے فاضل دوست کے الفاظ پر۔'' میں نے سنجیدگی سے وضاحت کی۔ ''میرے موکل کے لئے چمپت یا نو دو گیارہ کے الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ اگر وہ ان الفاظ کا مفہوم بنتا تو پھر واپس لوٹ کر نہ آتا۔ میرا موکل لنچ کرنے گیا اور ذرا تاخیر سے واپس آگیا۔''

وکیل استغاثہ نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس روز آپ کے موکل نے لنچ میں غیر معمولی تاخیر کیوں کی؟ واضح رہے کہ میڈم نادرہ نے جمشید کو بھیج کر آس پاس کے ہوٹلوں میں دکھوایا بھی تھا لیکن وہ کہیں نہ ملا۔'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ملتا بھی کیسے؟ وہ کوئی اچھا کام کرنے تو نہیں گیا تھا۔''

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! اس روز جب میرا موکل لنچ کے لئے آستانے سے باہر نکلا تو نیچے سڑک پر اس کا ایک دوست نظر آگیا۔ قیصر نامی وہ دوست میرے موکل ہی سے ملنے ادھر آیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ بہادر آباد لے گیا جہاں انہوں نے بھرپور لنچ کیا اور ان دونوں کے درمیان گفتگو اتنی طویل ہوگئی کہ جب قیصر نے میرے موکل کو آستانے کے نیچے سڑک پر چھوڑا تو چار بج رہے تھے۔''

وکیل استغاثہ نے زہریلے لہجے میں استفسار کیا۔ ''ان دونوں کے درمیان ایسے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا؟''

میں نے بتایا۔ ''قیصر کے پاس ایک موٹر بائیک ہے۔ اسے ان دنوں پیسوں کی اشد ضرورت ہے اس لئے وہ موٹر بائیک فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ گاڑی میرا موکل خرید لے۔ مگر میرا موکل یک مشت ادائیگی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اس لئے قسطوں کی بات کر رہا تھا۔ لیکن قیصر کو پوری رقم چاہئے تھی چنانچہ ان دونوں کے درمیان بات ٹھہر نہ سکی۔ حالانکہ قیصر اپنی بائیک بڑے سستے دام میں فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی بائیک دس ہزار سے کم کی نہیں تھی مگر وہ میرے موکل کو صرف سات ہزار میں دے رہا تھا۔''

''بہت عمدہ کہانی ہے!'' وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ملزم نے اپنے بیان میں قیصر یا اس فرضی موٹر بائیک کا کہیں ایک مرتبہ بھی ذکر نہیں کیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کہانی واقعی ایک عمدہ اور سچی کہانی ہے۔ لیکن اس واقعے کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ میرے موکل سے پولیس نے ایک مرتبہ بھی یہ سوال نہیں کیا کہ اس نے وقوعہ کے روز سوا دو سے چار بجے تک کا وقت کس ہوٹل میں گزارا تھا۔ عدم استفسار کے سبب قیصر اور موٹر بائیک کا قصہ میرے موکل کے بیان میں مفقود ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں!''

جج نے مجھ سے پوچھا۔"بیگ صاحب! کیا آپ قیصر نامی اس شخص کی گواہی کے لئے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟"

"ضرورت پڑنے پر میں اسے ایک دن کے نوٹس پر عدالت میں حاضر کر سکتا ہوں جناب عالی!" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔"قیصر مسلسل میرے رابطے میں ہے میں آج ہی اس سے ملنے کے لئے آفس بلوانے والا ہوں۔ میں نے ایک نہایت ہی اہم کام اس کے سپرد کرنا ہے!"

بات ختم کرتے ہی میں نے معنی خیز انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر مجھے الجھن کے آثار نظر آئے۔ جج نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔"آپ کو گواہ سے اور کچھ پوچھنا ہے؟"

عدالت کا مخصوص وقت ختم ہونے میں بیس منٹ باقی تھے۔ میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ نازیہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔"مس نازیہ! ابھی تک آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

"پلیز! آپ اپنا سوال دہرا دیں۔" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔"یہاں کی صورت حالات نے مجھے خاصا نروس کر دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔"ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آلہ قتل ملزم کے بیگ میں کس طرح پہنچا جب کہ ملزم وہ بیگ آپ کے پاس رکھوا کر گیا تھا؟"

"اب میں بیگ کو ہر وقت اپنے ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھی تو نہیں رہی۔" وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔"یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اس بیگ کو مسلسل گھورتی رہتی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا اس لئے میں نے کسی قسم کی احتیاط نہیں کی۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ریوالور میں نے ملزم کے بیگ میں رکھا ہے یا کسی کو رکھتے ہوئے دیکھا ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔"

نازیہ کے الفاظ میں اتنا اعتماد اور سنجیدگی تھی کہ مجھے یقین ہو گیا، وہ ریوالور کی بیگ میں موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ویسے تو میں پہلے بھی اس کو شک کی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں تو یہ عقدہ حل کرنے میں مصروف تھا کہ آلہ قتل میرے موکل کے بیگ تک کیسے پہنچا!

میں چند لمحے کھوجتی ہوئی نظر سے نازیہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر اختتامی سوالات کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔"مس نازیہ! آپ کے اور استغاثہ کے مطابق میرا موکل سوا دو بجے لنچ کے لئے آستانے سے نکل گیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے مذکورہ بیگ آپ کے حوالے کیا۔" میں ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"آپ لگ بھگ ڈھائی بجے لنچ پر بیٹھی تھیں...... اور جب آپ لوگوں کا لنچ ختم ہونے والا تھا تو میڈم نادرہ آستانے میں وارد ہوئیں۔ نادرہ کی آمد کا وقت پونے تین بتایا جاتا ہے۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی چمن شاہ کا قتل کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ آپ ا[illegible]ک طرح سوچ کر جواب دیں، سوا دو اور ڈھائی بجے کے درمیان آپ کہاں رہیں؟ کیا آپ اس دوران میں ریسیپشن کو چھوڑ کر کہیں گئی تھیں؟"

اس نے نفی میں جواب دیا اور بولی۔"جب ملزم نے میرے پاس اپنا ہینڈ بیگ رکھوایا تو جمشید کو باہر گئے لگ بھگ پندرہ منٹ گزر چکے تھے اور وہ لنچ لے کر واپس آنے ہی والا تھا۔ انیق صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں کھانے کی تیاری میں مصروف ہو جاؤں......"

"کھانا تو وہ ہوٹل سے لینے گیا تھا۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔"پھر کھانے کی تیاری کیسی؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔"اس تیاری سے میری مراد ہے، دستر خوان لگانا اور پلیٹیں وغیرہ رکھنا۔ یہ کام میرے ذمے ہے۔ میں نے سوا دو بجے ریسیپشن چھوڑ دیا تھا اور پانچ منٹ بعد جمشید کھانا لے کر واپس آ گیا تھا۔ پھر ہم دستر خوان پر جا بیٹھے اور کھانا کھول کر پلیٹوں میں رکھنے لگے۔"

"کیا یہ تمہارا روزانہ کا معمول ہے؟"

"جی ہاں، میں روز ایسا ہی کرتی ہوں۔"

مجھے شروع ہی سے شک تھا کہ کسی نے نازیہ کی عدم موجودگی میں آلہ قتل ملزم کے بیگ میں رکھ دیا ہوگا۔ کس نے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ انیق بھی ہو سکتا تھا، جمشید بھی ہو سکتا تھا اور کوئی تیسرا شخص بھی ممکن تھا۔ ویسے احتیاط کا تقاضا نبھاتے ہوئے میں نے نازیہ کو صد فیصد اس سے خارج نہیں کیا تھا۔ بعض اوقات حقیقت توقعات کے برعکس بھی سامنے آ جاتی ہے۔ ایک دو فیصد امکان نازیہ کے مجرم یا پھر شریک جرم ہونے کا بھی تھا۔ یہ بات میں نے اپنے ذہن کے کسی گوشے میں نقش کر لی تھی۔ ویسے ابھی تک اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ شک کا رخ پوری طرح اس کی جانب ہو جاتا۔

میں نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑی نازیہ سے سوال کیا۔"مس نازیہ! میڈم نادرہ نے جب یہ انکشاف کیا کہ ریسٹ روم میں چمن شاہ مُردہ حالت میں پڑا ہے تو آپ لوگوں نے کیا ردِ عمل ظاہر کیا تھا؟"

"ہمارے لئے وہ ایک حیرت ناک صدمہ تھا۔" اس نے بتایا۔"پہلے تو ہمیں یقین ہی نہیں آیا کہ ایسا ہو سکتا ہے لیکن سامنے کی حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا اس لئے ہمیں چمن شاہ کی موت کو تسلیم کرنا پڑا۔"

میں نے پولیس اور جمشید کی گواہی کی تصدیق کی خاطر دو چار سوالات کئے پھر استغاثہ کی گواہ نازیہ پر اپنی جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اسی شام میں نے شاکر علی کے دوست قیصر کو اپنے دفتر میں بلا لیا۔ وہ اس کیس کے سلسلے میں پہلے ہی مجھ سے بہت تعاون کر رہا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں شاکر کا دوست تھا۔ میں نے قیصر کے

سامنے چھوٹی داڑھی والے ایک میانہ قد شخص کا حلیہ دہرایا۔ جب وہ حلیہ اور وضع قطع اچھی طرح ذہن نشین کر چکا تو میں نے اس سے کہا۔

"مسٹر قیصر! تم نے مذکورہ شخص کو تلاش کرنا ہے۔"

"کہاں؟" اس نے بالکل فطری انداز میں بے ساختہ کہا۔

میں نے کہا۔ "میڈم نادرہ اور چمن شاہ کے اسسٹنٹ انیق کے آس پاس۔ تم نے ان دونوں افراد کے ٹھکانے دیکھ رکھے ہیں نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور معنی خیز انداز میں مجھے تکنے لگا۔ وہ اب تک انیق اور نادرہ کے بارے میں مجھے اچھی خاصی معلومات فراہم کر چکا تھا جو میرے لئے خاصی مفید ثابت ہو رہی تھیں اور آئندہ بھی مفید ثابت ہونے والی تھیں۔

میں نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "مذکورہ شخص کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا ورنہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ تمہیں جو کچھ معلوم ہو، مجھے آ کر بتاؤ گے!"

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کی حامی بھری اور مجھ سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

ٹھیک دو روز بعد قیصر ایک مرتبہ پھر میرے دفتر میں میرے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ مطلوبہ شخص کے بارے میں بہت ہی سنسنی خیز اور انکشاف انگیز اطلاعات لے کر آیا تھا۔ تاہم مذکورہ شخص میرے لئے کچھ ایسا اجنبی بھی نہیں تھا۔

قیصر کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

✿✿✿

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں چمن شاہ مقتول کا اسسٹنٹ انیق تن کر کھڑا تھا۔ انیق مضبوط ڈیل ڈول کا مالک ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے قریب رہی ہو گی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے سفید شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی مونچھیں تھیں البتہ وہ داڑھی منڈواتا تھا۔

عدالت کے دستور کے مطابق اس نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروایا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ انیق کے بیان سے میرے موکل کے لئے کھلی دشمنی جھلکتی تھی۔ اس نے کئی حوالوں سے اس بات پر زور دیا تھا کہ قتل ملزم کے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ جمشید کے بیان میں انیق کا تعاون بھی شامل تھا کیونکہ وہ بھی میرے موکل کے لئے کچھ اسی قسم کے جذبات اور خیالات کا اظہار کر رہا تھا جیسا جمشید کر چکا تھا۔

وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے پاس پہنچا اور چند عام اور گھسے پٹے سوالات کے بعد اس نے جرح ختم کر دی۔ اس کی جرح میں ایسی کوئی خاص یا اہم بات نہیں تھی جس کے لئے صفحات

ضائع کئے جائیں۔ وکیل اور گواہ کا زور صرف اسی بات پر تھا کہ ملزم حد درجے کا مغرور اور منہ پھٹ تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور چمن شاہ کے کاروبار کے سخت خلاف تھا وغیرہ وغیرہ۔

میں جرح کے لئے گواہ کے کٹہرے کے نزدیک آیا اور اس کی سرمہ لگی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "انیق صاحب! آپ کو مقتول کے آستانے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"میں شروع ہی سے ان کے ساتھ تھا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ اپنے انداز اور لب و لہجے سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں تھا کہ اسے چمن شاہ کی بے جا موت کا سخت رنج و ملال تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

"شروع ہی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا آپ اس وقت سے مقتول کے ساتھ تھے جب وہ ریلوے کالونی میں اپنا آستانہ چلاتا تھا؟"

"نہیں......" اس نے نفی میں اپنی موٹی گردن کو مخصوص جنبش دی اور بولا۔ "شروع سے میرا مطلب یہ ہے کہ جب سے چمن شاہ صاحب مرحوم و مغفور نے طارق روڈ پر آستانہ بنایا تھا۔"

"یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟"

"میرا خیال ہے، اس بات کو دو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

"کیا آپ اس سے پہلے بھی مقتول کو جانتے تھے؟"

"نہیں۔" اس نے ایک مرتبہ پھر موٹی اور چربیلی گردن کو زحمت دی۔

اس سوال سے میں دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ریلوے کالونی والے قدیم اور طارق روڈ والے جدید طرز پر قائم شدہ آستانے کے درمیانی عرصے میں مقتول چمن شاہ کہاں غائب رہا تھا لیکن گواہ انیق کے جواب سے واضح ہو گیا کہ وہ اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میرے سوال میں طنزیہ کاٹ بھی شامل تھی۔ میں نے گواہ سے پوچھا۔

"انیق صاحب! کیا ملزم سے آپ کی کوئی ذاتی دشمنی ہے؟"

"نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے بھینس پالنے کا کوئی شوق نہیں۔"

اس کے آخری جملے نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا۔ میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اس بھری ہوئی معزز عدالت میں یہ بھینس کہاں سے آ گئی؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "دراصل، آپ میری بات کو سمجھ نہیں سکے ہیں۔ ٹھہریں، میں وضاحت کرتا ہوں۔" لمحے کو خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "عام طور پر کہا جاتا ہے نا کہ اس نے میری کون سی بھینس چرا لی ہے جو میں اس سے دشمنی کروں۔ میں نے اسی حوالے سے کہا

تھا کہ مجھے بھینسیں پالنے کا کوئی شوق نہیں، لہٰذا ملزم کے بھینس چرانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یعنی میری اس سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔"

اس جاہلانہ مثال اور وضاحت پر جج بھی قدرے مکدر ہوا۔ میں نے سخت لہجے میں گواہ سے سوال کیا۔ "لیکن آپ کے بیان سے تو سراسر یہی بات ٹپکتی ہے کہ آپ اسے پہلی فرصت میں پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "جس نے جو کیا ہے، اسے اس کئے کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑے گا نا۔ ویسے میں نے جو بھی بیان کیا ہے، وہ حقیقت ہے۔ آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "انیق صاحب! آپ وہ شخص ہیں جس نے مقتول کو آخری مرتبہ زندہ حالت میں دیکھا ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے، آپ کے بعد اور ملزم سے پہلے چمن شاہ کے کمرے میں اور کوئی داخل نہیں ہوا تھا؟"

"اس بات کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر کوئی شخص ادھر کا رخ کرتا تو فوراً میری نظر میں آ جاتا۔ میرے کمرے سے گزرے بغیر کوئی بھی شخص شاہ جی کے حجرے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔"

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "اور اس کے بعد کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"آپ کا مطلب ہے، ملزم کے حجرے سے رخصت ہونے کے بعد؟"

"آپ بہت سمجھ والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرا بالکل یہی مطلب ہے۔"

اس نے نفی میں جواب دیتے ہوئے بتایا۔ "بالکل نہیں، کیونکہ اس دوران میں، میں اپنے کمرے میں موجود رہا تھا۔ پھر ہم لنچ میں مصروف ہو گئے اور ابھی ہم نے کھانا ختم نہیں کیا تھا کہ میڈم تشریف لے آئیں۔ انہوں نے ہی ہمیں بتایا کہ شاہ صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

"پھر آپ نے اس اطلاع کو پا کر کیا محسوس کیا؟"

"مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہو۔" وہ جذبات سے لبریز لہجے میں بولا۔

میں نے واضح طور پر دیکھا، وہ جذبات انگیز اداکاری کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کی اداکاری سے متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

"مسٹر انیق! آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم مقتول کے کاروبار کے سخت خلاف تھا۔"

"ہاں، میں نے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔"

"اگر آپ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے تو پھر اس حقیقت کو کس کھاتے میں ڈالیں گے کہ ملزم مقتول کی پبلسٹی کے لئے جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔" میں نے اس کے چہرے کو گھورتے

ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا، ملزم مقتول کے کاروبار کے حق میں تھا۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں آپ کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا۔" وہ ترت بولا۔ "ملازم ہمارے آستانے کے لئے جو کچھ بھی کرتا تھا اسے اس کا بھرپور معاوضہ ملتا تھا۔ اس میں اس کا کوئی کمال یا خوبی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "مقتول چمن شاہ ملزم کی خدمات اور محنت کا کھلے دل سے اعتراف کر چکا تھا اور یہ بات آپ سے بھی پوشیدہ نہیں۔ اگر میرا موکل مقتول کے کاروبار کے خلاف ہوتا تو وہ اس کی ترقی کے لئے کبھی بھی بھرپور کوشش نہ کرتا۔ یہ نفسیاتی اور منطقی طور پر ممکن نہیں۔ اسی سلسلے میں ان صاحب کی مثال موجود ہے جو میرے موکل سے پہلے آستانے کی پبلسٹی پر مامور تھا۔ وہ شخص سارے پبلسٹی کارڈ اور پمفلٹس وغیرہ کچرا کنڈی میں پھینک کر اہل آستانہ کو الّو بنا رہا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں۔" اس نے خفیف انداز میں گردن ہلائی۔

میں نہ سمجھ سکا، وہ میری بات کی تصدیق کر رہا ہے یا تردید۔ میں نے کہا۔ "میں نہیں جان سکا، آپ نے میرے سوال کا جواب ہاں میں دیا ہے یا نہ میں؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں یہ کہنا چاہ رہا تھا، ملزم سے پہلے والے لڑکے نے اس قدم کی بدمعاشی کی تھی اور یہ کوئی خاص بات نہیں۔ یہ تو اپنی اپنی نیچر اور ضمیر کی بات ہوتی ہے۔ محنت اور ہڈحرامی تو انسان کے خون میں شامل ہوتی ہے۔ اگر ملزم بہت اچھا کام کر رہا تھا تو یہ کوئی اس کی خوبی نہیں اور اس سے پہلے والا لڑکا اگر بے ایمانی کر رہا تھا تو یہ اس کی خامی نہیں۔"

"واہ واہ!" میں نے استہزائیہ انداز میں اس کے بیان کی داد دی۔ "آپ خوبی اور خامی کے جدید ترین اصول بیان فرما رہے ہیں۔ جو ان اصولوں پر عمل کرے گا، اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے!"

وہ میرے طنز کو نہ سمجھ سکا۔ یہ بھی ممکن ہے، وہ اچھی طرح میری بات کو سمجھ گیا ہو لیکن اس کی موٹی کھال اقرارِ حقیقت سے منع کر رہی ہو۔ بڑی ڈھٹائی سے اس نے ایک معرفت کی بات بتانے کی کوشش کی جو اس کی جہالت کا بیّن اقرار تھا۔

"دراصل ہم انسان کی ظاہرہ خوبیوں اور خامیوں کو نہیں دیکھتے۔" وہ کسی فلسفی کی طرح سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ "ہم انسان کے اندر بہت گہرائی میں اتر کر اس کا جائزہ لے لیتے ہیں اور اس کی اصلیت تک پہنچ جاتے ہیں۔"

"مبارک ہو...... ماشاء اللہ۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "کیا خوبی موجود ہے آپ کی ذات میں، سبحان اللہ۔"

وہ اپنی موٹی گردن کو تھوڑا اور اکڑا کر حاضرین عدالت کو تحقیر آمیز انداز میں دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ اس وقت اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس قسم کے عاملوں اور

تعویذ گنڈا کے ماہر افراد کے یہی طور ہوتے ہیں، یہی انداز ہوتے ہیں۔ میں نے اس سے اگلا سوال کیا۔

"انیق صاحب! وقوعہ کے روز آپ نے ملزم کو مقتول کا یہ حکم سنایا تھا کہ وہ فوری طور پر ملزم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"جی ہاں، میں نے ہی یہ بات ملزم کو بتائی تھی۔"

"جب مقتول نے آپ سے اس قسم کی بات کی اس وقت وہ کیا کر رہا تھا؟"

"شاہ صاحب اس وقت لنچ تناول فرما رہے تھے۔"

"آپ نے اپنے بیان اور ازاں بعد جرح کے جواب میں بتایا ہے کہ آپ کے مقتول کے کمرے سے نکلنے اور ملزم کے داخل ہونے کے درمیان کوئی شخص چمن شاہ سے ملنے حجرے میں نہیں گیا تھا۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل درست۔" اس نے پورے وثوق سے کہا۔

میں چند لمحات تک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس نے خاصا گہرا اور موٹی دھار والا سرمہ لگا رکھا تھا۔ اس شخص کی عیار اور مکار آنکھوں میں مجھے کئی رنگ کے تاثرات نظر آئے۔ میں نے تھوڑی دیر کے بعد سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مسٹر انیق! استغاثہ کے ایک معزز گواہ اور آپ کے آستانے کے سابق خدمت گار جمشید نے اپنے بیان میں اور ازاں بعد میری جرح کے جواب میں مجھے بتایا تھا کہ وہ مقتول کے جھوٹے برتن سمیٹنے کے بعد کھانا لینے گیا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ کھانا جو آپ تینوں یعنی آپ، نازیہ اور خود جمشید نے کھایا تھا۔"

"تو......؟" وہ خاصی بلند آواز میں بولا۔ اس کے چہرے سے الجھن مترشح تھی۔

"تو یہ کہ......" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور معنی خیز انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ وہ بھی مجھے تذبذب میں نظر آیا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ملزم دو بجے آستانے پر پہنچا تھا اور آپ کے حکم پر وہ فوراً ہی مقتول کے کمرے میں چلا گیا۔ ملزم کے بیان کے مطابق مقتول اسے کمرے میں نظر نہ آیا وہ وہاں پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد واپس باہر آ گیا۔ آپ نے یہ فرض کر لیا کہ مقتول اپنے ریسٹ روم میں قیلولہ فرما رہا ہو گا۔"

میں اس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا کہ انیق میرے مقصد کو سمجھنے سے قاصر نظر آتا تھا۔ اس نے متذبذب انداز میں کہا۔ "ظاہر ہے، جب شاہ جی دفتری حصے میں نہیں تھے تو پھر وہ ریسٹ روم میں ہی ہوتے۔ میں نے جو کچھ فرض کیا، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"مجھے بھی آپ کے فرض کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں دراصل کچھ اور کہنا چاہ رہا ہوں۔"

وکیل استغاثہ کی الجھن میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ گواہ نے جب سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھنے پر اکتفا کیا تو میں نے اپنی بات کی وضاحت میں کہا۔

"انیق صاحب! میرا موکل دو بجے مقتول کے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور سوا دو بجے باہر آ جاتا ہے۔ اس نے مذکورہ پندرہ منٹ مقتول کے کمرے میں گزارے، جس کی بنا پر استغاثہ اسے چمن شاہ کا قاتل گردان رہا ہے۔ آپ سے میرا یہ سوال ہے کہ جب مقتول نے آپ کو ملزم کے بارے میں ملنے کے لئے کہا تو آپ کے مطابق وہ کھانا تناول فرما رہا تھا۔ اس کے بعد آپ اس کے کمرے سے باہر آ گئے۔ پھر آپ کمرے میں نہیں گئے۔ جمشید نے بیان دیا ہے کہ وہ مقتول کے جھوٹے برتن اٹھانے کے بعد اپنے لئے کھانا لینے گیا تھا۔ ان حقائق سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے بعد وہ مقتول کے کمرے میں داخل ہوا تھا لیکن آپ کا دعویٰ ہے، آپ کے خروج اور ملزم کے دخول کے درمیان کوئی بندہ بشر چمن شاہ کے حجرے میں نہیں گیا۔ آپ کے بیان کو کس طرح درست مانا جائے؟"

اس کے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ اس کے دماغ کی چولیں ہل گئی ہوں گی۔ اب تک استغاثہ اور استغاثہ کے گواہوں کا زور اسی بات پر تھا کہ انیق کے بعد اور شاکر سے پہلے چمن شاہ کے کمرے میں کوئی نہیں گیا لیکن میرے انکشاف نے پاسا پلٹ دیا۔ چمن شاہ لگ بھگ ڈیڑھ بجے کھانا کھاتا تھا اور جمشید اس کے برتن سمیٹنے کے بعد کم و بیش دو بجے اپنے لئے کھانا لینے گیا تھا، اس سے واضح تھا کہ جمشید، انیق کے بعد مقتول کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کوئی اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ انیق کے لئے فرار کی کوئی راہ باقی نہ رہی تو وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جمشید نے یقیناً غلط بیانی سے کام لیا ہو گا۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا جمشید استعمال شدہ برتن اٹھانے مقتول کے کمرے میں نہیں گیا تھا؟"

"نہیں گیا ہو گا؟" وہ بے نیازی سے بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے تیز آواز میں کہا۔ "ہاں یا نہ میں جواب دیں۔ جمشید جھوٹے برتن اٹھانے مقتول کے کمرے میں گیا تھا یا نہیں؟"

وہ ہکلایا۔ "اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ اس واقعے کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔"

وہ واضح طور پر جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جج ناگوار نظر سے گواہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے ایک نیا وار کرتے ہوئے کہا۔ "انیق صاحب! کیا آپ کسی مصلحت یا اپنے مفاد کے لئے جمشید کی پردہ پوشی کر رہے ہیں؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"بات تو ایسی ہی نظر آ رہی ہے۔" میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ "گواہ کا بیان ہے، وہ مقتول کے جھوٹے برتن اٹھانے کمرے میں گیا تھا اور آپ اس بات کو تسلیم کرنے سے گریزاں نظر آ رہے ہیں۔ اس سے تو یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ آپ کسی وجہ سے جمشید کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ تھوڑی دیر پہلے دعویٰ فرما چکے ہیں کہ آپ کی نظر بچا کر کوئی شخص مقتول کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر جمشید آپ کو کیسے نظر نہ آیا؟ آپ دونوں استغاثہ کے گواہ ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے بیان میں اتنا تضاد نظر آئے گا تو استغاثہ کی صحت مشکوک ہو جائے گی۔ اب بتائیں، آپ کیا کہتے ہیں، بیچ اس مسئلے کے؟"

اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوئیں۔ وہ ہتھیلی کی پشت سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "یہی ہو سکتا ہے، جمشید نے جھوٹے برتن اٹھائے ہوں لیکن یہ بات میرے ذہن سے اتر گئی ہو؟"

اس کے لولے لنگڑے جواب پر جج نے ناپسندیدہ نظر سے اسے دیکھا اور غصیلے لہجے میں کہا۔ "یہ عدالت کا کمرا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے اپنے ذہن کو کنٹرول میں رکھنا چاہئے۔ واضح طور پر بتاؤ کہ وکیل صاحب کے سوال کا جواب کیا ہے؟"

جج کی ڈانٹ نے اسے بوکھلا دیا، وہ وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ "میرا خیال ہے جمشید نے شاہ جی کے کمرے سے برتن اٹھائے تھے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنا کھانا لینے گیا تھا۔"

"اور اسی وقت ملزم آستانے میں داخل ہوا تھا؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یعنی دو بجے دوپہر؟"

اس کی تن فن کافی حد تک کم ہو چکی تھی، بولا۔ "ہاں، ملزم دو بجے وہاں پہنچا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، ملزم سے پہلے اور آپ کے بعد جمشید مقتول کے کمرے میں داخل ہوا تھا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "پھر قتل کی اس واردات میں قاتل کی حیثیت سے میرے موکل کا نام ہی کیوں شامل ہے؟ جمشید پر کیوں شک نہیں کیا گیا؟"

اس نے کہا۔ "وہ دراصل...... ملزم کے بیگ میں سے آلہ قتل برآمد ہوا تھا اور......"

"اور اس بیگ کی جانب پولیس کی توجہ بھی آپ ہی نے دلوائی تھی۔"

میرے انداز میں اتنی جارحیت تھی کہ وہ انکار نہ کر سکا۔ "ہاں، میں نے ہی پولیس کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ملزم کے بیگ کی تلاشی لے۔"

"لیکن کیوں...... آخر کیوں؟" میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔ "ملزم اور استغاثہ کا گواہ جمشید ایک جیسی پوزیشن میں تھے۔ پھر جمشید کے سامان کی تلاشی کیوں نہ لی گئی؟"

"وہ...... وہ بات یہ ہے کہ ملزم موقع پر موجود نہیں تھا اس لئے یہ سوچا گیا کہ قتل اسی نے کیا ہو گا۔" وہ کمزور دفاع کرتے ہوئے بولا۔ "جبکہ جمشید ہر قدم پر ساتھ تھا، اس لئے اس کی طرف دھیان نہیں گیا۔"

"آپ کی یہ وضاحت بے جان اور بودی ہے۔" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ "اور آپ کو یہ بھی زیب نہیں دیتا کہ میرے موکل کو ملزم کہیں! آپ یہ رعایت کیوں برت رہے ہیں؟"

میری بات کے اختتام پر جج نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بیگ صاحب؟"

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میں اس مقدمے کی ابتدائی سماعت کی جانب معزز عدالت کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "جناب عالی! واقعات کے مطابق پولیس جب جائے وقوعہ پر پہنچ کر وہاں کا جائزہ لے رہی تھی تو استغاثہ کے گواہ انیق نے بڑے وثوق سے انہیں بتایا تھا کہ چمن شاہ کو شاکر علی نے قتل کیا ہے۔ استغاثہ کے ایک دوسرے گواہ جمشید کے بیان میں یہ بات شامل ہے۔ اتنے وثوق سے تو وہ شخص کہہ سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا ہو...... اور ایسا شخص قاتل کے لئے ملزم کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ عینی شاہد کو اس کے مجرم ہونے کا یقین ہوتا ہے۔"

جج نے گواہ انیق سے پوچھا۔ "آپ نے کس بنا پر پولیس کو بتایا کہ چمن شاہ کو ملزم نے قتل کیا ہے؟"

وہ میری اور جج کی ڈانٹ پھٹکار سے بری طرح ہراساں ہو چکا تھا۔ جب اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگا۔ "حالات و واقعات اس جانب اشارہ کرتے تھے ورنہ میرے پاس اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔"

"گویا آپ اپنے دعوے سے دست کش ہو رہے ہیں؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے چڑھائی جاری رکھی۔ "اور آپ ہی کے ایما پر پولیس نے ملزم کے بیگ کی تلاشی لی جہاں سے سائلنسر لگا ریوالور برآمد ہوا۔ یہ ریوالور ملزم کے بیگ میں کس نے رکھا تھا؟"

"مجھے کیا معلوم جناب!" وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپ نے...... یا...... جمشید نے؟" میرے لہجے کی سختی برقرار رہی۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی تھی ریوالور کو اس کے بیگ میں رکھنے کی؟" وہ نحیف آواز میں بولا۔ "یہ تو اسی شخص کی حرکت ہو گی جس نے شاہ جی کو قتل کیا ہو گا؟"

"گویا...... آپ یہ کہنا چاہتے ہیں۔" میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "آلہ قتل کو جمشید نے میرے موکل کے بیگ میں رکھا تھا...... اور وہی چمن شاہ کا قاتل ہے؟"

"مم...... میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی......" وہ ہکلایا۔

میں نے کہا۔ ''انیق صاحب! چمن شاہ کے قتل والے واقعے کے فوراً بعد آپ نے جمشید کو نوکری سے نکال دیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟''

''بس نکال دیا نوکری سے۔ اس کے لئے وجہ کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں نے اچانک پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، آج کل میڈم نادرہ باقاعدگی کے ساتھ آستانے پر آ رہی ہے اور وہاں کچھ خاص قسم کی میٹنگز ہو رہی ہیں؟''

''اس میں اعتراض والی کون سی بات ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ میٹنگز آپ کے اور میڈم کے درمیان ہو رہی ہیں لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ دونوں کے علاوہ ان میٹنگز میں ایک اور شخص بھی شامل ہوتا ہے...... میانے قد اور...... چھوٹی چھوٹی داڑھی والا؟''

نازیہ نے بتایا تھا کہ باہر کا وہ آدمی چھوٹی داڑھی والا ایک آدھ میٹنگ میں شریک ہوا تھا لیکن میں نے انیق کی زبان کھلوانے کے لئے اس کی مستقل شمولیت کو ظاہر کیا تھا اور میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ میری بات پوری ہوتے ہی وہ ہڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔

''میں کبیر شاہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا...... ر...... آں......''

''میں نے کسی شخص کا نام نہیں لیا، صرف چھوٹی داڑھی والے آدمی کا ذکر کیا تھا۔'' میں نے اپنے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا، آپ نے اس شخص کا نام بھی بتا دیا۔''

وہ ہراساں نظر سے وکیل استغاثہ کو تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''ان میٹنگز کے بارے میں آپ کچھ نہیں بتائیں گے؟''

''میں نے کہا نا......'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ ''میں نہیں جانتا...... کچھ نہیں جانتا۔ نہ کبیر شاہ کو...... اور نہ آستانے پر ہونے والی میٹنگز کو......''

بات کے اختتام پر وہ کٹہرے کی دیوار پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

۞۞۞

میڈم نادرہ بڑی بن ٹھن کر عدالت پہنچی تھی۔ وہ استغاثہ کی آخری گواہ اور اس کیس کی مدعی بھی تھی۔ اس نے نہایت ہی تحمل اور اعتماد کے ساتھ اپنا مختصر بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کی تیاری کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ تازہ تازہ بیوہ ہوئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ کسی ورائٹی شو میں شرکت کے لئے وہاں آئی ہے۔ وہ بلاشبہ ایک حسین و جمیل اور پُرکشش عورت تھی۔ اس کے حُسن میں ایک عجیب سا رعب داب تھا۔ اس سے نظر ملانے والا فوراً تسخیر ہو جاتا۔

اس کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے مختصر سی جرح کے بعد میدان میرے لئے خالی

چھوڑ دیا۔ نادرہ سے وہی سوالات ہوئے جو میں اس سے پہلے جمشید، انکوائری آفیسر، سب انسپکٹر اور مقتول کے اسسٹنٹ انیق سے کر رہا تھا۔ وہ جس حد تک اس کیس میں اِن نظر آتی تھی اس کے پیش نظر اس کے جوابات سے کوئی اہم یا خاص بات سامنے نہ آئی۔ آخر میں، میں نے اس سے خفیہ میٹنگز کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے نہایت ہی سادگی سے مجھے بتایا۔

''وکیل صاحب! یہ میٹنگز نہ تو خفیہ ہیں اور نہ ہی خطرناک۔ پتا نہیں خواہ مخواہ اس معاملے کو اتنا کیوں بڑھا دیا گیا ہے۔''

''اصل بات کیا ہے؟ آپ معزز عدالت کے سامنے بیان کریں۔'' میں نے کہا۔ ''داڑھی والا وہ میانہ قد شخص کہیں وہی کبیر شاہ تو نہیں جو کبھی آپ کے شوہر کے ساتھ مل کر ریلوے کالونی والا آستانہ چلاتا تھا؟''

''جی ہاں، یہ وہی شخص ہے جو بعد میں علیحدہ ہو کر پی آئی بی میں آستانہ بنا بیٹھا تھا۔'' اس نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ یہ آستانے کا کاروبار میرے بس کا نہیں۔ اللہ کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ زیادہ کی مجھے ہوس نہیں۔ میں نے کبیر شاہ سے اس [illegible] رابطہ کیا اور پھر ہماری میٹنگز ہونے لگیں کہ وہی چمن شاہ کا یہ چلتا ہوا کاروبار خرید لے۔ مجھے پتا چلا تھا وہ پی آئی بی والے آستانے پر بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے۔ یہ کام انہی لوگوں کے بس کا ہے۔ میں اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔''

نادرہ بیگم کی وضاحت نے انیق کو مزید دروغ گو ثابت کر دیا۔ وہ شخص ہر حوالے سے مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے نادرہ بیگم سے پوچھا۔ ''اگر یہ معاملہ اتنا ہی سادہ اور صاف ہے تو پھر انیق نے اس سلسلے میں جھوٹ کیوں بولا؟''

''یہ تو اسی سے پوچھیں۔'' وہ بے اعتنائی سے بولی۔ ''انسان اپنے کئے کا خود ذمہ دار ہے۔ یہ شخص تو مجھے ایک آنکھ اچھا نہیں لگتا۔ چمن شاہ کی زندگی میں تو یہ منحوس اسے چونا لگاتا ہی رہا ہے، اب اس کی یہ کوشش ہے کہ میں آستانہ اس کے حوالے کر دوں۔ وہ قسطوں میں میری مطلوبہ رقم مجھے لوٹا دے گا لیکن میں نے کبیر شاہ کے حق ہی میں فیصلہ کیا ہے۔

کبیر شاہ کے جو بھی اختلافات تھے، چمن شاہ کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر اس کے برے حالات میں اگر اسے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو میں اس کی کوشش ضرور کروں گی۔''

جج نے دلائل کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ استغاثہ کے تمام گواہ بھگت چکے تھے۔ کیس اب آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے امید تھی، آئندہ پیشی پر میں اپنے موکل کو باعزت بری کروا لوں گا۔

۞۞۞

جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ ایک ہفتہ بعد کی دی تھی لیکن اگلے ہی روز کے اخبارات میں ایک

ایسی سنسنی خیز خبر چھپی جس نے اس کیس سے متعلق ہر شخص کو چونکا دیا۔ گزشتہ رات انیق نے نادرہ بیگم کو قتل کر دیا تھا۔ موت کے منہ میں جانے سے پہلے نادرہ نے پولیس کو فون کر کے قاتل کی نشان دہی کر دی تھی۔

پولیس نے پہلی فرصت میں انیق کو گرفتار کر لیا۔ اس نے پولیس کی گرفت میں آنے کے بعد نہ صرف نادرہ بلکہ چمن شاہ کے قتل کا بھی اقرار کیا۔ اس نے پولیس کو جو بیان دیا وہ بہت ہولناک اور عبرت انگیز تھا۔

انیق کے مطابق اس نے نادرہ کے ایما پر چمن شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ نادرہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ یہ کارنامہ انجام دے دے تو وہ اس سے شادی کر لے گی۔ انیق نے عورت اور دولت کے لالچ میں میڈم کی بات مان لی اور قربانی کا بکرا میرے موکل کو بنا دیا۔ لیکن کام نکل جانے کے بعد میڈم نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور سارا کاروبار کبیر شاہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

انیق نے بڑے واشگاف الفاظ میں یہ بھی کہا کہ میڈم پہلے ہی کبیر شاہ سے ملوث تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو راہ سے ہٹانے کے لئے اسے استعمال کیا۔ بعد از وقت جو بھی کہا جائے اس کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ پولیس کا کام نہایت ہی آسان ہو گیا۔ انہوں نے دو قتل کے اقراری مجرم کو فٹ کر دیا۔

یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کر دیا۔

(ختم شد)